

غالب درون خانہ

(اضافہ شدہ ایڈیشن)

کالی داس گیتارضا

انجمن ترقی اردو پاکستان

غالب درونِ خانہ

(اضافہ شدہ ایڈیشن)

کالی داس گیتار خا

انجمن ترقی اردو پاکستان

ڈی۔ ۱۵۹، بلاک ۷، گلشن اقبال،

کراچی۔ ۷۵۳۰۰

انتساب

ساوتری گیتا کے نام

میں جانتا ہوں کہ اس کتاب کا
ایک حرف بھی تم نے نہیں لکھا
مگر تمہارے بغیر شاید میں ایک
حرف نہ لکھ سکتا۔

فہرست مضامین

۷	۱۔ حرفے پنہ
۹	۲۔ خانہ باغ
۱۳	۳۔ غالب کا خاندان (دادا، والد، چچا اور پھوپھیوں وغیرہ)
۲۹	۴۔ غالب کی والدہ
۳۵	۵۔ غالب کی تاریخ ولادت
۳۳	۶۔ غالب کا نام
۴۷	۷۔ غالب کا مذہب
۵۳	۸۔ زوجہ غالب امر لالہ بیگم
	(ازدواجی زندگی کے پہلے ۱۶ سالوں کی مختصر داستان)
۵۷	۹۔ غالب بنام امر لالہ بیگم
۶۷	۱۰۔ غالب اور امر لالہ بیگم میں ان بن، کتنا جھوٹ کتنا سچ
۸۵	۱۱۔ غالب کے سفر کلکتہ کی توقیت
۹۳	۱۲۔ عارف اور فرزند بی غالب ؟
۱۰۹	۱۳۔ غالب کا ملازم خاص کلوداروند
۱۲۱	۱۴۔ مرزا عباس بیگ

- ۱۵۔ نواب مرزا الٰہی بخش خاں معروف ۱۴۷
- ۱۶۔ فخر الدولہ مولانا اور الملک نواب احمد بخش خاں بہادر رستم جنگ ۱۸۵
- ۱۷۔ مرزا فضل بیگ ۲۰۹
- ۱۸۔ آب حیات میں ترجمہ غالب (مع حواشی) ۲۲۱
- ۱۹۔ توقیت غالب ۲۵۸



جمیل الدین عالی

معتد اعزازی

حرفے چند

غالب کی شاعری اور نثر پر کافی تحقیقی و تنقیدی کام ہو چکا اور جنور ہو رہا ہے۔ مگر ان کے خانگی اور خانہ دانی حالات پوری طرح سامنے نہیں آئے۔ ”غالب دروہ خانہ“ میں اس جہانی کالی داس گپتار خاں غالب کی خانگی اور خانہ دانی زندگی کے بارے میں ممکنہ حد تک تحقیقی نقطہ نظر سے جو معلومات اکٹھی کر سکتے تھے وہ اس کتاب میں یکجا کر دی ہیں۔ یہ کتاب صرف دروہ خانہ تک ہی محدود نہیں ہے۔ اس میں خانہ دانی حالات کے ساتھ ساتھ بعض دوسرے معلومات اور واقعات کی تفصیلات بھی پیش کی گئی ہیں۔ غالب کے ملازم خاص ”کلو“ اور ان کے بھانجے مرزا عباس بیگ جیسی غیر معروف شخصیات پر بھی کافی معلومات اس کتاب میں موجود ہیں۔ غالب کے مہم یو لے بیٹے ذین العابدین خاں عارف کے بارے میں بھی بعض اہم باتیں ملتی ہیں۔ خصوصاً عارف کو حنبلی بنائے جانے کے بارے میں کچھ نئی باتیں سامنے آئی ہیں۔ اس کے علاوہ غالب کے مذہبی معاملات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

حالی نے غالب کو حیدر علی عظیمیوں ہی نہیں لکھا ہے؟ جس شخص کو اس پر خیر ہے کہ وہ افراسیابی، سلجوقی ہے اور سرقد کے ایک شاہی خانہ دان سے تعلق رکھتا ہے۔ وہ اپنی جانی اور بردہ کی کاغذاتی خود اڑاتا ہے؟ یہ بڑی ہمت کی بات ہے۔ اس طرح غزم اور حوصلے کے ساتھ مصیبتوں اور مشکلات کا مقابلہ کرنے کا درس ملتا ہے۔

کالی داس گپتار خاں نے ”دروہ خانہ غالب“ کامل کی تاریخی تدوین بھی کی ہے تاکہ غالب کی

طبعی نشوونما، فکر و فن، ارتقا اور ان کے خیالات میں ہونے والے تغیر و تبدل کا تجزیہ ممکن ہو سکے۔

”غالب درون خانہ“ اور ”غالب کی بعض تصانیف“ ہندوستان میں پہلے شائع ہو چکی ہیں۔ بعد از طباعت آں جہانی کالی داس گیتا رخصانے ان کتابوں پر نظر ثانی کی اور مزید اضافوں کے بعد کتابیں طباعت کے لیے انجمن ترقی اردو کو اس کے حق میں کاپی رائٹ تفویض کرتے ہوئے بھیجیں۔ ”غالب کی بعض تصانیف“ گزشتہ سال انجمن ترقی اردو پاکستان کے جشن صد سالہ کے موقع پر شائع ہو چکی ہے جب کہ ”غالب درون خانہ“ پاکستان میں پہلی بار اضافوں کے ساتھ شائع ہو رہی ہے۔

کاش کہ میں اس کتاب پر ایک کسی قدر تفصیلی حریفہ لکھ سکتا۔ آں جہانی کالی داس گیتا رخصا صاحب نے وعدہ بھی لیا تھا۔ سارا قصہ ہی اس خانولائے سے متعلق ہے جس سے میں متعلق ہوں اور جس کے کئی کرداروں کے بارے میں کچھ علم سیرہ بھی رکھتا ہوں۔

مگر اب کہ کتاب خاصی تاخیر کے بعد کیوز ہو کر بازار میں جانے پر تیار ہے، میں ہچکچاہٹوں کے پکرناکار ہوں۔ مزید تاخیر کرنا عظیم ہو گا۔ بے باقی و ماہتاب باقی

خانہ باغ

عام طور پر سمجھا جا رہا ہے کہ تحقیق رد کی بجائے کارگزاری ہے مگر یہ درست نہیں۔ جج، پیار اور خوب صورتی (سٹیم، جوم، سٹورم) یہ تینوں ٹکس اس میں موجود نہ ہوں تو تحقیق تحقیق نہیں بنتی اور یہ تینوں ٹکس اس وقت تک ظاہر نہیں ہوتے جب تک تحقیق کرنے والے میں خود اعتمادی، نظم و ضبط، خود سپردگی اور راہنمائی نہ ہو۔

تحقیق محض نئے پرانے مواد کو یکجا کر دینا بھی نہیں۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ نیا مواد پرانے مواد سے نکلنا جانے کی حد تک مختلف ثابت ہوتا ہے۔ ایسے حالات میں تحقیق خاموش قماشائی نہیں بن رہی ہوتی۔ اسے شمارہ امور پر فیصلہ صادر کرنا ہی پڑتا ہے۔ یہ فیصلے ذاتی ہونے کی وجہ سے خطرناک ثابت ہو سکتے ہیں، تاہم ان سے تغافل نہیں برتا جا سکتا۔ البتہ یہ امید ہمیشہ رکھی جائے گی کہ فیصلے منصفانہ اور غیر جانبدار نہ ہیں۔

توقیت یعنی وقت کے تحمین کے ساتھ واقعہ نگاری، بہت ذمہ داری کا کام ہے۔ اگر واقعات سلسلہ وار دستیاب نہ ہوں تو اس عہدہ کی تحقیق کے راستے میں سب سے بڑی دشواری سمجھا جائے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ تاریخی دعووں کے سلسلہ وار ریکارڈ ہی کا دوسرا نام ”توقیت“ ہے اور یہ بھی حقیقت ہی ہے کہ واقعات کا تاریخی تحمین جتنا دشوار ہے اتنا ہی دل شکن اور سحر انگیز ہے۔ کڑیاں ملنے لگتی ہیں تو ایسا مظلوم ہوتا ہے جیسے کوئی ردائیں کا مہاب ہونے والا ہے۔ جھگڑوں میں بنا ہوا تاریخی مواد جیسے اپنے آپ روشنی چادر میں ڈھلا جا رہا

— ۱۰ —

عصیت، تحقیق کی راہ میں ایک اور بڑی دشواری ہے۔ مگر اس جگہ کا کیا کچھ کہ کوئی محقق

خواہ وہ غیر جانب داری میں کتنا ہی نامور کیوں نہ ہو کبھی طور پر محبت سے بری نہیں رہ سکتا۔ اس کے باوصف اگر کوئی علمی ادبی مصنف ایسی ہے جس کے نتائج پر اعتبار کرنے کوئی چاہے تو ”تحقیق“ ہے۔

کتاب زیر مطالعہ جو سترہ عنوانات پر محیط ہے، تحقیق کے ایسے ہی مراحل سے گزر کر معرض وجود میں آئی ہے۔ یہ حیات غالب کی باقاعدہ روداد نہیں ہے، تاہم اس میں بہت کچھ ایسا کہہ دیا گیا ہے جو اس سے پہلے اُن کہا سنا تھا۔ (۱) غالب کا خاندان، ولولہ والد، بچپن، پھوپھیوں وغیرہ۔ (۲) غالب کی والدہ۔ (۳) غالب کی تاریخ ولادت، (۴) غالب کا نام، (۵) غالب کا مذہب، (۶) زوجہ غالب اسراف بیگم کی ازدواجی زندگی کے پہلے سولہ سال، (۷) غالب بنام اسراف بیگم، (۸) غالب اور اسراف بیگم میں اُن نعتیہ کتاچ کتا جھوٹ، (۹) عارف اور فرزند ی غالب؟ (۱۰) غالب کا ملازم خاص کھواروند، (۱۱) مرزا عباس بیگ (خوہر زادہ غالب)، (۱۲) نواب الہی بخش خاں معروف کے بڑے بھائی، یہ مضامین ایسے ہیں جن کا تعلق براہ راست غالب کی ذات سے ہے۔ ایک مضمون مرزا فضل بیگ پر بھی ہے۔ یہ غالب کے بیٹوں مرزا اکبر بیگ کے چھوٹے بھائی اور غالب کے بھانجے مرزا عباس بیگ کے بچپن تھے۔ اگرچہ غالب کے سوانح حیات سے مرزا فضل بیگ کا سیدھا تعلق کم ہے تاہم یہ مضمون اس عہد کی تاریخ پر بھرپور روشنی ڈالتا ہے اور غالبیات کے مطالعے کے لیے ناگزیر ہے۔

آزاد مولف ”آب حیات“ غالب کے اولین سوانح نگاروں میں ہیں۔ ”آب حیات“ میں شامل غالب کی سوانح عمری تاریخی حیثیت سے لاکھ کزور کسی مگر اسلوب کے لحاظ سے اپنی مثال آپ ہے۔ ظاہر ہے کہ اسے تحقیقی اسور کے لیے کام میں نہیں لایا جاسکتا، لیکن اسے فطری غیر مستحکم کہہ کر نظر انداز بھی نہیں کیا جاسکتا۔ چنانچہ میں نے اس پر مفصل حواشی کا اضافہ کر کے اسے ”آب حیات“ میں ترجمہ ”غالب“ کے عنوان سے ۱۹۸۷ء میں شائع کر دیا تھا۔ اب اسے مزید ترمیم و اضافہ کے ساتھ کتاب زیر مطالعہ کے آخری ابواب میں شامل کر لیا گیا ہے تاکہ غالب کے مختصر ہی سہی۔ مربوط سوانح سے کتاب خالی نہ رہے۔

کتاب کے دو باب تو ”غالب کے سفر نکلت کی توثیق“ اور ”توثیق غالب“ کے عنوان

سے ہیں۔ ایک مختصر توقیت پہلے ہی باب ”غالب کا خانہ ان۔ دادا والد، چچا، چھوٹیاں وغیرہ“ میں بھی ہے۔ چوں کہ اس میں تاریخیں قیاسی بھی ہیں، اس لیے ان سے اختلاف کی گنجائش ہے۔ مگر سفر کلکتہ اور حیات غالب کی توقیت جیسا کہ آپ ملاحظہ فرمائیں گے خاصی مستند و مفصل ہے۔

مجھے اپنی اس کاوش سے اطمینان تو نہیں ہے مگر میں اس وہم میں مبتلا نہیں ہوں کہ اسے حرف آخر کہہ سکوں۔ اس لیے آپ سے گزارش ہے کہ آپ خوبیوں کو (اگر ہوں تو) بھلے ہی دل میں سرا کر رہ جائیں، مگر خامیوں کو مجھے تک پہنچانے میں ہرگز پس و پیش نہ کریں۔ میں آپ کا ممنون ہوں گا۔

غالب کے انتقال کو ابھی ایک سو تیس سال ہی کا عرصہ ہوا ہے مگر وہ پورے اردو ادب بلکہ اپنے عہد کے دوسری ہندوستانی زبانوں کے حصار کو بھی، ایسا توڑ کر نکل گئے ہیں کہ غالب پر گفت و شنید اور نوشت و خواند کو ”غالبیات“ کا مستقل نام دینا پڑا ہے۔ میری تالیفات و تصنیفات میں ”غالب درون خانہ“ اسی سلسلے کی دسویں کڑی ہے۔ ابھی اور دس کتابیں شائع کرنے کا پلان ہے۔ مواد بھی لگ بھگ تیار ہے مگر مخدوش صحت کے پیش نظر اب شاید یہ عہد ممکن نہ ہو، اس لیے فی الحال اجازت۔

اطلاعا عرض ہے کہ ”غالب درون خانہ“ کے اس ڈیشن میں جو نو سال کے بعد شائع ہو رہا ہے اب تک کی تمام ممکنہ ترمیمیں اور اضافے شامل ہیں۔

کالی داس گپتا رخصتا

غالب کا خاندان

دادا، والد، چچا اور پھوپھیاں وغیرہ

(1) ۱۸۴۸ء

غالب اپنی پیشی کے مقدمے کے عرضی دعوے امور ع ۳۸ پر ۱۸۴۸ء میں لکھتے ہیں:

”میرے چچا (نصرت اللہ بیگ خاں کے والد) (یعنی میرے دادا)..... کا نام
تو قاتل بیگ خاں تھا..... (ان کی) بیوی (یعنی میری دادی) کی ایک بیوہ
ہمیشہ تھی۔ جس کی ایک ناکھڑا لڑکی تھی..... (میری دادی) اپنے
دوسرے متعلقین اور لواحقین کی طرح اپنی اس بہن اور بھانجی کی بھی
پرورش اور نگہداشت کرتی تھیں۔ (ص ۱۱۳)

جب فوج کی کمان پروں^۱ (Perron) کے ہاتھ میں تھی تو اس کی
طرف سے میرے چچا نصرت اللہ بیگ خاں آگرے کے قلعہ دار مقرر
ہوئے۔ پھر جب انگریزی فوج نے اس علاقے میں پیش قدمی کی تو
نصرت اللہ بیگ خاں نے ہتھیار ڈال دیے اور انگریزی حکومت سے مل
گئے (بعد ازاں) لارڈ ایک^۲ نے بھی قلعے کا نظم و نسق عارضی

طور پر انھیں سے حاصل رکھا پھر..... چار سو سواروں کے دستے کی کمان
ان کے تفویض ہوئی اور سترہ سو روپیہ ماہانہ تنخواہ مقرر ہوئی

صوبہ آگرہ میں سوک اور سونہ کے دو پر گئے مین حیات تقرری
(۲۱ ستمبر ۱۸۰۵ء کو) جاگیر میں عطا کیے۔ (ص ۱۰۷)
گیارہ مہینے بعد نصر اللہ بیگ خاں (میرے چچا) جب کہ وہ باہر میر کے
لئے گئے ہوئے تھے، اچانک ہاتھی پر سے گر گئے۔ ان کی ٹانگ ٹوٹ گئی
اور بھی سخت چو نہیں آئیں، چند دن بعد (جولائی یا اگست ۱۸۰۶ء) ان کا
انتقال ہو گیا اس پر جاگیر حکومت نے واپس لے لی۔۔۔ (میرے چچا)
کے کوئی اولاد نہ تھی۔ وفات کے وقت ان کے ورثہ حسب ذیل تھے۔
(۱) میں (۲) میرا چھوٹا بھائی (مرزا یوسف)، (۳) میری دای، (۴)
میری تین بیویاں۔

اس وقت میری عمر نو برس کی تھی اور میرے بھائی کی سات، میری
دای ستر برس کو پہنچ چکی تھیں۔ (ص ۱۰۸)

اس کا مطلب یہ ہوا کہ ۱۸۰۶ء (۱۲۲۱ھ) میں غالب کی دای زوجہ قو قان بیگ خاں
زندہ تھیں اور وہ ستر برس کو پہنچ چکی تھیں۔ گویا غالب کی دای کی ولادت ۳۶ء اور ہجری
حساب سے (۱۱۵۱ھ) (۱۷۳۸ء) میں ہوئی تھی۔ اپنے چچا کے ورثہ میں غالب نے اپنی بہن
چھوٹی خاتم زوجہ مرزا اکبر بیگ کو شامل نہیں کیا، شاید اس لیے کہ اس حادثے سے پہلے
(پادجوڑ چھوٹی عمر کے) اس کی شادی ہو چکی تھی، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ان کی بیویوں کو
اس بیٹا پر وارثوں میں شمار کر لیا گیا کہ وہ خود کنفیل نہ تھیں۔ ان کی کثالت غالب کی دای ہی کی
بخشن سے ہوتی تھی۔ غالب کے چچا نواب احمد بخش خاں کے بہنوئی تھے، مگر ان کے کوئی اولاد
نہ تھی۔ بیوی کا انتقال ان سے پہلے ہو چکا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ غالب کی چچی ورثہ میں شامل نہیں۔

”نواب (احمد بخش خاں) نے مجھ سے وعدہ کیا کہ۔۔۔ میں حکومت سے کہہ کر تمہارا
کے نام الگ الگ سند لے دوں گا۔“ (ص ۱۱۰)۔ گویا اب وارث چھ کے بجائے پانچ رہ گئے۔
یعنی غالب کی دای کا انتقال ہو گیا۔ احمد بخش خاں (اکتوبر ۱۸۸۲ء کو مرے۔ اس سے یہ نتیجہ
نکالا جاسکتا ہے کہ غالب کی دای اکتوبر ۱۸۸۲ء سے پہلے انتقال کر چکی تھیں اور غالب یہ بھی

کہتے ہیں۔

سراج الدین احمد ہے، جس کے ضروری جسے کار و ترجمہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے:

”(میں) بزرگ علما ہوں اور میرا نسب افراسیاب و پٹنگ سے ملتا ہے۔ میرے بزرگ سلجوقی تھے مگر اپنے عہد میں اعلیٰ فوجی عہدیدار تھے۔

جب روزگار میں زوال آیا تو ایک گروہ رہبر بنی اور عارت گری کا شوق کرنے لگا اور دوسرے گروہ نے کھیتی باڑی شروع کر دی..... میرے بزرگ توران کے شہر سرقد میں آباد ہو گئے۔ ان میں سے ایک یعنی میرے جد اعلیٰ اپنے باپ سے روٹھ کر ہندوستان آ گئے اور لاہور میں صحن الملک^۵ کے ساتھ ہو گئے۔ جب صحن الملک کی بساط دولت الٹ دی گئی تو وہ اعلیٰ آ گئے اور ذوالفقار الدولہ مرزا نجف خاں^۶ بہادر

کے ساتھ مل گئے۔ میرے والد عبد اللہ بیگ خاں، شاہ جہاں آباد میں پیدا ہوئے۔ جب میں پانچ سال کا ہوا تو میرے سر سے سایہ پوری اٹھ گیا۔ میرے چچا عبداللہ بیگ خاں نے مجھے بڑے ہار وقت سے پالا۔ تاکہ اپنے بڑے بھائی کے انتقال کے کم و بیش پانچ سال بعد وہ بھی چل جائے اور مجھے اس خرابے میں تنہا چھوڑ گئے۔ یہ حادثہ..... ۱۸۰۶ء میں مصمام الدولہ جرنیل لارڈ لیک صاحب بہادر کی طرف سے لشکر آرمی کے وقت پیش آیا چوں کہ میرے چچا دولت اہل فرنگ کے ریکسوں میں سے تھے اور چار سو سواروں کے ساتھ مصمام الدولہ کی ہراہی میں لڑائی لڑ رہے تھے اور سرکار انگریزی کے کرم سے اکبر آباد کے مضافات میں دو پرگنہ جاگیر کے مالک تھے۔ اس لیے سرکار انگریزی کے سپہ سالار نے میرے چچا کے خوں بہا میں بے نواہی کے لیے جاگیر کے عوض مشاہرہ مقرر کیا جس کی وجہ سے فکر معاش سے فراغت حاصل ہوئی آج کہ میری عمر چالیس سال کی ہو رہی ہے، اس عطا پر خور سند و قانع ہوں۔“

(III) ۱۸۳۵ء

غالب کا ۹ شعر کا یہ قطعہ، مشمولہ دیوان فارسیں (پہلی اشاعت)۔ مطبع دارالسلام دہلی۔
(ص ۲۱ / ۲۲) بہت مشہور ہے۔ اس کے پہلے چار شعر یہ ہیں۔

غالب از خاکِ پاک تورانیم لاجرم در لب فرو مندیم
ترک زلوم و در زوار ہی ہستگان قوم بچ ندیم
ہیکم از جماعہ اتراک در قنای زلہ وہ چندیم
فنِ آباے ماکشا درزی ست مہ مرزاں زادہ سرقدیم

تیسرے شعر میں کہا ہے کہ میرا تعلق ترکوں کی ایک جماعت ایک سے ہے۔ اس پر ڈاکٹر یوسف حسین خاں (غالب اور آجنگ غالب۔ ص ۷۰) لکھتے ہیں:

”غالب نے کئی جگہ اپنے کو ایک ترک کہا ہے۔ ایک کسی ترکی قبیلے کا نام نہیں ہے۔ غالب اس سے ان کی مراد ایک ہے، جو بد عشقوں میں آباد تھے اور اب بھی آباد ہیں۔ اگر غالب کا یہ بیان صحیح ہے کہ ان کے اجداد سمرقند کے رہنے والے تھے اور کھیتی باڑی کا کام کرتے تھے تو بھی یہ ماننا پڑے گا کہ وہ ایک تھے۔ اگرچہ سمرقند شہر میں تاجک لوگ بڑی تعداد میں سامانوں کے زمانے سے آباد ہیں لیکن نواح کی آبادی ازبکوں پر مشتمل ہے جو وہاں صدیوں سے رہتے سہتے ہیں۔ اگر غالب کے اجداد کھیتی باڑی کرتے تھے تو ظاہر ہے کہ شہر کے نواح ہی میں کرتے ہوں گے۔ شہر کے بچوں سچ تو کھیتی باڑی نہیں ہو سکتی۔ ان حالات میں قیاس ہوتا ہے کہ غالب کے اجداد سمرقند کے نواح کے کاشت کاری کرنے والے ازبک ہوں گے۔ سمرقند جہاں سے ان کے اجداد کا تعلق تھا اور بد عشقوں جہاں سے ان کے دوا تو جان بیک خان آئے تھے دونوں جگہ ترکی بولنے والی آبادی ازبکوں کی ہے۔ افغانوں کی شاہی بیاد ازبکوں اور تاجکوں کے ساتھ ہوتا ہے۔“

غالب نے مہرِ نیروز میں خطابِ زمین بوس کے تحت لکھا ہے (صرف ضروری مقامات کا اردو ترجمہ دیا گیا ہے۔)

”راقم^۹ (غالب) کے بزرگ افراسیاب اور پٹنگ کی نسل سے تھے۔ کینہ بکھر دی آستیں کی ہوائے ”تور کے بیٹے (افراسیاب) کی استی کا چراغ گل ہو جانے کے بعد پٹنگوں کو یہ روزِ سیاہ دیکھنا پڑا کہ اس شان و شوکت میں سے ان کے ہاتھ میں سوائے تیغ کے اور کچھ نہ رہا۔ دوسروں کی سر زمین کو بچھنے لگے (ہجرت کر گئے) اور تیغِ زنی (سپہ گری) کر کے روٹی کھانے لگے۔ اس قافلے کے بچے کچے لوگوں میں سے میرے دادا جن کا جنم سرقد میں ہوا تھا۔۔۔ سرقد سے ہندوستان آیا اور۔۔۔ ذوالفقار الدولہ مرزا نجف خان کے دفتر میں ملازمت شامی میں داخل ہو گیا اور پرگنہ پہاسا اس کے اور اس کے سپاہ کے روزی کے نام لگا دیا گیا۔ میرے باپ نے بھی اپنے باپ ہی کا پیشہ اپنایا اور اس نے بھی لڑائی کے میدان میں جان دی۔ مجھے (خدا نے) لازمہ شیخ و داستان سرا پیدا کیا:

رُبابی (ترجمہ)

”مے غالب! میں روزِ شم* کی نسل سے ہوں
اس لیے میرے دم میں دمِ تنگی کی سی صفائی ہے۔
جب سپہ گری کی جگہ شعر گوئی نے لے لی
تو بزرگوں کا ٹوٹا ہوا تیر میرا قلم بن گیا“

(V) ۱۸۶۳ء ؟

غالب نے ایک تذکرے کے لیے اپنے حالات خود لکھے تھے۔ وہ تحریر ان کے ہاتھ کی لکھی ہوئی موجود ہے۔ (تفصیل کے لیے احوال غالب ص ۷ ہو چکے) لکھتے ہیں:

”اسد اللہ خاں عرف ”مرزا نوشہ“ غالب تخلص، قوم کاثرک سلجوقی سلطان برکیارق سلجوقی کی اولاد میں سے۔ اس کا دلا تو قان بیگ خاں، شاہ عالم کے عہد میں سرحد سے دلی میں آیا۔ پچاس گھوڑے اور غارہ نشان سے بادشاہ کا نوکر ہوا، یہاں سوکا پر گنہ جو نواب سرد بیگم کو سرکار سے ملا تھا، وہ اس کی جلاو میں مقرر تھا۔ باپ اسد اللہ خاں مذکور کا عبد اللہ بیگ خاں دلی کی ریاست چھوڑ کر اکبر آباد میں جا رہا۔ اسد اللہ خاں اکبر آباد میں پیدا ہوا، عبد اللہ بیگ اور میں راجہ راجہ بنیاد سکنہ کا نوکر ہوا اور وہاں ایک لڑائی میں بڑی بہادری سے مارا گیا، جس حال میں کہ اسد اللہ خاں مذکور پہنچ چھ برس کا تھا اس کا حقیقی چچا نصر اللہ بیگ خاں مرہٹوں کی طرف سے اکبر آباد کا صوبے دار تھا۔ ۱۸۰۳ء میں جب جرنیل لیک صاحب اکبر آباد پر آئے تو نصر اللہ بیگ خاں نے شہر سپرد کر دیا اور اطاعت کی۔ جرنیل صاحب نے چار سو سوار کا بریگیڈ تیار کیا اور ایک ہزار سات سو کی تختہ مقرر کی۔ پھر جب اس نے اپنے زور بازو سے سونک، سونادو پر گئے بھرت پور کے قریب ہو کر کے سواروں سے جھجین لیے، جرنیل صاحب نے وہ دونوں پر گئے بہادر موصوف کو بہ طریق استراہ عطا فرمائے۔ مگر خان موصوف جاگیر مقرر ہونے کے دس مہینے کے بعد مرگ، ناگاہ ہاتھی پر سے گر کر مر گیا، جاگیر سرکار میں بازیافت ہوئی اور اس کے عوض نقدی مقرر ہو گئی اور شرکا کو دے دلا کر ساڑھے سات سو روپے سال اس شخص کی ذات کو اسی زر معافی میں سے ملے ہیں۔“

(VI) ۱۸۶۵ء

غالب ورنش کا دیانی (مطبوعہ اکمل المطابع دہلی۔ ۱۸۶۵ء) میں لکھتے ہیں، (صرف ضروری جیسے کا اردو مفہوم دیا جاتا ہے)۔

”سلسلہ نسب سلطان شہزاد اور سلطان ملک شاہ سلجوقی سے طغرل و سلجوق تک پہنچتا ہے۔ تاریخ لکھنے والوں نے ان کو افراسیاب و ترک و تور ابن فریدوں کی نسل سے لکھا ہے۔۔۔۔۔ زوال سلطنت کے بعد یہ لوگ ماورالنہر کے وسیع میدانوں میں بکھر گئے۔ انھیں میں سے ترم خاں نے کہ ہم اسی کی اولاد ہیں، سرقد کو اپنا گھرنالید۔ شاہ عالم کی سلطنت کے عہد میں میراداد اسرقند سے ہندوستان آیا۔ جن لوگوں نے ”خاننا بخت گہر“ (میرے دادا) کو دیکھا ہے، وہ کہتے تھے کہ وہ (دادا) سب بات حیرت ترکی میں کرتے تھے اور انھیں ہندوستانی زبان نہیں آتی تھی، مگر اوہ میں ہوں کہ ترکی کے حروف چچی سے بھی واقف نہیں ہوں۔۔۔۔۔ (ص ۵۳)۔۔۔۔۔ میرے دادا ماورالنہر سے تھے اور میرے باپ کی ولادت دہلی میں ہوئی اور میں آگرے میں پیدا ہوا۔۔۔ (ص ۱۳)۔

(VII) ۱۸۶۷ء

غالب فٹنی حبیب اللہ خاں دکا کو لکھتے ہیں (اردو سے معنی)۔ اکمل المطابع مطبوعہ ۱۸۶۷ء۔ خط مورخہ ۱۵ فروری ۱۸۶۷ء

”۔۔۔۔۔ میں قوم کا ترک سلجوقی ہوں، دادا میراداد ماورالنہر سے شاہ عالم ۱۳ کے وقت میں ہندوستان میں آیا۔ سلطنت ضعیف ہو گئی تھی، صرف پچاس کھوڑے خضرہ نشان سے شاہ عالم کا نوکر ہوا۔ ایک پرگنہ میر حاصل ذات کی تحفہ اور دوسرے سالے کی تحفہ میں پلا۔ بعد انتقال اس

کے جو طوائف الملوک کا ہنگامہ گرم تھا وہ علاقہ نہ رہا۔ باپ میرا
 عبداللہ بیک خاں بہادر لکھنؤ جا کر نواب آصف الدولہ کانوکر رہا۔ بعد
 چند روز حیدر آباد جا کر نواب نظام الدولہ کانوکر ہوا۔ تین سو سوار کی
 جمعیت سے ملازم رہا۔ کئی برس وہاں رہا۔ وہ نوکری ایک خانہ جنگی کے
 بکھیزے میں جاتی رہی۔ والد نے گھر آکر (گھبرا کر) انور کا قصد کیا اور
 راجہ بنجا اور سنگھ کانوکر ہوا۔ وہاں کسی لڑائی میں مارا گیا۔ نصر اللہ بیک
 خاں بہادر میرا حقیقی چچا سر ہٹوں کی طرف سے اکبر آباد کا صوبہ دار تھا۔
 اس نے مجھے پالا۔ ۱۸۰۶ء میں جب جرٹل بیک صاحب کا عمل ہوا،
 صوبہ داری کشتری ہو گئی اور صاحب کشتراک انگریز مقرر ہوا۔
 میرے چچا کو جرٹل بیک صاحب نے سواروں کی بھرتی کا حکم دیا۔ چار
 سو سوار جمع کیے، چار سو سوار کا برگینڈئیر ہوا۔ ایک ہزار سات سو روپیہ
 در ماہ ذات کا اور لاکھ لاکھ روپیہ سال کی جاگیر عین حیات علاوہ
 سال بھر مرزبان کے تھے کہ مرگ بنگلہ مر گیا۔ رسالہ بر طرف
 ہو گیا۔ ملک کے عوض نقدی مقرر ہو گئی۔ وہ اب تک پاتا ہوں۔ پانچ
 برس کا تھا جو باپ مر گیا۔ آٹھ برس کا تھا جو چچا مر گیا۔ (ص ۳۵)

مندرجہ بالا اقتباسات درج ذیل ماخذوں سے لیے گئے ہیں۔ آگے کچھ حوالے انھیں
 نمبروں کے حساب سے دیے جائیں گے۔

- I ۱۸۴۸ء ان افشاں غالب (مالک رام ۱۹۷۷ء۔ ص ۵۴۱-۵۴۱)
- II ۱۸۳۰ء بیچ آہنگ (قلمی) (اشاعت اول) ۳ / اگست ۱۸۳۹ء۔ ص ۳۳۲
- III ۱۸۴۵ء دیوان قاری غالب (اشاعت اول ۱۸۴۵ء)
- IV ۱۸۵۲ء نذر سلطہ جاہر جب علی و میر شہروز (اشاعت اول ص ۱۳ / ۱۳)
- V ۱۸۶۳ء احوال غالب اشاعت اول ص ۲۷
- VI ۱۸۶۵ء در قش کاربانی (اکمل المطابع دہلی ۱۸۶۵ء، ص ۱۳۱)
- VII ۱۸۶۷ء غالب بنام ذکا (اردوئے معلیٰ ۱۸۶۹ء۔ خط مورخہ ۱۵ فروری ۱۸۶۷ء)

مندرجہ بالا تجویز کے بعد چند متنازع فیہ باتوں کے واضح نقوش یہ ابھرتے ہیں۔

۱۔ غالب ترکی منمو تھے۔ ان کا نسب انر سیاب و شک سے ملتا ہے۔ وہ بزرگ جن کی غالب ولادت میں سلجوقی تھے (اگرچہ غالب نے لکھا ہے تاہم وہ ایک ترک نہیں ہو سکتے کیوں کہ ترکوں میں یہ قبیلہ ہے ہی نہیں۔ شاید ازبک ہوں گے) وہ پہلے اعلیٰ فوجی عہدہ دار تھے بعد میں جب زوال آیا تو اپنے وطن سے ہجرت کر کے سرقد میں آباد ہو گئے اور تھیتی باڑی کرنے لگے۔ (بحوالہ II-III-IV-V-VI-VII)

۲۔ زوال آنے پر غالب کے وہ بزرگ اعلیٰ جو سرقد میں آئے تھے اور تھیتی باڑی کرنے لگے تھے۔ ان کا نام ترسم خاں تھا۔ (بحوالہ VI)

۳۔ غالب کے دو اکانام توکان بیک خاں تھا (بحوالہ VI) وہ ترکی زبان میں گفتگو کرتے تھے، انھیں ہندوستانی زبان نہیں آتی تھی (بحوالہ VI) وہ اپنے باپ سے روٹھ کر ہندوستان آ گئے تھے اور لاہور میں صمیم الملک کے ساتھ ہو گئے تھے (بحوالہ II) غالب کہتے ہیں کہ وہ شام عالم کے عہد میں سرقد سے واپس آئے تھے۔ (بحوالہ VII-VI-V) مگر یہ بات مزید وضاحت چاہتی ہے:

شاہ غالب کی داوی کی ولادت ۱۳ (مقام ولادت نامعلوم) ۱۷۳۶ء یا (۱۱۵۵ھ / ۱۷۳۸ء)

۱۷۵۲ء

شاہ داوی کی ہندوستان میں آمد

(پہلے عہد صمیم الملک عرف میر تقی)

صوبیدار لاہور۔ وفات ۳ نومبر ۱۷۵۳ء)

شاہ داوی میں احمد شاہ ۱۷۳۸ء تا

۳ جون ۱۷۵۳ء یا پہلے عہد

حاکمیرانی ۲ جون ۱۷۵۳ء

۲۹ نومبر ۱۷۵۹ء)

شاہ عالم کے عہد شاہ داوی میں ان کی ملازمت بعد از ۱۲۳۱ھ (۱۷۵۶ء) (یہ ملازمت انھیں بہت راس آئی۔ نہ صرف یہ کہ وہ پچاس گھوڑے اور نگارہ نکالنے سے مزین ہوئے بلکہ پہا سو کا پرگنہ بھی ان کی جلاو میں مقرر ہوا۔ پھر اور بھی فتوحات ان کے حصے میں آئی

(ہوں گی۔)

☆ تو قان بیگ کی شادی

تقریباً ۱۷۵۷ء تا ۱۷۶۳ء

(قیاس ہے کہ شادی بڑا بڑی عمر میں دہائی میں ہوئی ہوگی تب تک تو قان بیگ اپنے چھپے میں خوب جم پکے تھے اور ان کی معاشی حالت بھی اچھی ہو چکی تھی۔ غالب نے دہائی میں اپنے مکان کی فروخت کا جو ذکر کیا ہے وہ تو قان بیگ ہی کا بنو یا خریدہ ہو خیال کیا جاتا ہے۔)

☆ غالب کے والد عبداللہ بیگ کی ولادت دہائی میں تقریباً ۱۷۶۵ء

محمین الملک عرف میرمن کی وفات ۳ نومبر ۱۷۵۳ء کو زہر خورانی سے ہوئی تھی۔ ظاہر ہے کہ تو قان بیگ خاں اس سے پہلے لاہور آئے ہوں گے۔ قیاس چاہتا ہے کہ تو قان بیگ، احمد شاہ ابدالی کے قیسرے حملے (دسمبر ۱۷۵۷ء تا مارچ ۱۷۵۸ء) کے بعد ہی لاہور آئے ہوں گے اور محمین الملک کے ساتھ رہے ہوں گے کیوں کہ غالب نے کہیں اپنے دادا اور احمد شاہ ابدالی کے حملوں کا ذکر نہیں کیا۔ ظاہر ہے کہ ان کے دادا نے ان حملوں کے خلاف حصہ نہیں لیا یعنی وہ اس وقت تک لاہور نہیں آئے تھے۔ اس وقت احمد شاہ دہائی کے تخت پر جلوہ افروز تھے۔ جنھیں ۲ جون ۱۷۵۳ء کے بعد، کیوں کہ اس روز عالم کیر ثانی کے بیٹے مرزا عبداللہ کو عالی گوہر کا خطاب دیا گیا تھا اور پھر اس خیال سے کہ آگے جا کر بھی عالی گوہر بادشاہ بنے گا اسے ۱۲۳۲ھ پر ۱۷۵۶ء کو شاہ عالم کے خطاب سے نوازا گیا تھا۔ مئی ۱۷۵۷ء سے پہلے تو قان بیگ خاں کا دہائی آکر مرزا نجف خاں کی نوکری کرتا ممکن نہیں۔ شاہی ملازمت عالی گوہر کے ۱۲۳۲ھ پر ۱۷۵۶ء کو شاہ عالم کا خطاب پانے کے بعد کی ہوگی۔ یہ شاہ عالم کی شاہزادگی کا زمانہ تھا شاہی کا نہیں۔ شاہ عالم نے اپنے والد عالمگیر ثانی کے قتل (۲۹ نومبر ۱۷۵۹ء) کے بعد ۲۳ دسمبر ۱۷۵۹ء کو اپنی پادشاہی کا اعلان کیا تھا۔ اگرچہ صحیح طور پر ایک اور ازجن شاہ جہاں ثانی (۳۰ نومبر ۱۷۵۹ء تا ۱۱ اکتوبر ۱۷۶۰ء) کے دور ہونے کے بعد ہی (۱۷۶۱ء میں) وہ پادشاہ بن سکا تھا۔

۳۔ غالب کے دہاوی تو قان بیگ خاں اور ان کی اولاد کے کوائف مختصر ایچوں ہوں گے۔

بنام ولادت تو قان بیگ خاں (سرقند)، (قیام) ۱۷۳۰ء

بنام غالب کے چچا نصر اللہ بیگ خاں، دو اور چچاؤں اور تین چھو بھائیوں کی ولادت، اندازہ ہے کہ ۱۷۶۷ء تا ۱۸۰۵ء کے اقصی بارہ سالوں میں ہوئی ہوگی۔

بنام تو قان بیگ خاں کا انتقال قبل از ۳۰ جولائی ۱۷۸۸ء

شاہ عالم کو غلام تھوڑے عرصہ پہلے نے اسی روز تخت سے اتارا تھا اور بعد میں اندھا کر دیا تھا۔ تو قان بیگ اس سے پہلے ہی کسی لڑائی میں (شاید ۱۷۸۰ء میں کیوں کہ اس وقت لن کی عمر پچاس سال کی ہوگی اور سپہ گری کے لیے یہ عمر خاصی پختہ ہے) شاہ عالم کی طرف سے لڑتے ہوئے مارا گیا تھا۔ غالب کہتے ہیں کہ میرے باپ نے اپنے باپ کا (یعنی سپاہی کا) پیشہ اختیار کیا اور وہ بھی لڑائی کے میدان میں مارا گیا۔^{۱۳}

بنام غالب کے والد عبداللہ بیگ خاں کی شادی ۱۷۹۳ء

اگر مندرجہ بالا کوائف کو صحیح مان لیا جائے تو تو قان بیگ کی وفات کے وقت عبداللہ بیگ کی عمر محض ۱۴ برس کی ہوگی، دو چچاؤں کا انتقال بھی شادی سے پہلے ہی ہو گیا ہوگا۔ غالب کی دادوی کی پرورش میں ایک بیوہ ہمیشہ اور اس کی ایک ناکھدا کی لڑکی بھی تھی۔ گویا تو قان بیگ کے انتقال (۱۸۰۵ء تا ۱۸۸۵ء) کے بعد اپنے علاوہ ۱۹ افراد کا کنبدہ تھا، جس کا بیٹا غالب کی دادوی بھرتی تھیں۔ ظاہر ہے گھر کے مکان کے علاوہ بھی تو قان بیگ نے کافی اندوختہ چھوڑا ہوگا۔

جب شاہ عالم کو اندھا کر دیا گیا تو باوجودیکہ انھیں تخت واپس مل گیا مگر دلی میں طوائف السلوکی کا ہنگامہ گرم رہا۔ اس افراط فزی میں تو قان بیگ کی بیوہ کو کون بچتا۔ وہ پرگت چمن گیا اور بیگم شامرو کو مل گیا۔ چنانچہ عبداللہ بیگ پہلے تلاش معاش میں لکھنؤ جا کر نواب آصف

الدولہ کے نوکر ہوئے۔ پھر حیدر آباد میں نواب نظام علی خاں کے ملازم ہو گئے۔ کئی برس وہاں رہے اور واپس آ گئے (اور میرے خیال میں جب آگرہ میں منتقل ہوئے) وہیں ایک امیر فوجی افسر خواجہ غلام حسین خاں کیدان کی بیٹی عزت الشاہ بیگم سے لن کی شادی ہوئی۔ خواجہ غلام حسین خاں کیدان ذوالفقار الدولہ نواب نجف خاں کے دربار سے وابستہ رہے تھے اسی کی سرکار میں تو قان بیگ خاں بھی ملازم رہے تھے۔ ظاہر ہے یہ رشتہ اسی زمانے میں طے

ہوا اور گا اگرچہ شادی تو قاتل بیگ خاں کے انتقال کے بہت بعد ہوئی۔

۱۷۹۵ء

۱۷۹۵ء غالب کی بہن چھوٹی خاتمہ ولادت

۱۷۹۷ء ۲۷ ستمبر

۱۷۹۷ء غالب کی ولادت آگرہ میں

تقریباً ۱۷۹۹ء

۱۷۹۹ء سف علی بیگ خاں کی ولادت (غالب کے چھوٹے بھائی)

۱۸۰۲ء

۱۸۰۲ء عبداللہ بیگ خاں (غالب کے والد) کا انتقال

(ریاست اور کی ملازمت میں لڑائی میں مارے گئے)

۱۸۰۶ء

۱۸۰۶ء غالب کے چچا نصر اللہ بیگ خاں کا انتقال

(ہاتھی سے ٹکرا کر زخمی اور ہلاک)

۱۸۱۰ء ۱۹/ اگست

۱۸۱۰ء غالب کی شادی

(غالب کی عمر تیرہ سال تھی اور وہ لہن اسرہ بیگم کی چہارم سال)

۱۸۲۵ء ۳۱/۱۸۰۶ء

۱۸۲۵ء غالب کی داوی کا انتقال

غالب کے دعوے سے پتہ چلتا ہے کہ :

۱۔ ۱۸۰۶ء میں ان کی داوی زندہ تھیں۔

۲۔ ۱۸۲۵ء میں خواجہ حاجی فوت ہوئے۔

۳۔ ان کی داوی کا انتقال اس سے پہلے ہو چکا تھا۔

میری رائے میں غالب کی داوی کا انتقال بہت پہلے ہو چکا ہو گا۔ اگر ۱۸۲۵ء کے لگ بھگ ہوا ہے تو گویا انھوں نے نوے سال کی عمر پائی۔ اس لمبی عمر میں انھوں نے اپنے خاوند قاتل بیگ خاں، اپنے دو بیٹوں اور پھر قیسرے بیٹے عبداللہ بیگ خاں اور چھ بیٹے نصر اللہ بیگ خاں کو اپنے سامنے دم توڑتے دیکھا۔ اس سے بڑا ایسا کسی کی زندگی میں کیا ہو سکتا ہے۔

غالب کی بڑی اور آخری پھوپھی کا انتقال ۱۷ ادا ستمبر ۱۸۵۳ء (غالب

۲۲ ستمبر ۱۸۵۳ء کو نبی بخش حقیر کو لکھتے ہیں۔۔۔ "منگل کے دن ۱۸

ربیع الاول (۲۰ ستمبر) کو شام کے وقت وہ پھوپھی کہ میں نے بچپن

سے آج تک اس کو ماں سمجھا تھا۔ مر گئی۔ پر سوں میرے گویا نو

آدی مرے، تین پھوپھیاں اور تین چچا اور ایک باپ اور ایک داوی

اور ایک دوا۔ اس مرحومہ کے مرنے سے میں نے جانتا کہ یہ نو

آدمی آج ایک بار مر گئے۔“

غالب کے اس خط کے مطالعہ کے بعد مزید کچھ کہنے کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

۳۰ ستمبر ۱۸۵۳ء کی شام کو غالب کی پھوپھی کی وفات کے ساتھ، توکان بیگ کی صلیبی اولاد (بیٹے، بیٹیوں) کا خاتمہ ہو گیا۔

حواشی

(۱) فسانہ غالب۔ ص ۱۰۶ تا ۱۱۷

(۲) پروں (Perron) اگست ۱۸۵۳ء میں فرانس کے ایک مفلس خاندان میں پیدا ہوا۔

حلاش معاش میں پہلے پانچ بچری آیا۔ پھر ۱۸۷۱ء میں شمالی ہندوستان پہنچا۔ ۱۸۷۳ء میں

بھرت پور کے راجا کے یہاں ۶۰ روپے ماہانہ پر فوج میں نوکر ہوا۔ اگست ۱۸۷۹ء میں

مہاراجی سندھیا کی ایک خالین کا کمانڈر تھا (ان دنوں اس عہدے کو کپتان لٹننٹ کہتے

تھے) ۱۸۹۳ء میں دولت راج سندھیا نے اپنے بریکینگ کے ساتھ پورے جلالپور اس کی

مدد سے ۱۱ مارچ ۱۸۹۵ء کو کھام کو شکست فاش دی۔ پروں ۲۲ اگست ۱۸۹۵ء تک پورے

علی میں رہا اور وہیں سے مراٹھا فوجوں کے جنرل کی حیثیت سے شمالی ہند میں بھیج دیا گیا۔

مرہٹوں کی سفارش پر ۱۳ فروری ۱۸۹۹ء کو شاہ عالم نے اسے ہفت ہزاری منصب عطا

کیا۔ اس نے سندھیا کی طرف سے ۱۶ اپریل ۱۸۹۹ء کو قلعہ انگرہ اور ۱۳ اپریل ۱۸۹۹ء

کو قلعہ علی گڑھ دوبارہ فتح کیے اور علی گڑھ کو اپنا ہیڈ کوارٹر مقرر کیا۔ ۱۸۹۳ء تک اس

نے سندھیا کی ماتحتی میں دھوکے اور فریب سے کروڑوں روپیہ کھانا اور انگریزوں سے

ساز باز کر کے ہندوستان سے نکل گیا۔ باقی عمر فرانس میں شان و شوکت سے گزاری۔

(فال آف دی مغل ایمپائر ۱۷ ص ۲۳/۱۲۳۵ اور دوسری کتب)

(۳) جنرل ایک (کمانڈر ان چیف) ۳۱ جنوری ۱۸۰۱ء کو کلکتہ پہنچا۔ کچن پور کو جو اس وقت

برطانوی ملاقوں کا سرحدی ہیڈ کوارٹر تھا، اپنا مسکن بنایا۔ ۱۸۰۲ء کا سرمایہ میں گزرا اور فوجوں کو آرام دے کیا۔ ۳ ستمبر ۱۸۰۳ء کو سندھیا کی فوجوں کو جو فرانسیسی جرنیلوں کی کمانڈ میں تھیں، شکست دی۔ ۲۴ نومبر ۱۸۰۳ء کو فرخ آباد میں لیٹونٹ رائیفلر کو شکست فاش دی۔ دغیرہ دغیرہ۔

(۴) بعض کے "نزدیک یہ ثابت نہیں کہ سلجوتی اُضحیٰ تورانیوں کی نسل سے تھے جن کی عظمت دیر تری کا انسانہ شاہد اسے نے بنایا ہے۔" لیکن حقیقت یہ نہیں بتاتے کہ یہ سلجوتی کس نسل سے تھے؟ تصدیق اور تقلید کے لیے دیکھیے فرہنگ فارسی از ڈاکٹر مصین۔ جلد پنجم۔ ص ۸۰

(۵) مصین الملک عرف میر مغ۔ محمد شاہ کے وزیر قمر الدین (متوفی ۱۱ مارچ ۱۷۳۸ء) کا بیٹا۔ اسی سال (۱۷۳۸ء) میں لاہور کا صوبیدار مقرر ہوا تاکہ احمد شاہ ابدالی کے بے درپے حملوں کو روکا جاسکے۔ ابتدائی کے قیسرے حملے (دسمبر ۱۷۵۵ء تا مارچ ۱۷۵۶ء) کے دوران میں مصین الملک نے اپنے اہل خانہ اور خزانے کو راجہ رنجیت دیو دالی جہوں کے پاس بھیج دیا تھا تاکہ وہ خطرے سے محفوظ رہیں۔ وفات ۳ نومبر ۱۷۵۳ء کو ملک پور (نزد لاہور) کے مقام پر زہر خوردانی سے ہوئی (ہسٹری اینڈ کلچر آف دی انڈین سبیل VIII ص ۱۶۳ اور فال آف دی مٹل ایمپائر ص ۵۵۲ تا ۵۵۹)۔

(۶) ذوالفقار الدولہ مرزا نجف خاں: متوفی ۱۶ اپریل ۱۷۸۲ء ولادت اصلہان ۱۷۷۳ء عروج کا زمانہ مئی ۱۷۷۷ء سے شروع ہوا۔ غالب کے جیو ۲ علی بھی اسی عہد میں نجف خاں کی ملازمت میں آئے ہوں گے۔ اس سے پہلے نہیں۔

(۷) "میرے بزرگوں کا پیشہ کھیتی باڑی ہے۔" پھر (۱۸۵۲ء) یہ بھی کہا ہے: "سو پشت بے ہے پیشہ" آپا سجدہ گری کچھ شاعری ذریعہ عزت نہیں مجھے "بب صرف دو پشت پہلے ان کے بزرگ کھیتی باڑی کرتے تھے تو سو پشت سے اپنے آباد اجداد کو سپاہی پیشہ کہنا محض تعلیٰ ہے۔

(۸) یہ اقتباسات نسو ار سٹو جاہ (مولوی رجب علی) میں شامل ہیں۔ جو مارچ ۱۸۵۲ء سے جون ۱۸۵۲ء تک کے عرصے میں لکھا گیا تھا۔ دیکھیے میرا مضمون: "غالب۔ ار سٹو جاہ۔

غالب کی والدہ

غالب ایک خط (۱۹/ اکتوبر ۱۸۵۸ء؟) میں فتنی شیو نرائن کو لکھتے ہیں:

”تمہارے دہوا کے والد عہد نجف خاں دہدانی میں، میرے دادا صاحب مرحوم غلام حسین خاں کے رفیق تھے۔ جب میرے دادا نے نوکری ترک کی اور گھر بیٹھے تو تمہارے پردہ لانے بھی کمر کھولی اور پھر کہیں نوکری نہ کی اسے باتیں میرے ہوش سے پہلے کی ہیں۔“

نجف خاں کا انتقال ۶/ اپریل ۱۸۴۷ء کو ہوا^۱ اور دہدانی ۲۶ جولائی ۱۷۸۷ء کو مراٹھا فوجوں سے لڑتے ہوئے ایک حادثے میں مارا گیا تھا^۲ گویا غالب کے دادا خواجہ غلام حسین ۱۷۸۷ء تک فوجی ملازمت ترک کر چکے تھے۔ اسی خط کے باقی حصے سے معلوم ہوتا ہے کہ خواجہ غلام حسین آگرہ میں خاصی املاک کے مالک تھے۔

حالی لکھتے ہیں (یادگار غالب۔ ۱۸۹۷ء)

”غالب کے والد) عہد اللہ بیگ خاں کی شادی خواجہ غلام حسین خاں کیدان^۳ کی بیٹی سے ہوئی تھی جو کہ سرکار میرٹھ کے ایک معزز فوجی افسر نور محمد شہر آگرہ میں سے تھے۔ (ص ۱۰)۔ مرزا کے نانا کی چاکیر میں متعدد دیہات اور آگرہ شہر میں بہت بڑی املاک تھیں۔“ (ص ۱۶)

مگر ان سب پر بھاری غالب کا اذہن بیان ہے جو انھوں نے اپنے پنشن کے مقدمے کے

عرصے و عرصے میں دیا ہے۔ عرضی کی تاریخ ۲۸ اپریل ۱۸۲۸ء ہے۔ لکھتے ہیں:

”میں نے آج تک اپنے والد مرحوم کے ترکے کو بچ بچ کر زندگی بسر کی ہے اس کے علاوہ میرے نانا خواجہ غلام حسین خان نے بھی کچھ جلاو چھوڑی تھی۔ وہ آگرے کے چوٹی کے عمارت میں سے، اور نواب نجف خان کے دربار کے مشہور امراء میں سے تھے۔ میں نے ہر اوقات کے لیے والد اور نانا کی حوروں کو جلاو بچ ڈالی اور اس کے باوجود آج مجھ پر بیس ہزار کا قرض ہے۔“

فسانہ غالب (ص ۳۱) میں غالب کی ایک قاری تحریر کا عکس چھپا ہے جس پر سال کتابت ۱۸۰۴ء ہے مگر مالک رام صاحب دلائل سے ثابت کرتے ہیں کہ یہ حقیقت میں ۱۸۳۰ء کی مکتوبہ ہے۔ اصل تحریر آٹولا بھیری علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ذخیرہ مصیبت خانج میں ہے اور خدا داد خاں اور دلی دلا خاں کے نام ہے جو ظاہر ہے آگرہ ہی کے ہوں گے۔ نواب صدر یار جنگ کو یہ انھیں کے وارثوں سے دستیاب ہوئی تھی۔

یہ تحریر نہایت اہم ہے اس سے معلوم ہوا کہ:

۱۔ غالب کی والدہ کا نام عزت النساء بیگم تھا۔

۲۔ وہ ۱۸۳۰ء میں بلا شریعت غیر سے دو حویلیوں کی مالک تھیں ۵۔

۳۔ یہ دونوں حویلیاں ان خاں صاحبان کے پاس لین دین (قرض) کے سلسلے میں رہیں تھیں۔

۴۔ غالب کی والدہ لکھنا پڑھنا جانتی تھیں اور تمسک پر ان کے دستخط ہوتے تھے۔

۵۔ غالب نے یہ تحریر ان خاں صاحبان کی درخواست پر بلحاظ اسرنا گزیرہ کو لازم نفوس بشری ہے، ان کے اطمینان کے لیے لکھی تھی۔ غالب لکھتے ہیں کہ والدہ صاحبہ کو ”خدا سے جہاں آفریں“، ”دیر گاہ سلامت“ رکھے۔ اگر کہیں ان کو ”اسرنا گزیرہ“ کہ لازم ذات انسان ہے، پیش آجائے تو قرصے کی اولیٰ کی ذمہ داری ان کی (غالب کی) ہوگی۔

قرضہ اگر ان حویلیوں سے چھپائی نہ ہو سکا تو بقیہ وہ اپنی گروہ سے ادا کریں گے۔

ظاہر ہے کہ ایسی تحریریں صرف اسی صورت میں نکسوائی جاتی ہیں جب کہ شخص مذکورہ بہت سال غور و خور اور ضعیف ہو۔ قرض خواہ ضرور چاہے گا کہ اس کے وارث اقرار کر لیں کہ اس کے انتقال کے بعد وہ خود قرض کی ادائیگی کے ذمہ دار ہوں گے، لہذا مالک رام صاحب کا یہ استدلال درست ہے کہ ۱۸۳۰ء میں غالب کی والدہ خاصی ضعیف (ممکن ہے خاصی بیمار) ہوں گی اور ہو سکتا ہے کہ انھیں پیام میں ان کا انتقال بھی ہو گیا ہو۔

اگر ۱۸۳۰ء کو غالب کی والدہ کا سال وفات مان لیا جائے اور اس بات کے پیش نظر کہ غالب کی بڑی بہن کی ولادت تقریباً ۱۷۹۵ء، غالب کی ۱۷۹۷ء اور غالب کے بھائی کی تقریباً ۱۷۹۹ء میں ہوئی تھی اور کہ ان کے والد کا انتقال ۱۸۰۲ء میں ہوا تھا، تو یہ تسلیم کرنا مشکل نہ ہو گا کہ انتقال کے وقت غالب کی والدہ کی عمر ۶۳-۶۴ سال سے زیادہ نہ ہوگی۔

اب رہا سوال ان دو حویلیوں کا تو ظاہر ہے کہ وہ قرضے کی سمینٹ چڑھ گئیں۔ غالب کو تو کیا ملا ہو گا کہ وہ خود گھنٹوں گھنٹوں مقروض تھے۔ ابھی اکتیس ہی برس کے تھے کہ پنشن کے مقدمے کی درخواست میں انھوں نے لکھا تھا کہ ان پر اس وقت بیس ہزار روپے کا قرض ہے۔

غالب سے بڑی ایک بہن تھی، جن کا نام بیا عرف چھوٹی خانم تھا۔ مالک رام صاحب اس سے استنباط کرتے ہیں کہ شاید غالب کی والدہ کو اپنے میکے میں ”بڑی خانم“ کہہ کے پکارا جاتا تھا (ذکر غالب۔ ۵۰۱ ایڈیشن، ص ۷۷)۔

غالب کی والدہ آخر تک اپنے میکے (اگر وہ) ہی میں رہیں۔ ان کے شوہر (غالب کے والد) مرزا عبداللہ بیگ خاں، ظاہر ہے انھیں کے ساتھ رہتے تھے اور میرزا دودلہا، کے عرف سے مشہور تھے۔ وہ اگرچہ صاحب جادو تھے، تاہم ان کی حیثیت خانہ والدہ کی سی تھی۔ ”میرزا دودلہا“ ہی کی مناسبت سے غالب کا عرف ”مرزا نوشہ“ قرار پایا۔

ممکن ہے غالب کے نانا خواجہ غلام حسین خاں کے خاندان میں افغان خون بھی ملا ہوا ہو، کیوں کہ اس زمانے میں وسط ایشیا سے ہندوستان آنے والے افغانوں کی شادیاں مغلوں اور

کشمیریوں میں ہوتی تھیں، مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ خواجہ غلام حسین کشمیری النسل تھے اور اس طرح غالب کی والدہ کشمیری بنحو تھیں۔^۶ خواجہ کا لقب اور ان کے سکونت مکان کا کشمیری محلے یعنی کشمیرن کے کٹڑے میں ہونا بھی شاہد ہیں کہ غالب کے تانا کشمیری تھے۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں مرحوم (غالب اور آہنگ غالب ۱۹۷۱ء، ص ۶۳ حاشیہ) لکھتے ہیں:

”مرزا فرحت اللہ بیگ کی خاندانی روایت کے بموجب غالب کی نسل میں افغان خون تھا۔ انھوں نے مجھ سے یہ بھی کہا تھا کہ غالب کی والدہ کشمیری تھیں۔ ان کے خاندان کی خواتین کو اس بات کا علم تھا اور انھیں سے انھوں نے یہ سنا تھا۔۔۔۔“

مرزا فرحت اللہ بیگ کی خاندانی روایات کی تائید اس گفتگو سے بھی ہوتی ہے۔ جو قاضی عبدالودود اور رقیہ سلطان بیگم صاحبہ میں ۱۹۳۳ء میں ہوئی تھی۔ موصوفہ باقر علی خاں ابن زین العابدین خاں کی بہن (سچ جیٹی) اور ضیاء الدین احمد خاں نیر کی نواسی اور فخر الدین علی احمد صاحب اور حمیدہ سلطان بیگم صاحبہ کی والدہ تھیں۔ موصوفہ نے قاضی صاحب سے فرمایا تھا کہ غالب کی والدہ کشمیری تھیں۔ اس لیے ہمارے خاندان والے انھیں پٹیا سمجھتے تھے۔ قاضی عبدالودود صاحب نے اپنی اس گفتگو کا ذکر خود ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب سے کیا تھا۔

اوپر کے بیانات کے پیش نظر یہ کہا جاسکتا ہے کہ غالب کی والدہ عزت النساء بیگم نے تقریباً ۱۶ سال کی عمر میں شادی کی ۸۷ سال اپنے شوہر کے ساتھ گزارے اور پھر ۳۸ لے اور ہر ایک سال عالم بیوگی میں کاٹے۔ ان کے دونوں بیٹے مرزا غالب اور مرزا یوسف دئی جاپے اور یہ خود آگرے ہی میں رہیں۔ مرزا یوسف عین جوانی میں مجنون ہو گئے تھے اور مرزا غالب کبھی خود کٹیل نہ ہو سکے، وہ اپنی والدہ کی دیکھ بھال کیا کر سکتے تھے۔ غالب کے والد اور تانا بہت ہی لڑاکا چھوڑ گئے تھے، جسے عزت النساء بیگم نے، جو امیر داوی تھیں آہستہ آہستہ، کچھ بچ کر، کچھ قرضوں کی نذر کر کے برابر کر دیا۔ غالب کی ۱۸۳۰ء کی تحریر جس کا ذکر اوپر آچکا ہے غلام ہے کہ ۱۸۳۰ء میں عزت النساء بیگم کی تحویل میں صرف ۲۰ روپے باقی بچی تھیں جو خدا داد خاں اور ولی دلو خاں کے پاس رہیں تھیں۔ اللہ اللہ خیر سلا۔

استدراک

نامہ ہائے غالب فارسی (مطبوعہ فروری ۱۹۶۹ء۔ ص ۳۰ و ص ۳۲-۳۳) سے شہید ہوتا ہے کہ غالب کی والدہ ۱۳ اپریل ۱۸۲۸ء تک نہ صرف زندہ تھیں بلکہ دہلی میں میرزا یوسف کے ساتھ تھیں۔ غالب نے ۳۰ اپریل ۱۸۲۸ء کو دوسری باتوں کے علاوہ محمد علی خاں کو یہ بھی لکھا کہ متواتر پانچ ماہ کے علاج سے اب میرا بھائی میرزا یوسف (اپنی) بیوی، بیٹی اور ماں کو (اپنی) بیوی، بیٹی اور ماں سمجھنے لگا ہے۔ یاد رہے کہ بیوی کے علاوہ میرزا یوسف کی صرف ایک بیٹی تھی اور ماں جو مستقل طور پر آگرہ میں رہتی تھیں شاید میرزا یوسف کی بیماری کی وجہ سے دہلی رہ رہی ہوں گی۔

اسی طرح ایک اور خط (ص ۹۷) میں لکھتے ہیں کہ ہفتہ بھر پہلے آگرہ (اکبر آباد) سے چار سو چھیتر (= ۳۷۵) روپے کی ہٹدی ملی۔ ظاہر ہے کہ یہ ہٹدی غالب کی والدہ ہی نے کھینچی ہوگی۔ اس خط میں ۳ جون ۱۸۲۹ء کو عاشق علی خاں سفیر لودھ کے ٹکٹ سے روانہ ہونے کا ذکر ہے۔ گویا خط جون ۱۸۲۹ء ہی میں لکھا گیا ہو گا یعنی والدہ غالب اس وقت تک زندہ تھیں۔

حواشی

(۱) خطوط غالب (مالک رام۔ ص ۴۴۳)

(۲) ذوالفقار الدولہ مرزا بخت خاں (قال آف دی منٹل امپائر جادونا تھامس کار، حصہ سوم، ص ۱۵۵) منٹل سلطنت کا آخری بڑا ستون تھا۔ اس میں مظلیہ افواج کے جنرل کی حیثیت سے نجیب الدولہ کی سی قابلیت تونہ تھی اور نہ ہی وہ شیروری تھی جس کا ماضی میں مظلیہ سردار مظاہرہ کر چکے تھے۔ تاہم اس کی سربراہی میں مظلیہ فوجیں کسی حد تک انگریزی فوجی طور طریقوں کا مقابلہ کرنے کے قابل ہو گئی تھیں، مگر اس کی موت نے یہ آخری نو بھی گل کر دی۔ ولادت، اصفہان ۱۷۷۳ء (ایسٹ۔ ص ۲۰)

(۳) محمد بیگ ہمدانی (خال آف دی مٹل ایمپائر۔ سرکار۔ حصہ سوم ص ۲۵۸) ہمدانی پہلے نجف خاں کی فوج میں کپتان تھا اور بہت ہو شیر تھا مگر اس میں فریب اور سفاکی دونوں موجود تھے۔ وہ نجف خاں کے انتقال پر اس کا چاٹھین بننے کا متمنی تھا، مگر ایسا نہ ہو سکا۔ تاہم وہ مرتے دم تک مظفر فوجوں کا ایک اہم کمانڈر رہا۔

(۴) علی گڑھ میگزین (غالب نمبر) ۱۹۶۹ء۔ ص ۱۳ ڈاکٹر مسعود حسین خاں لکھتے ہیں کہ لفظ کمدان فرائضی لفظ (Commandant) یعنی ”ک مودان“ کا اردو تلفظ ہے۔ فرائضی فوج کا یہ عہدہ برطانوی فوج کے کمانڈر آفیسر یا سمجھ کے برابر تھا۔ اس طرح خواجہ غلام حسین زیادہ متمول اور صاحب ثروت نہیں ہو سکتے۔ لیکن اگر وہ ”Commander De Place“ ہوں گے یعنی ”کمدان قلعہ“ تو یقیناً بڑی حیثیت کے ہوئے۔

(۵) غالب نے اپنے خط نام شیونرائٹن میں جن حویلیوں کو اپنے والد اور نانا کی املاک بتایا ہے وہ یہ ہیں۔ ۱۔ بڑی حویلی یعنی کالا (کھان) محل، ۲۔ اس کے پاس کھٹیا والی حویلی، ۳۔ سلیم شاہ کے محلے کے پاس کی حویلی، ۴۔ کالے (کھان) محل سے لگی ہوئی حویلی۔ ”اور ایک کٹروہ کہ وہ گڈریچوں والا مشہور تھا اور ایک کٹروہ کہ وہ کشمیران والا کہلاتا تھا۔“ ان میں سے کوئی دو حویلیاں غالب کی والدہ کی ملکیت تھیں۔ شاید ایک تو یہی کالا محل ہو گا، جس کے دروازے کی سنگین پارہوری پر (غالب کی) نشست تھی۔

(۶) غائبانہ کی وجہ ہے کہ غالب نے ہمیشہ اپنی دو حویلیاں ہی پر نظر کیا ہے، نئی حویلی پر نہیں۔

غالب کی تاریخ ولادت

مرزا غالب اپنے والد مرزا عبداللہ بیگ خاں کے انتقال کے وقت صرف پانچ برس کے تھے۔ ان پانچ برسوں میں مرزا عبداللہ بیگ خاں پیشہ سپاہ گری کے باعث اکثر مہمات پر آگرے سے باہر رہا کیے۔ وہ ایسی ہی ایک مہم میں راجا پور کی طرف سے لڑتے ہوئے بمقام راج گڑھ ۱۸۰۲ء میں مارے گئے۔ غالب خود کہتے ہیں :-

کافی بود مشاہدہ، شاید ضرور نیست

در خاک راج گڑھ پدرم را بود مزار

یعنی گولو کی ضرورت نہیں خود چل کر دیکھ لو، مرے باپ کا حرار راج گڑھ میں موجود ہے۔

ظاہر ہے ایسی حالت میں غالب کو اپنی تاریخ ولادت اپنی ماں، دلاوی اور اپنے دوسرے بزرگوں ہی سے جن میں ان کے تاتا خواجہ غلام حسین کیدان اپیش پیش کہے جاسکتے ہیں، معلوم ہوتی ہوگی۔ چنانچہ ہمیں تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ غالب کی تاریخ ولادت وہی ہے جو غالب نے خود صراحتاً کئی دفعہ لکھی، ان کی آنکھیں دیکھے ہووں میں آزاد اور حالی نے لکھی، بعد ازاں ماہرین غالبیات میں، قاضی عبدالودود، عرشی، مالک رام، مسعود حسین رضوی، غلام رسول مہر اور شیخ محمد اکرام نے لکھی۔ مگر عجیب ماجرا ہے کہ غالب کے انتقال کے ۹۸ برس بعد ۱۹۶۷ء میں مسلم شیائی نے لکھا کہ غالب ۸ رجب ۱۲۱۲ھ کو نہیں بلکہ ۸ رجب ۱۲۱۳ھ کو پیدا ہوئے تھے، اس کے دو سال بعد یعنی غالب کی وفات کے سو سال بعد ۱۹۶۹ء میں سید محمد حسین رضوی نے فرمایا کہ وہ ۸ رجب ۱۲۱۳ھ کو بھی نہیں بلکہ ۸ رجب ۱۲۱۱ھ مطابق ۸ جنوری ۱۷۷۹ء کو پیدا ہوئے۔ یہ دونوں چار بیلیں جنہیں اب تک کسی نے تسلیم

نہیں کیا اس واسطے کی مدد سے حاصل کی گئی ہیں جو غالب کے کلیات فارسی مطبوعہ نول کشور ۱۸۶۳ء میں شائع ہوا تھا۔ یہ ڈانچہ خود غالب کا فراہم کردہ نہیں۔ ممکن ہے ضیاء الدین احمد خاں حیدر درخش نے فراہم کیا ہو۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ایک واسطے سے دو مختلف سال ولادت کیوں کر برآمد ہوئے؟ ظاہر ہے ڈانچہ غلط ہے یا ڈانچہ دان۔

پھر غالب کی وفات سے ایک سو پندرہ سال بعد ڈاکٹر حنیف نقوی نے بہت سی ڈرافٹ بنی کے بعد ایک طویل مقالہ غالب کی تاریخ ولادت کے سلسلے میں لکھا اور یہ نتیجہ نکالا کہ غالب کی تاریخ ولادت نہ ہی ۸ رجب ۱۲۱۲ء ہے نہ ۸ رجب ۱۲۱۳ء یا ۱۲۱۱ء بلکہ ۸ رجب ۱۲۰۸ء ہے۔

مگر ان تینوں محترم محققوں نے ایک فیصلہ تو کر ہی دیا وہ یہ کہ انھوں نے غالب کی دی ہوئی تاریخ اور مینے سے کئی اتفاق کیا اب رہ گیا سال ولادت تو اس کی خود غالب نے کم از کم چھ بار صراحت فرمائی ہے تین بار خطوں میں اور تین بار تاریخی مآدوں میں یہ حساب ابجد جو لوگ تاریخی مآذے نکالنے کے فن سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ مآذے کے نکالنے میں کتنی فکر کرنی پڑتی ہے اور جب وہ اعداد کے برابر آجائے تو اس میں کسی قسم کے تسامح کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

یہ بیبیوں اندراجات اتنی مرتبہ دہرائے جا چکے ہیں کہ کسی شخص کو غالب کے دیے ہوئے اور ماہرین غالبیات کے مانے ہوئے غالب کے سال ولادت کے بارے میں شبہ باقی نہیں رہنا چاہیے (ذکر آگے آئے گا) میں ان کے علاوہ ایک اور بات کی طرف دھیان دلانا چاہتا ہوں۔

غالب ۱۲۱۲ء میں پیدا ہوئے۔ ۱۲۲۱ء میں شعر کہنے لگے۔ فارسی کا ذوق ابتدا ہی سے تھا۔ فارسی میں سوچتے تھے اردو میں لکھتے تھے۔ ۱۲۳۱ء تک کے کہے ہوئے تقریباً پورے دو ہزار اشعار دریافت ہو چکے ہیں۔ یہ سب بیدل کے رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔ اس وقت ان کی عمر صرف ۱۹ سال کی تھی۔ تقریباً ۱۲۳۰ء یعنی ۲۸ سال کی عمر کو پہنچ کر انھوں نے طرز بیدل کو خیر باد کہہ دیا۔ مگر ایک عمر تک بیدل غالب کے دل و دماغ پر نہی طرح مسلط رہے چنانچہ وہ ہر طرح بیدل کی جیروی کرتے تھے۔ بیدل نے اپنے سال ولادت کا قطعہ اس طرح

کہا ہے۔

بسا لے کہ بیدل ہلکے ظہور ز فیض ازل تافت چوں آفتاب
بزرگے خبر دا وار مولدش کہ ”ہم فیض قدس“ مست و ہم ”انتخاب“
۱۰۵۳ھ ۱۰۵۳ھ

غالب نے بھی ہو بہو بیدل کی پیروی کی اور یہ رباعی کہی۔

غالب چو زناسازی فرجام نصیب ہم ہم عدد و ارم و ہم ذوق صیب
تاریخ ولادت من از عالم قدس ہم ”شورش شوق“ آہ و ہم لفظ ”غریب“
۱۲۱۲ھ ۱۲۱۲ھ

بیدل نے اپنا سال ولادت فیض قدس اور انتخاب میں کہا اور غالب نے شورش شوق اور غریب میں دونوں سالوں سے ۱۲۱۲ھ پر آہ ہو تا ہے۔^۳

جب ۱۲۵۳ھ (۱۸۳۷ء / ۱۸۳۸ء) میں غالب نے اپنے دلچ ان فارسی کے مسودے کی تکمیل کے بعد تقریباً کبھی تو اس میں یہ رباعی بھی درج کی اور اس سے پہلے لکھا (دیکھیے دلچ ان غالب فارسی۔ پہلا ایڈیشن ص ۵۰۳)

”امر و ذکر از ہجرت خاتم الانبیاء۔۔۔ ایک ہزار و دو صد و پانچادس سال
گزشتہ۔۔۔ مشاہدہ آجہر سال چہل و یکم است۔۔۔“

(آج جب کہ ہجری سنہ ۱۲۵۳ھ ہو چکا ہے۔۔۔ میری عمر آٹالیس سال کی ہے۔)

اب ۱۲۵۳ھ سے ۳۱ سال نکال دیجئے پھر وہی ۱۲۱۲ھ رہ جاتا ہے۔ ڈاکٹر حنیف فوق کہتے ہیں کہ غالب کا چھان کردہ سال ولادت ۱۲۱۲ھ ”راشتہ غلط بیانی“ ہے۔ اس کا بڑا سبب ”مقدمہ“ پنشن کے سلسلے میں ان کا یہ استدلال معلوم ہوتا ہے کہ نصر اللہ بیگ خان کے انتقال کے بعد نواب احمد بخش خان نے خاندانی پنشن کی تقسیم کے معاملے میں ان کے ساتھ جو نامضامین ہجرت دھاندلیاں کیں، ان کے خلاف وہ اس لیے بروقت صدائے احتجاج بلند نہ کر سکے کہ اس زمانے میں وہ اور مرزا علی سف دونوں کم سن تھے اور خاندان میں چند عورتوں اور ان دو کم سن بچوں کے علاوہ کوئی اور موجود نہ تھا۔ یہ بات اضافہ پنشن کے لیے اس پہلی درخواست میں

ایک اہم شق کی حیثیت رکھتی ہے۔ (اس) میں انہوں نے بچا کے انتقال کے وقت اپنی عمر نو سال اور مرزا ابوسف کی عمر سات سال بتائی ہے۔

ڈاکٹر نقوی صاحب کا یہ استدلال کمزور ہے کیوں کہ اگر غالب کی عمر بچا کے انتقال کے وقت ۱۳ سال بھی ہوتی تو بھی وہ اس قائل نہ سمجھے جاسکتے کہ بروقت صدائے احتجاج بلند کر سکتے۔

ہم اوپر کہہ چکے ہیں کہ غالب نے اپنے سال ولادت کی کم از کم جیسے بار صراحت فرمائی ہے، تین بار خطوں میں اور تین بار تاریخی مآذوں میں بحساب ابجد۔

۱۔ مکتوب بنام علائی جون ۱۸۶۱ء

”میں آٹھویں رجب ۱۲۱۴ ہجری میں روپکاری کے واسطے یہاں بھیجا گیا۔“

۲۔ مکتوب بنام علائی ۱۰ جنوری ۱۸۶۳ء

”میں ۱۲۱۴ ہجری میں پیدا ہوا ہوں۔“

۳۔ مکتوب بنام سیاح ۳۱ مئی ۱۸۶۵ء

”۱۲۸۴ ہجری شروع ہوئی۔ ۱۲۱۴ھ کی ولادت ہے۔“

۴۔ ”حسن مارہروی کے پردادا صاحب عالم مارہروی نے غالب سے ان کا

سال ولادت پوچھا اور لکھا کہ میری ولادت (۱۲۱۱ھ) لفظ ”جاریخ“

سے نکلتی ہے۔ مرزا نے جواب میں یہ شعر لکھا۔

ہاتف غیب سن کے یہ چینا ان کی ”جاریخ“ میرا ”جاریخ“

۱۲۱۴ھ

۱۲۱۱ھ

۵۔ شور شوق _____ ۱۲۱۴ھ

۶۔ غریب _____ ۱۲۱۳ھ

غالب نے جس طرح ان بیانات میں سال ولادت کا حقیقی اظہار کیا ہے۔ اس طرح اور کہیں نہیں کہا۔ اس لیے غالب کی جاریخ ولادت ۸ رجب ۱۲۱۴ھ تسلیم کرنے میں کوئی بات مانع نہیں تاوقتہ کہ خود غالب کا حقیقی طور پر بیان کردہ کوئی اور سال ولادت دریافت نہ ہو جائے۔

استدراک

۱۔ ماہنامہ ”سب برس“ حیدر آباد، بابت ماہ مارچ ۱۹۸۹ء کے صفحہ ۷۱ پر اپنے مقالے میں جناب ڈاکٹر محمد انصار اللہ صاحب فرماتے ہیں:

”مولوی کریم الدین نے مرزا غالب کی عمر کے بارے میں پہلی مرتبہ بتایا ہے کہ ۱۲۶۳ھ / ۱۸۴۸ء میں ساٹھ برس کے قریب تھی۔ مولوی آغا احمد علی احمد کے تذکرے ”ہفت آسان“ میں ہے کہ ”لارنس گزٹ میرٹھ مطبوعہ ۲ فروری ۱۸۶۷ء نوشتہ عمر او تحینا ہشتاد و دو سال بودہ است“، یاد جو دیکھ غدر سے پہلے ہجری سال لکھنے اور حساب میں اسی کو کام میں لانے کا معمول تھا۔ مولوی کریم الدین نے عموماً عیسوی سنہ پر زیادہ زور دیا ہے۔ چنانچہ ان کے بیان کے مطابق مرزا غالب کا سال ولادت ۸۸۷ء میں مرزا کی عمر بیاسی برس کے قریب ہوگی اور یہی بات ”لارنس گزٹ“ میں مذکور ہے۔ اپنے بارے میں خود مرزا غالب کا کہنا ہے:

”میں آٹھویں رجب ۱۲۱۲ھ میں پیدا ہوا ہوں۔“
یہاں ان سے تحریر میں غلطی ہو گئی ہوگی یعنی ۱۲۰۲ھ کو ۱۲۱۲ھ لکھ گئے ہوں گے۔ بعد کے لوگوں نے اسی کے مطابق ماخذ تاریخ ”غریب“ مقرر کر لیا اور یہی ان کا سال ولادت مشہور ہو گیا۔“

اس مفروضے کی تقلید کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ غالب نے تاریخی ماخذے ”شوق شوق“ اور ”غریب“ برسوں پہلے فکر کیے تھے اور ۱۲۱۲ھ کا سنہ ہندسوں میں بہت بعد میں لکھا۔ ماخذے کم از کم ۳۸ / ۱۸۳۷ء میں کہے جا چکے تھے اور ”آٹھویں رجب ۱۲۱۲ ہجری“ والا جملہ انہوں نے اپنے مکتوب محررہ جون ۱۸۶۱ء بنام طائی میں لکھا تھا۔

۲۔ ہمیں معلوم ہے کہ کلکتہ میں جو عرضداشت متعلقہ پاشن غالب نے ۲۸ مارچ ۱۸۴۸ء کو داخل کی تھی۔ اس میں انہوں نے لکھا کہ جب ان کے چچا نصر اللہ بیگ خاں کی موت (۱۸۰۶ء) واقع ہوئی اس وقت ان کی عمر ۹ سال تھی۔ ۱۳ مارچ ۱۸۴۸ء کا مرزا یوسف

کے ہاتھ کا لکھا ہوا خط جو نکلنے میں غالب کو موصول ہوا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ والدہ غالب اس وقت دہلی میں موجود تھیں۔ یہ بھی سب جانتے ہیں کہ والدہ کی طرف سے مالی تعاون غالب کو ملتا ہی رہتا تھا۔ حتیٰ کہ قیام نکلنے کے دوران (لگ بھگ جون ۱۸۲۹ء) میں ان کی والدہ نے انھیں = ۵/۷ روپے کی ہنڈی بھیجی تھی۔ جب غالب اپنی والدہ کے اتنے قریب تھے اور یہ قربت تقریباً ۱۸۳۰ء تک رہی تو کیا یہ ممکن ہے کہ غالب نے اپنی عمر اور اپنی تاریخ ولادت کی تصدیق اپنی والدہ سے کبھی نہ کی ہوگی اور کیا ۱۸۲۸ء تک جب کہ غالب کی عمر صرف ۳۱ سال تھی۔ غالب کے اپنے خاندان، نخیالی خاندان اور خاندان لوہارو کے سب بڑے بڑے مرچکے تھے اور کوئی غالب کی تاریخ یا سال ولادت جاننے والا باقی نہ رہا تھا جو غالب کی غلط بیانی پر اسے ٹوکتا

س۔ کیا غالب اس عرضی دعوے میں جس پر انھیں اتنی امیدیں تھیں اور جو کسی قاضی کی عدالت میں نہیں بلکہ انگریزی عدالت میں دائر ہوا تھا، اپنی چھوٹی عمر درج کرنے کی جرأت کر سکتے تھے جب کہ ابھی ان کی صحیح تاریخ ولادت جاننے والے شیعوں بڑے بڑے موجود تھے؟ اگر عمر غلط ہوتی تو اسی بات پر ان کے دشمن اس دعوے کو خارج کر سکتے تھے۔

س۔ بعض محقق اس بات پر زور دیتے ہیں کہ غالب لامیز عمری میں اپنی بیان کردہ عمر سے کہیں زیادہ کے دکھائی دیتے تھے لہذا ان کا سال ولادت ۱۷۷۷ء سے بہت پہلے کا ہونا چاہیے۔ عرض ہے کہ ایک دفعہ ڈاکٹر عابد پشاور کی صاحب (ہیڈ آف دی اردو ڈپارٹمنٹ، جموں یونیورسٹی) سے میں نے ان کی عمر بچھی تو انھوں نے فرمایا ”دیکھنے میں اتنی سال مگر اصل میں پچاس سال“ کیا آخری عمر میں غالب کا بھی یہی حال تھا؟

۵۔ کلیات نظم قاری مطبوعہ نکلنو میں سال ترتیب کلیات ۱۲۷۸ھ بتایا ہے اور عمر ”شت و ششم“ بتائی ہے گویا تاریخ ولادت (۱۲۷۸ - ۶۶ =) ۱۲۱۲ھ ہوئی۔ بقول قاضی عبدالودود (کچھ غالب کے بارے میں۔ حصہ اول مطبوعہ ۱۹۹۵ء ص ۶۷) غالب کے کلیات نظم قاری کے قلمی نسخے (کاتب لارہ بمبئی پور جواہر سنگھ جوہر۔ ربیع الاخر ۱۳۵۳ھ) میں ”غالب نے سال ترتیب کلیات ۱۲۵۳ھ بتایا ہے اور عمر کے متعلق لکھا

ہے۔۔۔ در مشاہدہ آثار سال چہل و یکم است۔۔۔ یعنی (۱۲۵۳-۳۱ = ۱۲۱۲ء سال ولادت ہے۔ بیچ مل غالب کے گہرے دوست تھے اور عمر میں ان سے چند سال بڑے ہی تھے۔ کیا بیچ مل سے غالب کی عمر بچھی ہوئی ہوگی۔

حواشی

(۱) قیاس ہے کہ خواجہ غلام حسین کبیدان انیسویں صدی کے ابتدائی سالوں تک زندہ رہے ہوں گے۔

(۲) پہلے (۱۲۵۰ھ مطابق ۱۰ مئی ۱۸۳۳ء، ۱۶، ۲۹، ۱۷، ۱۸۳۵ء میں) اس رہائی کی شکل یہ تھی۔

”آئم کہ زنا سازی فرجام نصیب
ہم ہم عدد و دم و ہم ذوق صیب
زنا سائیش بہرہ ’ غلام غالب
تاریخ ولادت بود لفظ ’غریب‘“

بیچ آہنگ کا قدیم ترین خطی نسخہ

حلیف نقوی

مطبوعہ ۱۹۹۳ء۔ ص ۱۳

(۳) بعض احباب کو اعتراض ہے کہ غالب نے تاریخ سال ولادت اپنی آخری عمر میں کیوں بتلایا۔ ان کا اشارہ مکتوب غالب بنام علائی (جون ۱۸۶۱ء) کی طرف ہے۔ جس میں درج ہے ”میں آٹھویں رجب ۱۲۱۲ھ میں روپکاری کے واسطے یہاں بھیجا گیا۔“ اول تو یہ

انعام ہی بے بنیاد ہے کیوں کہ انھوں نے زبانی اپنی عمر، تاریخ یا سال ولادت شیعوں کو بتائے ہوں گے۔ مگر ان کا ریکارڈ رکھنا کیوں کر ممکن ہو سکتا ہے۔ دوسرے انھوں نے ۱۸۴۸ء میں داخل کی گئی پٹنن کی درخواست میں لکھا ہے کہ جب ان کے چچا نصر اللہ بیک خان کا انتقال (۱۸۰۶ء) ہوا ہے "اس وقت میری عمر ۹ برس کی تھی اور میرے بھائی کی سات کی۔" اس درخواست کے وقت غالب ۳۱ سال کے تھے۔

غالب کا نام

جناب ممتاز حسین نے اپنی کتاب ”غالب۔ ایک مطالعہ“ کراچی (پاکستان) سے بھجوائی۔ میں نے کتاب پڑھی اور اس سے مستفید ہوا۔ کئی اور باتوں کے علاوہ جواب میں، میں نے یہ بھی لکھا کہ آپ نے جو ص ۲۳ پر غالب کا نام ”مرزا محمد اسد اللہ خاں“ لکھا ہے اور حاشیے میں صراحت کی ہے کہ پورا نام یہی تھا، یہ درست نہیں۔ پورے نام میں بیگ بھی شامل تھا اور محمد نام کا جزو نہیں رہ گیا تھا۔ یعنی محض ”اسد اللہ بیگ خاں“ ہونا چاہیے۔ ممتاز حسین صاحب نے جواب میں فرمایا:

”اس وقت زبانی میں کچھ نہیں کہہ سکتا ہوں۔ ایک بات لکھنا چاہتا ہوں کہ غالب نے ایک خط میں اس کا ذکر کیا ہے کہ نام محمد پر جان چار۔ لیکن اس کے بعد کا جملہ یاد نہیں۔ مفہوم یہی ہے کہ میں نے اسے Dropped کر دیا۔ بہر حال آپ نے جو لکھا ہے اس پر غور کروں گا۔“ (۵ جولائی ۱۹۸۳ء)

خط پڑھ کر فوراً یاد آگیا کہ کچھ ایسی بات ہے تو سہی۔ چنانچہ کھوج شروع ہوئی غالب کی تحریریں اور مہریں دیکھی گئیں۔ پہلے غالب کی تیسری مہر اس کی شاہد لکھی۔ ملاحظہ کیجئے۔

محمد اسد اللہ خاں

۱۲۳۸ھ

جو مطابق ہے ۲۴۔ ۱۸۴۴ء کے۔ اس وقت غالب ۲۵۔ ۲۶ برس کے تھے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب دہلی کے علماء بہت بڑے مذہبی مہاجڑوں میں الجھے ہوئے تھے اور جس میں انھیں

مولوی فضل حق خیر آبادی کے موقف کے مطابق ایک مثنوی بھی کہنی چڑی تھی اس سے شاید انھیں مذہبی امور سے بھی دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ جناب مالک رام (فائدہ غالب ص ۸۳) کے نزدیک ”اس میں دو محرک کار فرما“ ہوئے۔ اول نواب الہی بخش خاں کی عزیزداری جو خود صوفی اور تصوف کے حلقوں میں خاصے معروف تھے۔۔۔ دوسرا اثر مولوی فضل حق خیر آبادی کا تھا۔ (چنانچہ) اس سے پہلے ملن کی مہر پر کندہ تھا۔ اسماء اللہ خاں عرف مرزا نوشہ، اب محمد اسماء اللہ خاں، کیا ملن کی قلب مابیت کا اس سے زیادہ کوئی اور ثبوت درکار ہے؟ گویا محمد اسماء اللہ خاں، ایک عارضی مذہبی جوش کے تحت تھا اور یہ غالب کا اصلی نام نہ تھا۔ لیکن غالب نے پٹنن کے اضافے کے لیے جو درخواست ۲۸ اپریل ۱۸۶۸ء (فائدہ غالب ص ۱۱۳) کو نکلنے میں گورنر جنرل کے نام دی تھی۔ اس میں درج ہے:

”میرے چچا نصر اللہ بیگ خاں کے دارخوئی میں (مرحوم کی بہن کے ملاو) ابو سلف علی خاں میرا بھائی ہے جو مرحوم کا بھتیجا ہے۔۔۔ (اور) آپ کا یہ درخواست گزار ہے۔ میرا نام محمد اسماء اللہ خاں ہے اور عرف مرزا نوشہ۔“

گویا قانونی طور پر اقرار کرتے ہیں کہ ان کا نام اسماء اللہ خاں نہیں، بلکہ ”محمد اسماء اللہ خاں“ ہے اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ ”محمد“ واقعی ان کے نام کا حصہ تھا اور وقتی طور پر مذہبی دلچسپی کے زیر اثر بعد میں اضافہ نہیں کر لیا گیا تھا۔ یہ نکتہ بھی خاص اہمیت کا حامل ہے کہ غالب کی یہ مہر (۱۲۳۸ھ) تقریباً ۳۰ سال تک استعمال میں رہی۔ تاہم ۱۲۶۷ھ (۱۸۵۰ء) دہلی مہر میں پھر صرف ”اسماء اللہ خاں“ ہے اور پھر یا ”اسماء اللہ الغالب“ (۱۲۶۹ھ مطابق ۱۸۵۳ء) اور غالب (۱۳۷۸ھ مطابق ۱۲۶۲ء) لیکن غالب اس تبدیلی کا سبب اپنے ایک خط نام لکھتے (موردہ ۷ اکتوبر ۱۸۵۸ء) میں کھل کر بیان کرتے ہیں:

”سنو صاحب۔ لفظ مبارک میم، جا، میم، وال۔ اس کے ہرف پر میری جان خراب ہے۔ مگر چوں کہ یہاں سے ولایت تک حکام کے ہاں سے یہ لفظ یعنی ”محمد اسماء اللہ خاں“ نہیں نکلتا تھا، میں نے بھی موقوف کر دیا ہے۔ رہا میرا مولانا نواب، اس میں تم کو اور بھائی کو اختیار ہے

جو چاہو سو لکھو۔“

لیکن خود غالب نے اپنے لکھے پر بھی طور پر عمل نہیں کیا چنانچہ ”ازالہ حیثیت عرفی“ کی تلاش کی درخواست پر، جو انھوں نے ۲۰ ستمبر ۱۸۶۷ء کو داخل عدالت کی (احوال غالب ص ۱۳۹) پہلے اپنا نام ”اسد اللہ خاں غالب“ لکھا، پھر اسد اللہ خاں“ اور وکالت نامے پر جو ۱۳ (۴) دسمبر ۱۸۶۷ء کو لکھا گیا اور جس کے وحی پر شاد اور بخشی وزیر علی کو لوہا ہیں، دسجھا ”محمد اسد اللہ خاں“ ثبت کیے۔

اس مقدمے کی ایک اور درخواست مورخہ ۲۳ جنوری ۱۸۶۸ء پر غالب پھر اپنا نام اسد اللہ خاں غالب لکھتے ہیں۔ اس سے پہلے ۱۵ ستمبر ۱۸۶۷ء کو ان کے وکیل عزیز الدین نے خود کو ”وکیل اسد اللہ خاں بخش اور سرکاری عرف مرزا نوشہ“ لکھا ہے۔

یہ عام طور پر مانا جاتا ہے کہ پورا نام ”اسد اللہ بیگ خاں“ تھا۔ مگر غالب نے اپنے دادا، والد اور چچا کے برعکس بیگ کو اپنے نام کا جزو شاید ایک سے زیادہ بار نہیں بنایا۔ حتیٰ کہ بخش کی درخواست میں اپنے منگے بھائی کا نام بھی صرف ”جو سف علی خاں“ لکھا۔

حیرت کی بات ہے کہ قانونی درخواستوں میں بھی غالب نے اپنا نام بیان کرنے میں احتیاط نہیں برتی۔ بہر حال مرد کا صحیح نام ”محمد اسد اللہ بیگ خاں“ ہی تھا۔

حواشی

- (۱) اردوئے معلیٰ طبع نقول ص ۳۱۳۔ خط بنام انور الدولہ شفق۔ نکاشۃ ۱۸/ اکتوبر ۱۸۵۵ء لفظ ”ارنی“ کے تلفظ کی وضاحت کرتے ہوئے بیدآل کے شعر کے بعد، غالب اپنا ایک فارسی شعر درج کرنے سے پہلے شاعر کا یعنی اپنا نام یوں لکھتے ہیں ”اسد اللہ بیک غالب“۔ یہاں پورے نام سے دو لفظ غائب ہیں۔ شروع کا محمد اور آخر کا خاں۔
- (۲) اردو دیوان کے دیباچے میں غالب نے اپنے نام کی سند یوں دی ہے۔ ”میں نقاش بغیر آمدہ نقاش کہ بہ اسد اللہ خاں موسوم بہ مرزا نوشہ معروف بہ غالب مشتمل است۔۔۔“

غالب کا مذہب

مرزا غالب شیعہ تھے۔ اپنے ایک خط بنام نواب علاء الدین احمد خاں غلانی، مورخہ ۷ جولائی ۱۸۶۲ء میں لکھتے ہیں:

” (میں) موجد خالص اور مومن کامل ہوں۔ زبان سے لا الہ الا اللہ کہتا ہوں اور دل میں لا موجود الا اللہ، لا موثر فی الوجود الا اللہ، سمجھے ہوئے ہوں۔ انبیاء سب واجب التعلیم اور اپنے اپنے وقت میں مفترض الطاعت تھے۔ محمد علیہ السلام پر نبوت ختم ہوئی، یہ خاتم المرسلین اور رحمت اللعالمین ہیں۔ متقطع نبوت کا مطلع امامت اور امامت نہ اجتماعی، بلکہ من اللہ ہے اور امام من اللہ علی علیہ السلام ہے، ثم حسن ثم حسین، اسی طرح تادمہدی موعود علیہ السلام۔ ع
بریں زمیں ختم ہم بریں گزرم

حضرت مجتہد العصر سلطان العلماء مولوی سید محمد صاحب ٹکسٹوی کو ایک خط (مشمول پیچ آہنگ مطبوعہ ۱۸۵۴ء) میں لکھتے ہیں:

”اکنوں گاہ آنت کہ بساط شر اور نور دم و پ شہار غزل نواج گردم،
تا پید آید کہ خاک نشین کج ناکای در تہ کلاہ نمہ چہ شور اور
سر دار۔۔۔“

(اب موقع ہے کہ بساط شر کو الٹ دوں اور غزل کے قاعدے سے
نواجچی کروں تاکہ ظاہر ہو جائے کہ کج ناکای کا خاک نشین (یعنی

غالب اپنی نگاہِ نمد سے ڈھکے ہوئے سر میں کیا شور رکھتا ہے۔

یہ بیان اسی مثنوی سے متعلق ہے جو غالب نے شاہ ظفر کی طرف سے، شیعت سے برأت کے مضمون کی، ۵۳ / ۱۸۵۳ء میں کہی تھی۔ اس پر بڑا ہنگامہ ہوا تھا۔ غالب بھی اس کی زد میں آگئے تھے۔ انھوں نے زوج ہو کر یہ خط سلطان العلماء مولوی سید محمد قلمی کو لکھا تھا۔ اس بیان کا اردو ترجمہ جناب مہاجر نے (اقتباس لا شیخ آجنگ اردو ترجمہ مطبوعہ پاکستان) یہ کیا ہے۔

”اب وقت آگیا ہے کہ غزل کے پردہ میں اپنے عقیدہ کا اظہار کروں
تاکہ دنیا کو معلوم ہو جائے کہ کج ناکائی کے خاک نشین کے دل میں کیا
ہے۔“

اس غزل سے غالب کی مراد کون سی غزل ہے جس میں وہ اپنول کھول کر رکھ دینا چاہتے
تھے؟ حاشیے میں مہاجر صاحب :-

مشغول حق ہوں بندگی یو تراب میں

کے مقطع دہلی غزل کو یہ غزل قرار دیتے ہیں، مگر یہ درست نہیں کیوں کہ یہ غزل دیوان
غالب مطبوعہ ۱۸۴۷ء کے متن میں موجود ہے گویا ۱۸۴۷ء یا اس سے پہلے کہی گئی تھی۔
اسے ۵۳ / ۱۸۵۳ء کی فکر کردہ نہیں کہا جاسکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ غالب کا اشارہ اس
غیر متداول شعر کی طرف ہے، جو ۱۸۵۳ء میں کہا گیا تھا۔ ملاحظہ ہو :-

سلام ^۲ اسے کہ اگر پادشاہ کہیں اس کو	تو پھر کہیں کہ کچھ اس سے سوا کہیں اس کو
نہ پادشاہ، نہ سلطان، یہ کیا ستائش ہے؟	کہو کہ خاص آلِ عبا کہیں اس کو
خدا کی راہ میں شامی و خسروی کیسی؟	کہو کہ رہبرِ عالم خدا کہیں اس کو
خدا کا بندہ، خداوندگار بندوں کا	اگر کہیں نہ خداوند، کیا کہیں اس کو؟
فروغِ جوہر ایمان، حسینِ امن ملی	کہ شمعِ انجمن کبریا کہیں اس کو
کھیلِ بخششِ اُمت ہے بن نہیں پڑتی	اگر نہ شافعِ روزِ جزا کہیں اس کو
صبحِ جس سے کرے اخذِ فیضِ جاں بخشی	ستم ہے، کشتہٗ تیغِ جفا کہیں اس کو
وہ جس کے ماتمیوں پر ہے سلسیل، سبیل	شہیدِ تختہٗ لب کر بلا کہیں اس کو

کہ جن دامن ملک سب بھائیں اس کو
بقدر فہم ہے، گر کیمیا کہیں اس کو
کہ لوگ جو ہر تیغ قضا کہیں اس کو
اگر نہ درد کی اپنے دوا کہیں اس کو
مگر نبی و علی مر جا کہیں اس کو
پس او حسین علی، بیٹھا کہیں اس کو
کہ طالبان خدا رہ جا کہیں اس کو
پیادہ لے چلیں اور تا سزا کہیں اس کو
علی سے آکے لڑے اور خطا کہیں اس کو
برانہ ملے، گر ہم برا کہیں اس کو
کرے جو ان سے برائی، بھلا کہیں اس کو؟
رکے امام سے جو بغض، کیا کہیں اس کو؟
نظر نہیں ہے کہ خوئی نوا کہیں اس کو
گویا غالب کا عقیدہ (یا اس کے کلامِ خدا سے اٹھنے ہوئے سر میں شور) وہی ہے جو اس

عہد کے سحرِ ضامیں جگہ نہ پائے وہ بات
بہت ہے پایہ گردِ رو حسین، بلند
نظارہ سوز ہے یاں تک کہ ہر ایک ذرہ خاک
ہمارے درد کی یارب، کہیں دوا نہ ملے
ہمارا مصہ ہے کہ دیں اس کے حسنِ صبر کی دوا؟
زمانہ تاقہ، لب اس کے میں ہے کہ اہل یقین
وہ ریگِ قنوتِ ولوی پہ گام فرسا ہے
امامِ وقت کی یہ قدر ہے کہ اہلِ عناو
یہ اجتہادِ عجب ہے کہ ایک دشمن دیں
بڑے کو تو نہ تھا اجتہاد کا پایہ
علی کے بعد حسن اور حسن کے بعد حسین
نبی کا ہو نہ جسے اعتقاد، کافر ہے
بجرا ہے، غالب دلست کے کلام میں درد

غزل (سلام) میں بیان ہوا ہے۔

اوپر بیان کیے گئے دونوں بیانات، اقرار باللسان مکار و جہ رکھتے ہیں۔ غالب عمر بھر وقتاً
وقتاً اپنے شیعہ ہونے کا اعلان کرتے رہے ہیں۔ ان کے مخاطب سنی اور شیعہ احباب دونوں
تھے۔ ایسے بیانات کا دہرنا محض مضمون کو طول دینا ہے اس لیے ان سے احتراز کیا جاتا ہے اور
صرف ایک خطابی واقعہ اور درج کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ عام طور پر معلوم ہے کہ نواب
ضیاء الدین احمد خاں نیرور عثمانی (۱۸۲۱ء تا ۱۸۸۵ء) نے مل ملا کر غالب کی تجویز و تحفین شیعہ
طریقے پر نہیں ہونے دی تاکہ یہ تاثر پڑے کہ وہ شیعہ نہ تھے حالانکہ وہ خوب
جانتے تھے کہ غالب شیعہ تھے مگر وفاتِ غالب کے کچھ سال بعد جب مولانا محمد حسین آزاد
نے نواب علاء الدین احمد خاں علانی (جو خود اپنے چچا نواب ضیاء الدین احمد خاں کی طرح سنی
تھے۔ ۱۸۳۳ء تا ۱۸۸۳ء) سے دریافت کیا کہ غالب کا مذہب کیا تھا تو انھوں نے جواب دیا:

”اصل یہ ہے کہ مرزا صاحب اولادِ مسلم اور تور سے ہیں اور ترکمان

کہلاتے ہیں۔ احمد اوان کے شیعہ نہ ہونے تھے مگر اس ملک کا آدمی اور
ترکمان لوگ اکثر تفصیلی ہیں اور مرزا صاحب کو نظر سیر اور تاریخ پر

تھی۔ ان کے نزدیک حقیقت خلافت امامت کی ثابت ہوئی۔“

گویا وہ شیعہ ہو گئے۔ مگر کیوں ہو گئے؟ نواب علانی آگے چل کر فرماتے ہیں کہ ”کثرت
صحبت ایران کے ساتھ اور خصوصاً نواب حسام الدین کے ساتھ اور بخشی محمود رضاخان کے
ساتھ اس امر کی باعث ہوئی۔ اس پر مالک رام صاحب اضافہ کرتے ہیں:

”میرا خیال ہے کہ اس میں ملا عبد الصمد کی صحبت کو بہت دخل رہا
ہو گا۔۔۔ ان (غالب) کے تعلقات نواب حسام الدین حیدر خان کے
خاندان سے نہایت ابتدائی زمانے سے تھے اور ان کے صاحبزادے
ناصر حسین میرزا ان کے بھولی تھے۔“

غالب ایک بہت بڑا ذہن لے کر آئے تھے۔ جیسا کہ علانی نے لکھا ہے انھوں نے
نہ ہب نامیہ اس وقت اختیار کیا جب ان پر ”حقیقت خلافت امامت کی ثابت ہوئی۔“ اسی لیے
ان میں غلو کا شائبہ تک نہیں پایا جاتا۔ حقیقت میں کسی کے راسخ العقیدہ ہونے کے یہ معنی کبھی
نہیں ہوتے کہ وہ جاوے چلا اپنے اعتقادات کے ڈاٹے عصیت سے ملتا رہے۔ کشادہ ذہن
شخص راسخ العقیدہ ہے کہ بے عقیدہ، کشادہ ذہن ہی رہتا ہے کیا وجہ ہے کہ غالب نے اپنی
تعلقات کو اپنے مسلک کے پرچار کا ذریعہ نہیں بنایا بلکہ انھوں نے بعض ایسے اشعار بھی کہے
جو ضیعت تو کیا اسلام سے بھی میل نہیں کھاتے اور ایسا کرنے میں انھوں نے جس چابک دستی،
فلکیگی اور معنی آفرینی کا ثبوت دیا ہے، وہ آنے والی نسلوں کے لیے مشعل رہا ہے۔ وہ
مرد سیدہ ہوتے گئے اور اپنے ذہن کو کشادہ کرتے گئے۔ ۱۸۳۳ء کے بعد کا جب کہ وہ پچاس
سال کی عمر سے تجاوز کر چکے تھے یہ شعر دیکھیے۔

جلا ہے جسم جہاں، دل بھی جل گیا ہو گا
کرے ہو جو اب راکھ جستجو کیا ہے

شاربھین نے عموماً اس کے معنی ”آتشِ فراق“ سے سارے بدن کے جل جانے کے کیے ہیں۔ یہ معنی قطعی سچی ہیں۔ اسے ہندو مذہب کے آئینے میں دیکھنا چاہیے۔ پوری اردو شاعری میں اس شعر کا سر اوف نہیں ملے گا۔

۵۵ سال کی عمر میں فکر کر وہ ایک شعر ملاحظہ فرمائیے۔

بار بچہ اطفال ہے دنیا مرے آگے

ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

یہ بھی خالص ہندو مذہب کا شعر ہے۔ ”لیلا“ کا تصور ہندو فلسفے کا اہم جز ہے۔

غالب نے عہدِ جوانی (۱۸۶۱ء) میں ایک نہایت خوب صورت شعر کہا تھا۔

نثر رنگ سے ہے داشتہ گل

مست کب بند تھا باندھتے ہیں

شاربھین غالب اس کا مطلب یہ لیتے ہیں کہ ”پھول نے اپنے بند تھا اس لیے کھول دیے ہیں

کہ وہ نثر رنگ سے مست ہو گیا ہے۔“ لیکن یہ شعر اس وقت تک صحیح معنی نہیں دے سکتا۔

جب تک اس مصرعِ ازل کو مصرعِ حالی اور مصرعِ حالی کو مصرعِ ازل بنا کر نہ پڑھا جائے۔ یعنی۔

مست کب بند تھا باندھتے ہیں

نثر رنگ سے ہے داشتہ گل

یعنی مست کی چادرِ دری پر نہ چاہیے اسے ہوش کہاں وہ تو سرورِ عرفان میں مست ہے۔ وہ

ایک پھول کی طرح ہے جو اپنے رنگ کے نشے میں ڈوب کر کھل اٹھتا ہے اور اپنے لباس

خاموشی کھڑے کھڑے کر ڈالتا ہے۔

غالب بھی اپنے تخیل کے نشے میں مست ہو کر طرح طرح کے شعر کہہ جاتا ہے۔

اسے مسلکِ مذہب کی چادرِ داری کا ہوش کہاں رہتا ہے۔ اس مجنون چمن کا دامن رنگ اور

نکلتی سے ہمہ وقت بھرا رہتا ہے۔

حواشی

- (۱) شیخ آہنگ مرتبہ وزیر انکسنادی میں شرم لکھا ہے جو درست نہیں۔ شیخ آہنگ اشاعت دوم ۱۸۵۳ء، ص ۳۳۳ پر شرعی درج ہے اور یہی صحیح ہے۔
- (۲) دیوان غالب نسخہ گیتارضا۔ مطبوعہ ۱۹۹۵ء، ص ۳۳۵۔ یہ سلام پہلے پہل رسالہ مہر لکھنؤ کے معنی ۱۹۲۹ء کے شمارے میں شائع ہوا۔ بعد میں ”مختصر کات غالب“ میں شامل کیا گیا۔ اس کا ایک نقلی اندراج رسالہ مہر یریں رام پور میں ہے۔
- (۳) عارف اور فرزندِ غالب؟ والے مضمون میں جو اسی کتاب میں شامل ہے۔ یہ بات کمال کر سامنے آگئی ہے۔
- (۴) ”نگار“ فروری ۱۹۶۳ء۔ ص ۱۰
- (۵) اہل سنت کے ایک فرقے کا نام جو حضرت علی کو تمام اصحاب رسول پر فضیلت دیتا ہے۔
- (۶) ذکر غالب۔ ہارچشم۔ ص ۲۵۱

زوجہ غالب امر او بیگم

(ازدواجی زندگی کے پہلے ۱۶ سالوں کی مختصر داستان)

غالب جب نواب احمد بخش خاں کے دم و لاسوں سے مایوس ہو گئے تو انھوں نے بخش کا مقدمہ لڑنے کے لیے سرکلکٹ کی خدماتی وہ کلکتہ جاتے ہوئے بنارس^۱ سے بیجمل کو ایک خط^۲ (تقریباً جولائی ۱۸۸۲ء) میں لکھتے ہیں:

قطعه مکتوب ملفوف است۔ یکے بہ جناب مہاراجا الدولہ نواب حسام الدین
میدر خاں^۳ بہادر دیکھے بخند مت جناب مولوی فضل حق دیکھے بہ

غیم خانہ بدتر از دایرانہ غالب ناکام رسانند۔۔۔۔۔

یعنی ایک (تیسرا) خط غالب ناکام کے غیم خانے پر وجود پرانے سے بدتر ہے، پہنچاویں۔
اس جیلے کے کھینچنے کے لیے یہ چند باتیں پیش نظر رکھنی ہوں گی۔ جب یہ خط لکھا گیا اس وقت:

۱۔ غالب نے اپنی عمر کے ابھی ۳۰ سال بھی پورے نہیں کیے تھے۔

۲۔ غالب اور امر او بیگم کی شادی کو ۷ سال پورے ہو رہے تھے اور وہ جلی میں غالب کی مستقل سکونت کو تقریباً ۱۴ سال۔

۳۔ غالب نے ان ۱۴ سالوں میں سوائے شعر کہنے اور رنگ و لیاں مٹانے کے کوئی اور کام نہ کیا جب کہ غالب کی مستقل آمدنی ساڑھے ہاسٹہ روپے مہینہ (و خیفہ سرکاری) تھی۔

۴۔ ظاہر ہے اس قلیل آمدنی میں یہ شاہ فریدیاں ممکن نہ تھیں ان اخراجات کو پورا کرنے میں غالب کے خسر (امرو ٹیکم کے والد) نواب الہی بخش خاں، آگرے سے غالب کی والدہ، فتوحات سے غالب کا ہاتھ ملاتے رہتے تھے۔ باقی قرضہ لے لیا جاتا تھا۔

۵۔ شیخ آہنگ (مطبوعہ ۱۸۵۳ء) میں ایک عظیم نام انور الدولہ بہادر ہے۔ جس میں غالب لکھتے ہیں:

”سی سال است کہ خانہ و کاشانہ فروخت کو بکوی مردم و مقاصد معین مدام۔“

یہ خط شیخ آہنگ کی اشاعت نزل (۱۸۳۹ء) میں نہیں ہے اس لیے ظاہر ہے کہ ۱۸۳۹ء اور ۱۸۵۳ء کی درمیانی مدت میں لکھا گیا ہے۔ اگر اسے ۱۸۵۳ء ہی کا لکھا ہوا مان لیا جائے اور اس میں سے تیس سال نکال دیے جائیں تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ غالب ۱۸۲۳ء تک (بہ عمر ۲۶ سال) ان کے پاس ان کا اپنا گھر تھا جو اسی سال یا اس سے دو تین سال قبل فروخت کر دیا گیا۔ اس کے بعد غالب کی زندگی میں انھیں کبھی یہ استطاعت نہیں ہوئی کہ وہ اپنے مکان میں رہ سکیں اور وہ ہمیشہ کرائے ہی کے مکان میں رہا کیے۔ ویسے اس مکان کی فروخت سے پہلے بھی وہ کبھی اس قابل نہ تھے کہ دہلی میں خود اپنا مکان بنوا سکتے یا خرید سکتے۔ قیاس غالب ہے کہ یہ آبائی مکان ہو گا جو ان کے دادا قوٹان بیگ خاں نے اپنے قیام دہلی کے دوران میں خرید لیا ہو گا اور یہ کہنا بھی غلط نہ ہو گا کہ غالب کے والد عبداللہ بیگ خاں کی ولادت اسی مکان میں ہوئی تھی۔

امرو ٹیکم اور غالب کی شادی ۱۹/ اگست ۱۸۱۰ء کو ہوئی۔ غالب دو تین برس اور آگرہ میں رہ کر ۱۸۱۲ء - ۱۸۱۳ء میں مستقل طور پر دہلی چلے آئے۔ یہاں وہی میں وہ اپنے علاحدہ مکان میں رہے۔ “ (ذکر غالب۔

پانچواں ایڈیشن ص ۳۳) یعنی اپنے سسرال میں نہیں رہے۔ ظاہر ہے جس مکان میں یہ میاں بیوی شادی کے بعد دہائی آکر رہے تھے وہ یہی آبائی مکان تھا جسے غالب نے ۱۸۲۳ء میں فروخت کر دیا اور اس طرح اپنے حصے کی رقم سے کچھ قرض چکا یا جو جوانی کی رنگ رلیوں نے ان پر لا دیا تھا۔

۶۔ غالب اسی گھر میں غالب اور امر لاؤ نیگم کی سات اولادوں میں سے دو یا تین بچوں کا جنم ہوا ہو گا اور یہیں انھیں ان بچوں کی موت کا غم سہتا چڑا ہو گا۔

۷۔ جیسا کہ ان کے پٹن کے مقدمے کی عرضداشت سے ظاہر ہے، غالب لگ بھگ تیس سال کی عمر تک اپنے والد اور تاتا کا ترکہ بچا ہوا کر تقریباً برابر کر چکے تھے۔ نواب احمد بخش خاں نہ صرف یہ کہ اب قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھے تھے بلکہ صحن حیات اپنی ریاست کے ہزارے کا پٹان بھی مکمل کر چکے تھے۔ صرف غل در آمد ہاتی تھا۔ چنانچہ غالب کے لیے فتوحات کا یہ دور ازہ بھی بند ہو گیا۔ والدہ گھنٹوں گھنٹوں قرض میں پھنسی ہوئی تھیں۔

۸۔ اسی اثنا میں (۱۸۲۶ء) غالب کے خسر نواب الہی بخش خاں معروف (والد امر لاؤ نیگم) نے وفات پائی۔ ظاہر ہے کہ غالب ان کے جنازے کو کندھا بھی نہ دے سکے کیوں کہ وہ اپنے سفر کلکتہ پر نکل چکے تھے۔ دور ان سفر ہی میں انھیں اپنے خسر کے انتقال کی خبر ملی ہو گی۔

مندرجہ بالا سے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں کہ غالب کے خط سے لیے ہوئے جملے کا حرف حرف غالب کے حالات کی عکسی تصویر ہے۔ ”غالب ناکام“ کی وضاحت کی ضرورت ہی نہیں۔ ”غم خانہ“ بدتر از دیرانہ“ کا اطلاق گھر پر چڑے طور پر اس لیے ہوتا ہے کہ امر لاؤ نیگم کے والد کے انتقال کو ابھی چند ہی ماہ گزرے ہیں اور کہ وہ دہائی کے کرایہ کے سنے مکان میں تن تہا رہ رہی ہیں جب کہ ان کی عمر ابھی ۷۷-۸۰ سال سے زیادہ نہیں۔

ان ۱۶ برسوں میں امرالا بیگم نے اپنے شوہر کے عشق و محبت کے افسانے سنے، قبیل آہنی میں گزارا کیا جب کہ وہ خود تازوں میں پٹی تھی۔ آبائی گھر سے ہاتھ دھوئے۔ بیوی کو اپنے گھر سے جو محبت ہوتی ہے وہ کسی سے ڈھکی چھپی نہیں، بچے جنے اور ان سے اپنی گود سونی کر کے موت کی گود بھر دی، پھر عظیم المرتبت باپ (معروف) کا انتقال ہو گیا وہ بھی ایسے وقت جب کہ شوہر برسوں کے سفر پر گھر سے جا چکے تھے۔ اگرچہ خط کے اس جھلے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ غالب اپنی اہلیہ کے دکھوں میں برابر شریک رہتے تھے اور ان کے بارے میں فکر مند رہتے تھے تاہم ان حالات سے امرالا بیگم کی ازدواجی زندگی کے ابتدائی ۱۵-۱۶ سالوں کے جو نقوش ابھرتے ہیں وہ نہایت مایوس کن ہیں۔ ان حالات نے اگر بقیہ زندگی بھر کے لیے ان کے مزاج کو تلخ بنالیا تو کوئی عجب نہیں۔

حواشی

(۱) اس خط میں ایک قطعہ ہے جس کے دوسرے شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خط غالب نے بنارس پہنچنے پر لکھا تھا۔ شعر یہ ہے۔

گو بند، زندہ تا بہ بنارس رسیدہ است
بارا بریں گیاہ ضعیف ہیں گماں نہ بود

(۲) دیکھیے بیچ آہنگ

(۳) غالب، مثنوی چراغ ویر میں، جو انہوں نے بنارس میں لکھی تھی، لکھتے ہیں۔ زار باب وطن جویم۔ تن دل کہ رنگ دروئی اندا میں نہ چمن را (اہل وطن میں سے مجھے تین آدمیوں کی تلاش رہتی ہے) ایک مولوی فضل حق (ہم از حق فضل حق را باز خواہم) دوسرے حسام الدین حیدر خاں (حسام الدین حیدر خان نوہیم) تیسرے امین الدین احمد خاں (امین الدین احمد خاں طرازم)۔ شاید امین الدین احمد خاں اس وقت لوہارو میں ہوں گے پانن کے نام الگ سے خط لکھا ہو گا۔

غالب بنام امر او بیگم

غالب ۲۱ یو ۱۸۲۸ء کو کلکتہ پہنچے۔ کلکتہ پہنچ کر یہ شاید دوسرا خط تھا جو انھوں نے رائے بیچ مل کو بھیجا۔ قیاس ہے کہ مارچ ۱۸۲۸ء میں لکھا ہو گا۔ پہلا خط جیسا کہ اس خط میں درج ہے، انھوں نے درود کلکتہ کے فوراً بعد راجہ سوہن لال کے توسط سے بھیجا تھا۔ اس کا جواب نہ پا کر یہ دوسرا خط بھیجا۔ لکھتے ہیں:

”ایک مکتوب ہے بے لفاظی و رلف خط ٹھکانے میں رسد۔ راقم رات اس زمانہ
حالے کہ درخورد تحریر باشند، روئے نمودہ۔“

(اب ایک بے لفاظی (کھلا) خط ٹھکانے (میرے گھر) کے خط میں لپٹا
ہوا پہنچتا ہے۔ راقم کو (مجھے) آج تک کے قائل تحریر حالات نہیں
پہنچے۔)

ظاہر ہے کہ ان قائل تحریر حالات میں گھر اور سرکار دربار دونوں کے حالات شامل
ہیں۔ غالب نے اپنے گھر کو اب کے بھی ”ٹھکانہ“ ہی لکھا ہے۔

اس خط کے بعد تقریباً تیس سال تک ہمیں غالب کے خطوط میں کوئی ایسی بات نہیں
ملتی جس سے ان کے اور امر او بیگم کے تعلقات پر روشنی پڑتی ہو۔ ہاں ایسے فقرے کہیں مل
جائیں قول جائیں جیسے ”اپنے گھر میں اور اپنے بچوں کو میری اور میرے گھر کی طرف سے دعا
کہہ دینا اور تم کو بھی تمھاری استانی دعا کہتی ہیں“ یا ”حکیم غلام نجف خاں کو جن کو وہ اپنے بیٹے
کی طرح جانتے تھے لکھتے ہیں“ ”تمھاری ماں دعا کہتی ہے“ یا ”تمھاری استانی تم کو... دعا کہتی
ہیں“ وغیرہ اس کا سبب یہ ہے کہ اس لیے عرصے کے دوران میں غالب نے کوئی ایسا باسفر

نہیں کیا جس میں انھیں اپنے گھر کی خبر دریافت کرنے کی ضرورت پڑتی۔ یہ لمبا عرصہ امر و تنگم کے لیے بڑا ایسا سکن تھا، پہلے ۱۶ سال سے بھی زیادہ۔ انھوں نے سات بچوں کو جنم دیا ان میں سے کچھ اس عہد میں بھی پیدا ہوئے ہوں گے مگر ان میں سے کوئی زندہ نہ بچا۔ ان کے امیر کبیر فقیر معش والد نواب الٰہی بخش خاں معروف، بہن بنیادی تنگم، بہن کے بیٹے عارف، سب اللہ کو پیارے ہو گئے۔ گویا امر و تنگم گھر میں غالب کے ساتھ جو چتر مردانے میں رہا کرتے تھے تہا زندگی گزارتی رہیں۔ البتہ عارف کے انتقال (۱۸۵۲ء) کے بعد جب عارف کے دونوں بچے ان کی پرورش میں آئے تو امر و تنگم کے یہاں پھر سے بہار آگئی اور گھر میں غالب کی دلچسپی بھی دو چند ہو گئی، اگرچہ وہ قلیل آمدنی کی وجہ سے اکثر گھبرا کر کہہ اٹھتے تھے:

”تاہل میری موت ہے۔ میں کبھی اس گرفتاری سے خوش نہیں رہا۔۔۔ خدا نے لا ولد رکھا تھا۔ شکر بجالاتا تھا۔۔۔ یہ (عادل) قید جادوئی ہے۔۔۔ اگر میں تنہا ہوتا تو اس وجہ قلیل (پنشن) میں کیا فارغ الہال اور خوش حال رہتا۔۔۔“

مکتوب بہام حکیم غلام نجف علی خاں (۱۸۵۸ء)

تاہم اس میں شک نہیں۔ ان بچوں کی رفاقت میں غالب کو ایک نئی زندگی کا تجربہ ہوا اور ان کا خانگی بندھن مضبوط ہو گیا۔

جنوری ۱۸۶۰ء میں غالب کو رام پور کا سفر درپیش ہوا۔ وہ ۱۹ جنوری ۱۸۶۰ء کو دہلی سے روانہ ہوئے۔ ۲۱ جنوری کو میرٹھ سے حکیم غلام نجف خاں کو لکھتے ہیں:

”لوگوں کے ہاتھ کے دو خط لکھے ہوئے ان کی دہلی کو بھجوادیے ہیں۔ تم اس اپنے نام کے خط کو لے کر ڈیوڑھی پر چالو اور اپنی استانی میں کو پڑھ کر سناؤ اور خیر و عافیت کہہ دینا۔“

غالب ۲۷ جنوری کو رام پور پہنچے۔ وہاں سے ۳ فروری کو پھر حکیم صاحب کو لکھتے ہیں:

”اب تم ایک کام کرو۔ آج یا کل ڈیوڑھی پر چالو اور جتنے خط جمع ہیں۔۔۔ لو اور ان تلکی مضبوط کاغذ کاغذ کاغذ کر دو اور ہر تک لکھ کر کلیان کے ہاتھ

ڈاک گھر میں بھجوا دو۔

پھر اسی خط میں وہ اپنا حال الگ لکھتے ہیں۔ حقیقت میں یہ حال حکیم صاحب کے لیے نہیں، اپنی بیوی امر ڈاک گیم کے لیے ہے۔ ذرا تفصیل ملاحظہ کیجئے:

اب میرا حال سنو۔ تعلیم و توقیر بہت ملاقاتیں تھیں ہوئی ہیں۔ ایک مکان کہ وہ تین چار مکانوں پر مشتمل بنے رہنے کو ملا ہے۔ یہاں پھر تو دوا کو بھی میسر نہیں۔ نشتی مکان نکلتی کے ہیں۔ کچی دلی دریں اور کچھریل، سارے شہر کی آبادی اسی طرح پر ہے۔ مجھ کو جو مکان ملے ہیں وہ بھی ایسے ہیں۔

ہنوز کچھ گفتگو درمیان نہیں آئی۔ میں خود ان سے ابتدائے کروں گا۔ وہ بھی مجھ سے پالٹا فائدہ نہ کہیں گے۔ مگر یہ واسطہ کار پر دلائل سرکار۔ دیکھوں کیا کہتے ہیں اور کیا مقرر کرتے ہیں؟ میں سمجھا تھا کہ میرے بچنے کے بعد جلد کوئی صورت قرار پائے گی لیکن آج تک جمعہ آخروں دن میرے بچنے کو ہے، کچھ کلام نہیں ہوا۔

کہتا دونوں وقت سرکار سے آتا ہے اور وہ سب کو کافی ہوتا ہے۔ غذا میرے بھی خلاف طبع نہیں۔ پانی کا شکر کس منہ سے لا کر دوں۔ ایک دریا ہے ”کوسی“ یہاں اللہ اتنا نیل پانی کہ پینے والا گمان کرے کہ یہ پھیکا شر بہت ہے۔ صاف، سبک، گورا، ہاضم، سرخ الفلوز اس آنکھ دن میں قبض و انقباض کے صدمے سے محفوظ ہوں۔ صبح کو بھوک خوب لگتی ہے۔ لڑکے بھی سدرست آدمی بھی تو تھا مگر ہاں ایک عنایت اللہ دو دن سے کچھ بیمار ہے۔ خیر، اچھا ہو جائے گا۔ والد حال۔

امر ڈاک گیم کا جواب بھی بالکل وہی ہے جو ایک وفاداری بیوی اپنے خاوند کو دے سکتی ہے۔ چنانچہ انھوں نے حکیم صاحب سے کہہ دیا ہو گا کہ لکھ دیجئے کہ اپنا حال لکھنے میں تاخیر سے کام نہ لیا کریں، خط جلد جلد لکھا کریں۔ غالباً فروری کو اس کا جواب ملوں لکھتے ہیں اور بھیج دیتے ہیں کہ شاید حکیم صاحب امر ڈاک گیم کو ان کا پر راعط پڑھ کر نہیں سناتے:

”یہ تم کیا لکھتے ہو کہ گھر میں خط جلد جلد لکھا کرو۔ تم کو جو خط لکھتا ہوں گویا حصارِ استانی جی کو لکھتا ہوں۔ کیا تم سے اتنا نہیں ہو سکتا کہ جلد اور پڑھ کر سنو؟ اب ان کو خیال ہو گا کہ اس انگریزی خط میں کیا لکھا ہے۔ تم یہ خط میرا ہاتھ میں لیے جاؤ اور حرف پہ حرف پڑھ کر سنو۔ لڑکے دونوں اچھی طرح ہیں۔ کبھی میرا دل بہلاتے ہیں کبھی مجھ کو ستاتے ہیں۔ بکریاں، کیوتر، بئیریں، ٹکلی، کنکولہ سب سامان درست ہے۔ فروری مہینے کے دو دو روپے لے کر دس دن میں اٹھا ڈالے۔ پھر پوسٹوں جھونٹے صاحب آئے کہ دادا جان کچھ ہم کو قرض حسد دو۔ ایک روپیہ دونوں کو قرض حسد دیا گیا۔ آج چودہ ہے، مہینہ اور ہے۔ دیکھیے کے بار قرض لیں گے۔

یہاں کارنگ نواب صاحب کے آنے پر جو ہو گا اور جو قرار پائے گا وہ مفصل تم کو لکھوں گا اور تم اپنی والدہ کو سنا دینا اور ہاں بھائی، یہ بھی گھر میں پوچھ لیا کہ کیدار ناتھ نے اندر باہر کی تحفہ دیا یا نہ دی؟ میں نے تو دواؤں اور حلال خوری تک کی بھی تحفہ بھیج دی ہے۔

غالب کا اردو تھا کہ وہ گرمی اور برسات کا موسم رام پور میں گزاریں۔ وہاں انھیں نواب محمد یوسف علی خاں ناظم نے ہر طرح کا آرام دے رکھا تھا مگر بچوں (باقری علی خاں و حسین علی خاں، فرزند ان عارف) نے واپس دئی آنے کی ضد کی۔ ان کی کم عمری کے سبب مرزا نے مناسب نہ سمجھا کہ انھیں تہذیبی سمجھیں۔ آخر وہ بھی واپس آگئے اور رام پور سے ۷ مارچ ۱۸۶۰ء کو چل کر ۲۴ مارچ ۱۸۶۰ء کو دئی پہنچ گئے۔ اسی دن روزوں کا چاند ہوا۔

۳۱ / اپریل ۱۸۶۵ء کو نواب محمد یوسف علی خاں ناظم کا انتقال ہو گیا اور نواب کلب علی خاں نے مستند سنبھالی۔ غالب، نواب مرحوم کی تعزیت اور نواب حال کی جہنیت کے لیے پھر رام پور گئے۔ ملازموں کے علاوہ دونوں لڑکے بھی ساتھ تھے۔ ۷ / اکتوبر ۱۸۶۵ء کو دئی سے روانہ ہوئے اور جیسا کہ ذیل کے خط بنام مرزا شہاب الدین احمد خاں ثاقب سے ظاہر ہوتا ہے، دوسرے دن لاہور پہنچے۔ یہ خط وہیں سے لکھا ہے، ۸ / اکتوبر ۱۸۶۵ء کو۔ خط حقیقت میں

اسراؤ حکیم کے نام ہے :

اچھی طرح ہو؟ غازی آباد کا محل شمشاد علی سے سنا ہوگا۔ نئے کے دن دو تین گھنٹی دن چڑھے احباب کو رخصت کر کے رہی ہوا۔ قصد یہ تھا کہ چلکھوے رہوں۔ وہاں قافلے کی گھنٹا کش نہ پائی۔ باپوڑ کو روانہ ہوں۔ دونوں پر خود ار گھوڑوں پر سوار پہلے چل دیے۔ چار گھنٹی دن رہے میں باپوڑ کی سرائے میں پہنچا۔ دونوں ہمایوں کو بیٹھے ہوئے اور گھوڑوں کو چلتے ہوئے پایا۔ گھنٹی بھر دن رہے قافلہ آیا۔ میں نے چھانک بھر کھی داغ کیا۔ دو شاہی کہاب اس میں ڈال دیے۔ رات ہو گئی۔ شراب پی لی کہاب کھائے۔ لڑکوں نے ارہر کی کچھڑی پکوائی۔ خوب کھی ڈال کر آپ بھی کھائی اور سب آدمیوں کو بھی کھائی۔ دن کے واسطے سادہ سالن پکویا۔ ترکاری نہ ڈالوائی۔ پارے آج تک دونوں ہمایوں میں موافقت ہے۔ آپس کے صلاح و مشورہ سے کام کرتے ہیں۔ اتنی بات زائد ہے کہ حسین علی منزل پر اتر کر پاؤں اور مضائی کے کھلونے خرید لاتا ہے۔ دونوں ہمایوں مل کر کھا لیتے ہیں۔ آج میں نے تمہارے والد کی صحت پر عمل کیا۔ چار بجے پانچ کے عمل میں، باپوڑ سے چل دیا۔ سورج نکلے باپوڑ گڑھ کی سرائے میں آ پہنچا۔ چار پائی بچھائی، ماس پر پچھوتا بچھا کر حقہ پی رہا ہوں اور یہ خط لکھ رہا ہوں۔ دونوں گھوڑے کو حل آگے، دونوں لڑکے رتھ میں سوار آتے ہیں۔ اب وہ آئے اور کھانا کھا لیا اور چلے۔ تم اپنی استانی کے پاس جا کر یہ رقمہ سراسر پڑھ کر سناؤ۔ شمشاد کو کتاب کے مقابلے اور تصحیح کی تاکید کر دیتا۔

۱۱/ اکتوبر ۱۸۶۵ء کو لکھتے ہیں :

بر خود ار حکیم غلام نجف خاں کو فقیر غالب علی شاہ کی دعا پہنچے۔ بدھ کا دن، سہ پہر بھر دن چڑھا ہو گا کہ میں فقط پانچ پر سوار آباد پہنچا۔ میں بجادی الاذیل کی اور گیارہ اکتوبر کی ہے۔ دونوں لڑکے دونوں گھڑیاں

اور رتھ اور آدمی سب پہنچے ہیں۔ اب آئے جاتے ہیں۔ رات پہ خیر گزرے، پہ شرط حیات کل رام پر پہنچ جائیں گے۔ گھر لایا ہوا ہوں۔ تیسرا دن ہے، پانچاں مگرے کو۔ لڑکے بخیر و عافیت ہیں۔ اپنی استانی سے کہہ دینا۔

۱۲/ اکتوبر کو غالب رام پر پہنچ گئے وہاں سے ۲۱/ اکتوبر کو ایک خط بھیجے ہیں جس میں رہنے، کھانے پینے کی مکمل تفصیل ہے۔ خانہ کی طرف سے ایسا خط دیوی کے لیے یقیناً اطمینان قلب کا باعث ہوتا ہے۔ ملاحظہ کیجئے:

اقبال نشان، عضد الدولہ حکیم غلام نجف خاں کو غالب علی شاہ کی دعا پہنچے۔ تمہارے خط سے معلوم ہوا کہ تم کو میرے کھانے پینے کی طرف سے تشویش ہے۔ خدا کی قسم میں یہاں خوش اور سحرست ہوں۔ دن کا کھانا ایسے وقت آتا ہے کہ چہرہ دن چڑھے تک میرے آدمی بھی روٹی کھا سکتے ہیں۔ شام کا کھانا بھی سویرے آتا ہے۔ کئی طرح کے سالن، پلاؤ، تنجین، پسندے، دونوں وقت روٹیاں فیبری، چپاٹیاں، مرہے، اجار۔ میں بھی خوش، لڑکے بھی خوش، کھواچھا ہو گیا ہے۔ سقا، ^{مستطبی}، خاکروب، سرکار سے جھین ہے۔ حمام اور دھوبی لوکر رکھ لیا ہے۔ آج تک دو ملاقاتیں ہوئی ہیں۔ تنظیم، تواضع، اخلاق کسی بات میں کمی نہیں۔

عظیم الدین خاں بہادر کو دعا پہنچے۔ یہ خط لے کر تم اپنی داوی صاحب کے پاس جاؤ اور یہ خط پڑھ کر سناؤ اور ان سے یہ کہہ دو کہ وہ بات جو میں نے تم سے کہی تھی وہ غلط ہے، اس کی کچھ اصل نہیں ہے۔ باقی خیر و عافیت۔

حکیم غلام نجف خاں جو غالب کی غیر حاضری میں برابر امر لا یتکلم کی ضرورت کا خیال رکھے ہوئے تھے، نے پے درپے دو خطوں میں دوسرے امور کے علاوہ امر لا یتکلم کی جاری کا حال بھی غالب کو لکھا۔ غالب ۱۲ نومبر ۱۸۶۵ء کے خط میں اس کا تفصیلی ذکر کرتے ہیں:

”حصارے دو غلط متواتر آئے۔ ظہیر الدین کا آگرے جانا میرا غلط اس کا موسم۔“ حصارے پاس پہنچنا اور اس کا آگرے کو روانہ ہونا۔ ظہیر الدین کی دوا کی کاہ عارضہ سرقد و سعال و بخور ہوتا۔ کدورتا تھ کا مجھ سے خفا ہوتا۔ مکان کو روکنے کی اجازت کا مانگنا۔ فضل حسن سے میرے واسطے درج ذیل عقد کرتا۔ یہ مدارج و مطالب معلوم ہوئے۔

ظہیر الدین کا غلط تم نے کیوں کھولا۔ وہ مغلوب الغضب ہے، تم پر خفا ہو گا۔ اس کی دوا کی اس موسم میں ہمیشہ ان امراض میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ ایک نسخہ اس کے پاس ماعا لضم کا ہے وہ کھجور اور ذرا خیر لیٹے رہو۔ کدورتا تھ لڑکا ہے وہ مجھ سے کیا خفا ہو گا؟ روپیہ جو خزانے میں جمع ہو گا آخر وہی لٹائے گا۔ خفا میں ہوں کہ روپیہ دام دام پایا اور میرا تمسک نہ دیا اور خفا تمھیں روپے آٹھ آنے کا نہ پائا۔ مکان کے روکنے کو اور کس طرح تمھیں؟ شہاب الدین خاں کو لکھا۔ شمشاد علی بیگ کو لکھا اب تم کو نکلتا ہوں۔ ستمبر کے پانچ روپے آٹھ آنے دے آیا ہوں۔ اکتوبر، نومبر و دسمبر یہ سول روپے آٹھ آنے آکر دوں گا بلکہ اگر موقع بنے گا تو یہ سہ ماہ یہاں سے یہ طریق ہنڈی بھیج دوں گا۔

اسلمیل خاں صاحب کو میری دعا کہو اور کہو کہ ذیل ذمہ کی سیر می بنو اور اور حوٹی کے پائے خانے کی صورت درست کرو اور۔ پائے قسمت! اس قسمت پر لعنت کہ میں فضل حسن میرے مربی و محسن نہیں اور پھر داسے محرومی کہ مطلب پر آری نہ ہو، خدا کرے نہ ہو۔ لوطیوں کا احسان زہر قاتل ہے۔ فضل اللہ خاں میرا بھائی ہے۔ اس کا احسان مجھ کو گوارا سو بار اس سے کہا اور ہزار بار کہوں گا۔ خیر جو ہوا سو ہوا اب آپ اس سے نہ ہار نہ کیسے گا۔ نہ لکھیے گا۔ اگر کچھ کہو تو فضل سے کہو تفضل سے کہو۔ والا لا۔

نواب صاحب دورے سے یا آج شام کو یا کل آجائیں گے، جشن

جیشیدی کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔

غالب ۲۸ ستمبر ۱۸۶۵ء کو رام پور سے واپس دلی کے لیے روانہ ہوئے اور ۸ جنوری ۱۸۶۶ء کو دلی پہنچے۔

باقر علی خاں کا قتل بڑا ہو کر بیس برس کی عمر (اواخر ۱۸۶۷ء) میں انور راج میں ملازم ہو گیا۔ اس کے نام کا بھی ایک خط چڑھ لکھے۔ جو غالب نے اوائل ۱۸۶۸ء میں اسے لکھا ہو گا۔ خط کے آخری دو جملوں سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اب گمراہی گمراہ بن گیا ہے، امر اور حکیم کے لیے بھی اور غالب کے لیے بھی۔ باقر علی خاں کی شادی ہو چکی ہے اور ان کے دو سال کی ایک بیٹی بھی ہے۔ چون کہ شادی (۱۸۶۳ء) کے بعد باقر علی خاں الگ مکان میں یا اپنے خسر نروہ رشتاں کے ساتھ رہنے لگا تھا اس لیے لکھتے ہیں کہ بیٹی ”کبھی روز، کبھی دوسرے تیسرے میرے پاس آ جاتی ہے۔“ حسین علی خاں ان کے ساتھ ہی رہتا ہے۔ دہوا اور دہوی دونوں کا دل خوب لگا ہوا ہے۔ خط ملاحظہ ہو۔ غالب کا انتقال اس خط کے سال بھر بعد ہوتا ہے اور امر اور حکیم کا دوسرا سال بعد:

اقبال نشاں مرزا باقر علی خاں کو غالب نیم جاں کی دعا پہنچے۔ تمہارا خط آیا۔ تمہارے روزگار کی درستی آگے سن چکا تھا، اب تمہارے لکھنے سے دیکھ بھی لی۔ دل میرا خوش ہوا اور تم خاطر جمع رہو جیسا کہ مہاراج نے تم سے کہا ہے، تمہاری ترقی انشاء اللہ تعالیٰ جلد ہو گی۔

مجھ سے جو تم گلہ کرتے ہو خط کے نہ بھیجنے کا۔ بھائی! اب میری انگلیاں ٹکلی ہو گئی ہیں اور بصلت میں بھی ضعف آ گیا ہے۔ دوسطری نہیں لکھ سکتا۔ اطراف و جواب کے خطوط آئے ہوئے دھرے رہتے ہیں۔ جب کوئی دوست آ جاتا ہے، میں اس سے جواب لکھوا دیتا ہوں۔ پڑھوں گا تمہارا خط آیا ہو اور ا تھا۔ اب اس وقت مرزا علی سف علی خاں آ گئے، میں نے ان سے یہ خط لکھوا دیا۔

تمہاری دہوی اچھی طرح ہے، تمہارا بھائی اچھی طرح ہے۔ تمہارے گھر میں سب طرح خیر و عافیت ہے۔ تمہاری لڑکی اچھی طرح ہے۔

بھی روز بھی دوسرے تیسرے میرے پاس آ جاتی ہے۔

غالب نے رام پور کے پہلے سفر میں جو ۱۶ جنوری سے ۱۷ جنوری ۱۸۶۰ء تک تقریباً

دو ماہ کا احاطہ کرتا ہے، امر لائیکم کو جو معلوم ہوتا ہے پڑھی لکھی نہ تھیں، کم از کم تین خط لکھے۔ یہ ہمارے مطالعے میں ہیں۔ غالب کا دوسرا سفر رام پور سے ۷ / اکتوبر ۱۸۶۵ء سے ۲۰

۲۸ دسمبر ۱۸۶۵ء تک تقریباً پونے تین ماہ پر محیط رہا۔ اس مدت میں جو خط انھوں نے امر لائیکم کو لکھے وہ کم از کم چار ہیں۔ ان کے علاوہ جو خط لکھے ہوں گے وہ ہماری دسترس میں نہیں۔ ایک وقاشعار بیوی اور فرض شناس خاوند کے مابین اس سے بہتر تعلقات کیا ہو سکتے ہیں۔

معلوم ہوتا ہے کہ امر لائیکم اور غالب میں ان بن کا سبب اختلاف مزاج تھا۔ جو ہمیشہ جھنجھلاہٹ کے سبب ہوا کرتا ہے۔ امر لائیکم کے والد تاجدار نواب الہی بخش خاں معروف کی زندگی (وفات ۱۸۴۶ء) میں، غالب ضرور عیش و عشرت اور غیر محتاط رہے۔ بعد ازاں انھوں نے کبھی ان فرائض کے نبھانے میں کوتاہی نہیں کی جو ایک شوہر پر واجب ہیں۔ ان کے ذہن میں طلاق، علاحدگی، دوسری شادی وغیرہ کا گزر ہی نہیں ہوا۔

حواشی

(۱) ۲۴ مارچ ۱۸۶۰ء کو دئی پینچے تھے۔

(۲) ۸ جنوری ۱۸۶۱ء کو دئی پینچے تھے۔

غالب اور امر او بیگم میں اُن بن کتنا جھوٹ کتنا ج

۱۔ چند بھنی شاہد

(الف) سردار الک سردار الدولہ نواب آغا مرزا بیگ خاں (ولادت ۱۸۳۸ء) غالب کے بھانجے مرزا ابو علی بیگ عرف مرزا مثل بیگ کے صاحبزادے تھے۔ وہ اپنے ”سوانح خود نوشت“ کا نامہ سردی میں لکھتے ہیں:

”الغرض خاندان لوہارو سے ہمارے دو رشتے ہوئے یعنی چھو بھی اپنی خاتم کا نکاح نواب علی بخش خاں (امر او بیگم کے بھائی) سے ہوا۔ گوزن و شوہر میں ہمیشہ اتفاق رہی اور وہ امر زانوشت (غالب) کا نکاح دختر نواب الہی بخش خاں (امر او بیگم) سے ہوا۔ بچپن میں جب میں اپنی والدہ مرحومہ کے ساتھ اُن (غالب، امر او بیگم) کے ہاں چلایا کرتا تھا تو دوای (امر او بیگم) مجھ کو ایک دوئی دیا کرتی تھیں۔ عجیب بات یہ ہے کہ ان دونوں میاں بی بی میں بھی ہمیشہ اُن بن رہی۔ یہی اس خاندان کی نہایت مہذب و شائستہ مگر کمال درجہ مغرور و تکبر تھیں۔“

(ب) نواب خضر مرزا لاخیر و فیادای بیگم مذکورہ غلام حسین خاں سردار و خزانہ علی بخش خاں معروف) سے بذریعہ حمید احمد خاں صاحبِ دل کی باتیں معلوم ہوئیں۔ خضر مرزا حسین علی خاں سے مر میں چھوٹے تھے۔ ان کا سال ولادت ۱۸۵۵ء کے لگ بھگ ہے اور حسین علی خاں کا

۱۸۵۰ء۔ حمید احمد خاں صاحب لکھتے ہیں:

”نواب خضر مرزا مرحوم (جنہوں نے لڑکپن میں غالب اور امر کو بیگم کو دیکھا تھا) اقم الحروف سے اس زمانے کی ایک حکایت ان الفاظ میں بیان کرتے تھے۔ میں ایک دن مرزا صاحب کے دیوان خانے میں کھڑا تھا کہ وہ اوپر سے اترے۔ مرے کھوے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ آجیری داوی کے گھر چلتا ہوں (داوی سے مراد امر کو بیگم تھیں) اندر جا کر بھتی ماما سے داوی کے متعلق پوچھا کہ کہاں ہیں۔ معلوم ہوا کہ نماز پڑھ رہی ہیں۔ کہنے لگے ہیں یہ کیا! جب آؤ نماز اارے خضر تیری داوی نے تو گھر کو فتح پوری کی مسجد بنالیا!“

”خضر مرزا کہتے تھے کہ مرزا صاحب کا انتقال دیوان خانے میں ہوا۔ داوی اس وقت زمان خانے میں تھیں۔ اسی عرصہ میں دارودہ کلو کو انہوں نے باہر کی خبر پوچھنے کے لیے کئی دفعہ بلایا۔ میں ایک دو دفعہ گیا، گر یہ ان پر طاری تھا۔ سفید دوپٹہ اوڑھے تخت پر بیٹھی رو رہی تھیں۔“

(بج) غالب کے دوست نواب ضیاء الدین احمد خاں خیر ور خشاں کی بیٹی اور مرزا زین العابدین خاں عارف کی بہو نواب معظم زمانی بیگم عرف بیگم کی شادی باقر علی خاں کاشل سے ۱۸۶۳ء میں ہوئی تھی۔ اس وقت بیگم کی عمر ۱۲ سال کی تھی۔ حمید احمد خاں صاحب نے جولائی ۱۹۳۸ء میں ان سے ملاقات کی تھی۔ ذیل میں حمید احمد خاں صاحب کے مضامین سے وہاں تقابسات درج کیے جاتے ہیں جو حمید احمد خاں صاحب اور بیگم کی زبان سے ہیں اور امر کو بیگم سے متعلق ہیں:

خود بیگم صاحبہ کی موجودگی میں میاں بندی کی لڑائی ہوتی تھی۔ امر کو بیگم خفا ہوتی تھیں مگر خاموش ہو جاتیں۔ ان سے کہتی تھیں: ”بیٹی تو تو بچہ ہے بڑے کی باتوں کا خیال نہ کیا کر، بڑھا تو دیونہ ہو گیا ہے۔“

اسی قسم کا ایک واقعہ بگ بیگم صاحبہ نے مجھے یوں بتایا کہ (مرزا صاحب) جبچھلے پہر ہو اخوری کو جایا کرتے تھے۔ ایک روز عصر کے بعد وہ واپس آئے ہیں اور میری ساس عصر کی نماز پڑھ رہی تھیں۔ دونوں بھی اسی تخت پر ٹکڑ پر ہو بیٹھے۔ جب ہم نے سلام پھیرا تو کہنے لگے: ”واو وا! خوب! بہو کو بھی اپنا سا کر لیا۔ کہہ ماری بونٹ کا کینڑا! پنے گھر لے جاتی ہے تو چالیس دن میں اسے اپنا سا کر کے نکال دیتی ہے!“

ایک اور لطیفہ بگ بیگم صاحبہ نے مجھے یوں بتایا کہ برسات کے دن تھے۔ چند بہت برسنے لگے۔ پوتوں (باقر علی خاں اور حسین علی خاں) نے کھانا کھلایا اور چلے گئے۔ نیاڑ علی (علازم) بھی چلا گیا۔ (مرزا صاحب) بیٹھے بیوی سے باتیں کرتے تھے۔ میں یوں بیٹھی تھی، گاڈ بیچے کے کونے سے لگی ہوئی۔ کہنے لگے: ”ایک بیوی، دو میں، تیسرا آنکھوں میں خٹکرا! بہو میں اور میری بیوی بیٹھے ہیں، تم کیوں بیٹھی ہو؟“ اس پر میری ساس بولیں: ”اے تو بہ! بڑا عا تو دیوانہ ہے۔ اسے تو ٹھننے کے لیے کوئی چاہیے۔ اب بہو ہی مل گئی۔“ میں اسے میں اٹھ کر ایک کونے میں جا چھپی۔ اب اٹھیں یہ فکر کہ برسات کے دن ہیں اور کینڑے پٹنگے کا موسم مجھے ڈھونڈتے پھر میں اور کہتے جائیں: ”مجھے کیا خبر تھی بہو اس بات کو اتنا برمانے گی!“

میرے بیاہ کے بعد کی بات ہے کہ چنے کی دال سالن میں پڑی ہوئی میرے سامنے بھی آئی۔ مجھے پسند نہیں تھی۔ مغلانی نے میری ساس سے شکایت کی کہ بہو نہیں کھاتیں چنے کی دال۔ مرزا صاحب یہ بات سن رہے تھے کہنے لگے: ”دوا، یہاں تو آ“، دوا گئیں تو ان سے کہا، ”ہیچے نہیں تھے میرے پاس“ بہو کی پسند کی چیز نکالی ہوئی۔ ”دوانے جواب دیا: ”نہیں، بہو چنے نہیں کھاتی ہیں۔“ بولے: ”کو ہو، خدا سے بھی بڑھ گئیں بہو؟ تو بہ! تو بہ!“ پھر میری ساس سے کہنے لگے: ”بیوی

سنو ”وہ بولیں: ”میں نہیں سختی اس پر مجھ سے کہا: ”بٹی برائے مانند۔ ایک بات سنا ہوں۔ خدا کے آگے چٹا گیا اور فرید کی کہ باری تعالیٰ یہ کیا بات ہے مجھ کو لوگ طرح طرح سے تنگ کرتے ہیں۔ بھونٹے ہیں، تلے ہیں، یا ابالتے ہیں، پیٹتے ہیں۔ آخر میرا کتنا کیا ہے؟ خدا نے چنے کی طرف دیکھا اور کہا، ”دور ہو۔ نہیں میں بھی تجھے کسا ہوں گا!“ ”جب میں بیاضی گئی تو وہ (امر لا یتکم) انچور کی پھانک تھیں۔ چاندرا پر بیٹھ کر کہا کرتیں: ”اے اللہ! تو کب بلائے گا۔“ ایک روز میں نے پوچھا: ”کچھسی جان، آپ کو قبر سے ڈر نہیں لگتا؟ کہنے لگیں: بٹی، تمہارا تل سر انکو دیکھتا ہے۔“

بقول ان کے مرزا صاحب مجھے میں آجے تو ان کی زبان سے اس قسم کے کلمات نکلتے تھے:

”میرا تو ناک میں دم کر دیا“ ”حضرت موسیٰ کی بہن!“ ”دوسری طرف یتیم غالب خفا ہوتی تھیں، مگر خاموش ہو جاتی تھیں۔“ ”اپنی بھینچی (مستحم رانی یتیم) سے کہتی تھیں: ”تو تو بچہ ہے۔ بڑے کی باتوں کا خیال نہ کر۔ بڑھا تو بچہ نہ ہو گیا ہے۔“

(و) مولانا حالی (ولادت ۱۸۴۳ء) پہلی مرتبہ ۱۸۵۳ء میں دہلی آئے اور غالب سے بھی ملاقات ہوئی۔ غالب کی مشہور زندہ سوانح عمری یادگار غالب (جس میں سوانح عمری کم اور غالب کی شعری اور ادبی حیثیت نمایاں کرنے کا مقصد زیادہ کار فرما ہے) ۱۸۹۷ء میں شائع ہوئی جو آج تک بہت مشہور ہے۔ حالی اس میں لکھتے ہیں:

حالی کی تعلقات

مرزا کی بی بی، جو الٹی بخش خاص معروف کی بیٹی تھیں، وہ نہایت متقی، پیریز کار اور روزے نگار کی سخت پابند تھیں۔ جس قدر مرزا مذہبی معاملات میں بے مبالغہ تھے، اسی قدر ان کی بی بی آنکھ نہ ابھی کی پابند

تھیں۔ یہاں تک کہ بی بی کے کھانے پینے کے باسن الگ اور شوہر کے الگ ہوتے تھے۔ ہاسبند بی بی شوہر کی خدمت گزاری اور خبر گیری میں کوئی ہدف نہ فرما کر گذشتہ نہ کرتی تھیں۔ مرزا صاحب ہمیشہ مردانہ مکان میں رہتے تھے۔ مگر ان کے کھانے پینے اور دوا اخذاتی اور جڑوں وغیرہ کا انتظام سب گھر میں سے ہوتا تھا۔ مرزا میں جب تک پلنے پھرنے کی طاقت رہی، ہمیشہ وقت مصیبت پر وہ ایک بار گھر میں ضرور جاتے تھے اور بی بی اور ان کے تمام رشتہ داروں کے ساتھ نہایت عمدہ برتاؤ رکھتے تھے اور اپنی جان سے بڑھ کر ان کی ضروریات اور اغراضات کا خیال رہتا تھا۔ مگر چونکہ شوخی اور عداوت ان کی کمہنی میں پڑی تھی، ان کی زبان و قلم سے بی بی کی نسبت ایسی باتیں نکل جاتی تھیں، جن کو عداوت آدمی نفرت یا بے تعلقی پر محمول کر سکتا ہے۔

لطیف: کسی نے اس وقت تک نام ایک شاگرد کی دوسری بی بی کے مرنے کا حال مرزا کو لکھا اور اس میں یہ بھی لکھا کہ اس کے ننھے ننھے بچے ہیں، اب اگر تیسری شادی نہ کرے تو کیا کرے اور بچوں کی کس طرح پرورش ہو؟ مرزا اس کے جواب میں لکھتے ہیں: ”اس وقت تک کے حال پر اس کے واسطے رحم اور اپنے واسطے رشک آتا ہے۔ اللہ اللہ ایک وہ ہیں کہ دودھ بار ان کی بیڑیاں کٹ چکی ہیں اور ایک ہم ہیں کہ ایک لڑکے بچا اس سے جو چھانسی کا چند انگلی میں پڑا ہے، تو نہ چند اسی خوشیاں ہے نہ وہ ہی نکلتا ہے۔ اس کو سمجھاؤ کہ بھائی! میرے بچوں کو میں پال لوں گا، تو کیوں بلا میں پھرتا ہے؟“ وہ ہمیشہ تعلقات خانگی کو ہدایت پر لانا ایک سخت مصیبت بتایا کرتے تھے۔

لطیف: جالے کے موسم میں ایک دن طوطے کا بیجرہ سامنے رکھا تھا۔ طوطا سردی کے سبب پروں میں تھک چھپائے بیٹھا تھا۔ مرزا نے دیکھ کر کہا: ”میں مفتوا نہ تمہارے جو رو نہ بچے، تم کس گھر میں یوں

سر جھکائے ہوئے بیٹھے ہو؟“

لطیفہ: ایک دفعہ مرزا مکان بدلنا چاہتے تھے۔ ایک مکان آپ خود دیکھ کر آئے، اس کا دیوان خانہ تو پسند آگیا، مگر مجلسِ اخوند دیکھ سکے۔ مگر پر آخر اس کے دیکھنے کے لیے بی بی کو بھیج دیا، وہ دیکھ کر آئیں، تو ان سے پسند ناپسند کا حال پوچھا۔ انھوں نے کہا: اس میں تو لوگ بلا تاتے ہیں۔

مرزا نے کہا: ”کیا دنیا میں آپ سے بھی بڑھ کر کوئی بلا ہے؟“

موت کی آرزو: مرزا یا تو اس وجہ سے کہ ان کی زندگی فی الواقع مصائب اور سختیوں میں گزری تھی اور یا اس لیے کہ ان پر عظیم حالتوں کا بہت زیادہ اثر ہوا تھا، آخر عمر میں موت کی بہت زیادہ آرزو کیا کرتے تھے۔ ہر سال اپنی وفات کی تاریخ نکالتے کہ اس سال ضرور مر جائوں گا۔

لطیفہ: ۱۷۷۷ء میں انھوں نے اپنے مرنے کی یہ تاریخ مکی کہ ”غالب مرد“ اس سے پہلے کئی ماڑے غلط ہو چکے تھے۔ فشی جو اہر سنگھ جوہر نقیض جو مرزا صاحب کے مخصوصین میں سے تھے، ان سے مرزا صاحب نے اس ماڑے کا ذکر کیا۔ انھوں نے کہا: ”حضرت! انشاء اللہ یہ مادہ بھی غلط ثابت ہو گا“ مرزا نے کہا: ”دیکھو، صاحبِ اتم ایسی قال منہ سے نہ نکالو، اگر یہ مادہ مطابق نہ نکلا، تو میں سر پھوڑ کر مر جائوں گا۔“

لطیفہ: ایک دفعہ شہر میں سخت دبا پڑی۔ میر مہدی حسین بروج نے دریافت کیا کہ حضرت ادباً شہر سے دفع ہوئی یا ابھی تک موجود ہے؟ اس کے جواب میں لکھتے ہیں: ”بھئی، کیسی دہاء؟ جب ایک ستر برس کے بڑھے اور ستر برس کی بڑھیا کو نہ مار سکے، تو آف بریں دہا۔“ اسی قسم کی بہت سی باتیں اور حکایتیں ان سے منقول ہیں، جن سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہ آخر عمر میں مرنے کے کس قدر آرزو مند تھے۔

۲۔ کلام غالب سے شہادت

ذیل میں وہ اشعار دیے جاتے ہیں جو حالی اور حمید احمد خاں کی رائے میں غالب اور امر و حکیم میں ان کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ میں نے ان سب کا تاریخی تعین بھی کر دیا ہے۔
(الف) اردو

I

آرزوے خانہ آبادی نے وہاں ترکیا
کیا کروں، مگر سایہ دیوار سیلابی کرے

(ب) فارسی

II

پہ کاشی لہجے از کاشانہ یاد آر	دریں جنت ازاں ویرانہ یاد آر
دریغہ در وطن و اماندہ چند	پہ خون دیدہ زہر قی رائدہ چند
ہوس را پاسے در دامن شکستہ	پہ اُمید تو چشم از خویش بستہ
پہ شہر از بے کسی صحرا نصیبی	پہ روستے آتش دل مہاگزینی
مگر کاں قوم را و ہر آفریدہ	ز سہاب بر آتش آرمیدہ
ہر در خاک و خون انگندہ تو	پہ تخم بے کیسہا بندہ تو
چو شمع از داغ دل آذر فطانتاں	پہ بزم عرض دعوتی بے زبانتاں
سرود سرمایہ غارت کردہ تو	ز تو تالاں دے در پردہ تو

III

اے آنکد براہ کعبہ روئے داری	وانم کہ گزیدہ آرزوئے داری
زیگنوتہ کہ تندی خراہی و انم	در خانہ زن ستیزہ خوئے داری

IV

پہ آدم زن بہ شیطان طوق لعنت	پہ رعد از وہ نکریم و تملیل
ولیکن در اسیری طوق آدم	مگراں تر آمد از طوق عزائیل

گیر کہ در روز شش چوں تو خلقی ہر روز تو نہند تیرہ نہیں
 ایک باشد در اہل مطہر صحبت در طلب جان و جاہد شکش از دن
 ایک باشد در اہل حق صوہبت شور تھا خائے ہار و اے مہاجن

☆ ☆ ☆

سب لوہے کیے ہوئے اندر اجات (چند مٹی گولہ اور کلام بطور گولہ کا جائزہ لیا جاتا ہے۔
 ایک بات جو مٹی گولہ میں مشترک ہے وہ یہ ہے کہ حالی کے سوائے ۱۸۳۸ء سے پہلے ان
 میں سے کسی کا وجود ہی نہ تھا اور حالی بھی ۱۸۵۳ء سے پہلے کبھی غالب سے نہیں ملے تھے۔
 آغا خان ایک (ولادت ۱۸۳۸ء) کو بھی ہوش میں آنے کے لیے کم از کم پانچ سال کا ہونا
 ضروری ہے۔ اس طرح ان کے لیے بھی غالب اور امر و بیگم کی باتیں سننے اور یاد رکھنے کا زمانہ
 ۱۸۵۳/۵۳ء سے پہلے کا نہیں ہو سکتا۔ ظاہر ہے کہ یہ تمام آنگھوں کو یکے واقعات غالب کی
 ۵۶/۵۶ء سال اور امر و بیگم کی ۵۵/۵۵ء سال کی عمر کے یا اس کے بعد ہی کے ہو سکتے ہیں۔

آغا خان ایک کہتے ہیں کہ "ان دونوں میاں بی بی میں بھی ہمیشہ ان بن رہی۔ بی بی اس
 خانہ ان کی نہایت مہذب و شائستہ مگر کمال درجہ کی مغرور و شکور ہونا تھا اور جب بچہ بیگم،
 امر و بیگم کی زبانی بتاتی ہیں کہ وہ (غالب کو مخاطب ہو کر) کہتی تھیں "بڑھے کی باتوں کا خیال
 نہ کیا کر، بڑھا تو دیوانہ ہو گیا ہے۔" تو امر و بیگم کا "مہذب و شائستہ" ہونا بھی مشکوک ہو جاتا
 ہے۔

خضر زادا کو غالب کا (امرو بیگم کو خطاب کر کے) کہنا (یا ایک قصہ بچہ بیگم نے بھی
 بیان کیا ہے) "یہ کیا جب آؤ نہادارے خضر اتیری دہلی نے تو گھر کو فتح چوری کی مسجد بنادیا
 ہے۔" ایک خط بھی ہے مگر اختلاف حراج کو بھی ظاہر کرتا ہے کیوں کہ مذہب کے لیے
 غالب کا رویہ عام طور پر معطوم ہے۔ خضر زادا کا دوسرا بیان کہ مرزا کے انتقال پر امر و بیگم
 نے باہر کی خبر پوچھنے کے لیے درود نہ کھڑا کو کئی دفعہ بلایا اور کہ انھوں نے دیکھا کہ امر و بیگم پر
 مگر یہ۔۔۔ طاری تھا۔ سفید روئے فوڑے تخت پر بیٹھی رو رہی تھیں۔" ظاہر کرتا ہے کہ اس
 بحالہ میں بھی امر و بیگم کو غالب سے کتنی محبت تھی اور اس موت کا انھیں کتنا غم تھا۔ جیسا

یہ بات کسی شدید ان بن کی روایت کی لٹی کرتی ہے۔

بیگم، امر و بیگم اور غالب ایک ہی جگہ بیٹھے تھے۔ غالب کو مذاق سوجھا "ایک بیوی، دو میں، تیسرا آنکھوں میں ٹھیکرا۔۔۔۔۔" امر و بیگم بولیں "اے تو! بڑھا تو دیوانہ ہے۔ اسے تو غصے کے لیے کوئی چاہیے۔ اب بہو ہی مل گئی" اب اگر غالب کی یہ بات ٹھکرا ہے تو امر و بیگم کے فخرے کو "بڑھے" کی باتوں کا خیال نہ کیا کر۔ بڑھا (غالب) تو دیوانہ ہو گیا ہے "تہذیب اور شائستگی کی کسوٹی پر کیوں کسا جائے۔ اسے بھی تو ٹھکرا ہی کہا جائے گا اور چنے والی کہانی کے لیے جب امر و بیگم سے کہا کہ "سنو اوہ بولیں میں نہیں سنتی" سے بھی کسی ان بن کی طرف خیال نہیں کیا جاسکتا۔ حقیقت میں بیگم نے اس کا فیصلہ خود ہی کر دیا ہے۔ اور ان کے آخری بیان کو دوبارہ دیکھیے۔ فرماتی ہیں:

"میاں بیوی کی لڑائی ہوتی تھی۔۔۔ مرزا صاحب غصے میں آتے تو ان

کی زبان سے اس قسم کے کلمات نکلتے تھے:

'میرا تو ناک میں دم کر دیا'

'محضرت سوئی کی بہن'

دوسری طرف بیگم غالب غصا ہوتی تھیں مگر خاموش ہو جاتی

تھیں۔۔۔ کہتی تھیں "تو بچہ ہے۔ بڑھے کی باتوں کا خیال نہ کر۔ بڑھا

تو دیوانہ ہو گیا ہے۔"

میاں بیوی میں ایسی باتیں کس گھر میں نہیں ہوتیں؟ ایک جگہ بیگم فرماتی ہیں:

"(امر و بیگم) جاننا پر بیٹھ کر کہا کرتیں، اے اللہ! تو کب بلائے گا،

ایک روز میں نے پوچھا کبھی جان، آپ کو قبر سے ڈر نہیں لگتا؟ کہنے

لگیں، جی تو کتا بیل سرا کو دیکھتا ہے۔"

یہ بات بھی کسی خانگی نزاع کا ثبوت نہیں ہو سکتی کیوں کہ حالی نے لکھا ہے کہ آخر عمر

میں غالب بھی موت کی آرزو کیا کرتے تھے۔ اس پر یہ لطیفہ دیکھیے جو کچھ اور ہی کہانی کہہ رہا

ہے۔ حالی لکھتے ہیں:

"ایک دلہہ شہر میں سخت دہاڑی۔ میر مہدی بھروسہ نے دریافت کیا

کہ حضرت ادباً شعر سے دفع ہوئی یا ابھی تک موجود ہے؟ اس کے جواب میں (غالب) لکھتے ہیں ”بھئی کبھی دہا؟ جب ایک ستر برس کے بڑھے اور ستر برس کی بڑھیاں کوند مار سکے، تو قف بر ایں دہا.....“

یہ باتیں حیرانہ سالی کی جھنجھلاہٹ کو ظاہر کرتی ہیں، کسی خانگی نزاع کی دلیل نہیں بن سکتیں۔ غالب اگر گھر سے عاجز آئے ہوئے ہوتے تو یا تو ستر برس کے بڑھے (یعنی اپنی موت) کی دعا مانگتے یا پھر ستر برس کی بڑھیا (یعنی امراؤ نیگم) کی، مگر وہ تو دونوں کو بڑھا پے کے عذاب سے چھٹکارا دلانا چاہتے ہیں۔ یہ نزاع کی فہمیں بلکہ دونوں کے قطعاً خاطر کی دلیل ہے۔

جو دانشور، نقاد اور محقق یہ مان کر چلتے ہیں کہ غالب اور امراؤ نیگم میں سخت خانگی نزاع تھا وہ سچائی کے طرف دار نہیں ہیں بلکہ ان کا پورا زور اس بات پر صرف ہوا ہے کہ کسی نہ کسی طرح ان کے موقف کی تصدیق ہو جائے کہ غالب کے گھر میں ہر وقت خانہ جنگی کا بازار گرم رہتا تھا لیکن یہ بات حقیقت سے کوسوں دور ہے۔ جو ناکامیاں امراؤ نیگم نے اپنی ازدواجی زندگی کے پہلے ۳۲/۳۰ میں دیکھی ہیں، ان سے کسی بھی بیوی کا حراج چاہے وہ کتنی بھی وقار کیوں نہ ہو، چڑچڑا ہو سکتا ہے۔ خاص کر ایسے حالات میں جب کہ خانہ گد اپنی مالی سی کا بد اواد شاعری میں دھمکتے ہو سکتا ہو اور بیوی (اس سے قطع نظر کہ وہ فطرتاً سنجید مزاج ہو) کہیں بھی اپنا دل کھول کر نہ رکھ سکتی ہو۔ اوپر دیے ہوئے اشعار سے جاتی اور حمید احمد خاں نے خانگی نزاع ہی کا اثر قائم کرنے کی کوشش کی ہے۔ جاتی نے دے لفظوں میں اور حمید احمد خاں نے کھل کر حقیقت حال ابھی آپ کے سامنے آئی جاتی ہے۔

۱ آرزوئے خانہ آبادی ..

اس اردو شعر کے معنی صرف یہ ہیں کہ میں نے گھر کو آباد تر کرنے کی آرزو کی اور وہ دیراں تر ہوتا گیا۔ دیوار تو گھر بنانے کے لیے تعمیر کی جاتی ہے مگر جب دیوار کے سائے سے ہی سیلاب بھوٹ چڑے تو پھر میں کیا کروں۔

یہ غزل غالب نے ۱۸۱۶ء (بہ عمر ۱۹ سال) یا اس سے پہلے بھی تھی۔ اس کے چھ شعر ہیں، یہ غزل کا دوسرا شعر ہے۔ عموماً اقصائی اشارے منقطع ہی میں کیے جاتے ہیں۔ اس غزل کا

مقطع بھی وقت کی صحیح ترجمانی کر رہا ہے۔ دیکھیے۔

بادشاہی کا جہاں یہ حال ہو، غالب، تو پھر
کیوں نہ دلی میں ہر اک ناچیز نوبلی کرے

II یہ کاشی لکھے از۔۔۔

یہ ۸ شعر مشہور چراغ دہ کے ہیں، جو ستر کلکتہ کے دوران میں بنارس پہنچنے کے بعد ۱۸۴۷ء میں کہی تھی۔ اس وقت انھیں گھر سے نکلے سال بھر سے اوپر ہو چکا تھا۔ امر ڈو بیگم کے والد نواب الہی بخش معروف کا انتقال ہو چکا تھا۔ چنانچہ یہ ۸ اشعار جو حمید احمد خاں صاحب نے پیش کیے ہیں حقیقت میں تعداد میں دس ہونے چاہیے تھے۔ مگر چوں کہ ایسا کرنے سے ان کا موقف کمزور ہو جاتا تھا اس لیے انھوں نے پہلا اور دوسواں شعر چھوڑ دیا۔ ان دو اشعار کے بغیر مطلب یہ نکلتا ہے کہ میں وطن سے دور اپنے اہل و عیال کی تکلیفوں کے احساس سے مضطرب ہوں اور میں جانتا ہوں کہ تمھارے دکھوں کا لامہ دار میں خود ہوں اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تو (امر ڈو بیگم) مجھ سے تالاں ہے مگر تو میرا بھرم رکھتی ہے۔ لیکن اگر ان ۸ اشعار سے پہلے کا اور آخری یعنی دسواں شعر جوڑ دیا جائے تو مطلب یہ ہو گا۔ پہلا شعر۔

ازیں دعوایے یہ آتش شوقی لب را

بخواں غنایے ذوق طلب را

مصرع ثانی صاف بتا رہا ہے کہ امر ڈو بیگم کی طرف سے خط آیا ہے گویا کہہ رہا ہے کہ بہت زمانہ بیت گیا ہے گھر آجائیے۔ غم نامہ اس لیے کہا ہے کیوں کہ امر ڈو بیگم کے والد کا انتقال ابھی کچھ ہی عرصہ پہلے ہوا ہے۔ شاعر کہتا ہے اے غالب ”گھر سے آئے ہوئے بلاوے کے دکھ بھرے خط کو پڑھ اور کاشی میں رہتے ہوئے دور دلی میں اپنے گھر کو یاد کر۔۔۔“ تجھ سے وہ (امر ڈو بیگم) تالاں سہی مگر وہ ہمیشہ تیرا بھرم رکھتی ہے۔ اس سے تھاقول برتا چھا نہیں اس کا دل افسوس زدہ ہو اور تو پھولوں کی تمنا کرے یہ تاروا ہے“ آخر دو جملے دسویں شعر کا ترجمہ ہیں۔

از آنانت تھاقول خوشنایست

بدارخ شاں ہواے قفل روانیست

ان اشعار میں ہر دو جانب سے محبت و شفقت کے سوائے کسی اور مفہوم کا شاید نیک نہیں۔

III اسے آنکھ پر لو کھپ۔۔۔۔۔

یہ رباعی ۱۸۴۵ء اور ۱۸۴۵ء کی درمیانی مدت میں کہی گئی تھی۔ ۱۸۴۵ء کے تک بھگت غالب نے فارسی گوئی یا قاعدگی سے شروع کی تھی اور ۱۸۴۵ء میں مجموعہ کلام فارسی شائع ہوا تھا جس میں یہ رباعی شامل ہے۔

اس رباعی کا سید حساسہ مفہوم یہ ہے کہ تو جو اتنی تیز رفتاری سے کعبہ کی رملہ پر گامزن ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ تیری بیوی سخت جھگڑالو ہے اور تو خانہ داری سے بیزار ہے۔ کیا معترضین یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ایسے اشعار ہی خفص کہہ سکتا ہے جو عملی طور پر اس رملہ سے گزرا ہو؟

IV بہ آدم زن بہ شیطان۔۔۔۔۔

یہ قطعہ ۱۸۴۵ء اور ۱۸۶۳ء کے درمیان تخلیق ہوا۔ اس کا حال بھی عینہ وہی ہے جو اوپر III کے تحت بیان ہوا ہے۔

V گیر کہ در روزِ حشر۔۔۔۔۔

یہ تین شعر کا قطعہ ۱۸۶۳ء اور ۱۸۶۷ء کے مابین کہا گیا اسی لیے سبب بخش میں شامل ہے جب قلمی کا عنوان ”در بارِ دوام طلباں“ ہو اور قطعہ ”شورِ ققازے چرواہے مہاجن“ پر ختم ہو تو اسے غالب کے خانگی نزاع کا شاہد کیوں کر سمجھا جاسکتا ہے۔

غالب کے تقریباً آٹھ ہزار اردو مصرعوں میں سے ایک اور تقریباً اٹھائیس ہزار فارسی مصرعوں میں سے چار مصرعے تلاش کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتا کہ غالب اور امروٹیم تمام عمر شدید حسد کے خانگی جھگڑوں میں مبتلا رہا ہے ایک اہمقانہ ورزش ہے۔ میاں بیوی میں لڑائی رہتی تھی مگر کس گھر میں نہیں رہتی؟

استدراک

فروری ۱۸۸۵ء میں ڈاکٹر سید معین الرحمن کی تصنیف ”غالب کا علمی سرمایہ“ چھپی

ہے۔ اس میں جناب نبیل الدین حالی کی تحریر کا ایک اقتباس (حرفے چند ص ۱۵۱۵) یہ ہے۔ اسے بغیر کسی تبصرے کے شائع کیا جاتا ہے البتہ یہ کہنا ضروری ہے کہ اس طویل تحریر سے اس بات پر کوئی روشنی نہیں پڑتی کہ غالب اور ان کی اہلیہ سرو بیگم میں کسی قسم کی لگن بن رہا کرتی تھی:

”تدانس نسبت بہ فقر ہے نہ افسوس مگر راقم کا تعلق خانوادہ لوہارو سے ہے۔ اس خاندان سے غالب کی سہیلی اور علمی عیالہ نسبت معروف ہے۔ ۱۹۳۲ء میں عمر تقریباً ستروہ برس تھی۔ (سیکڑا نیر ختم کر رہا تھا) گرمیوں کی تعطیلات گزارنے شملہ چلا تھا۔ کچھ رقم کی ضرورت پڑی۔ دو لینے نواب صاحب لوہارو (نواب امین الدین صاحب خاں حالی) کے پاس گیا۔ چند روز وہاں گزارے۔ بچپن سے غالب، غالب سنا تھا، خاندان کے حوالے سے بھی۔ اب ایک دن لوہارو کے کتب خانے میں بیٹھا کہ کچھ نظر آئے۔ دوسرے لوہارو اور مسودت وغیرہ کا ذکر غیر ضروری ہے۔ راقم نے غالب کے کوئی ایک سو بیس سال ایک سو سے زیادہ خطوط قاری اور اردو دو چھوٹی چھوٹی پوریوں میں بند پائے۔ پوریوں ماٹ کی نہ تھیں، سونے سفید کپڑے کی تھیں۔ قیلے کچھ لچھے۔ دو جینے ایک طرف محفوظ سی رکھی تھیں۔ کتب خانہ بہت چھوٹا تھا اس کی صفائی ہو رہی تھی۔ میں سب خط پڑھ نہ سکا۔ قاری تو اس وقت ہانگل سمجھ میں نہ آئی، اردو بھی پوری طرح نہ پڑھی گئی کہ اس وقت دور سم الخط پڑھنے کی علامت نہ ہوئی تھی یہاں اکثر مطالب صاف سمجھ لیے غزلیں شاید تھی ہی نہیں۔ کہیں کہیں کوئی شعر قاری اور اردو کا ضرور آ جاتا تھا۔

اردو کے بیشتر خط غالب کی اہلیہ سرو بیگم کے چچا زاد بھائی اور ولی لوہارو میرے پردوا نواب امین الدین خاں کے نام تھے اور ان میں سے تقریباً سب ہی کافی مختصر تھے۔ ان میں اکثر خطوط جوئے والے معاملے سے متعلق تھے۔ مقدمہ لڑنے کے لیے مالی امداد طلب کی گئی تھی۔ جیل کے خطوط بھی تھے۔ جیل کے بعد سخت برہمی کا اظہار بھی تھا ایک دو میں صاف صاف یہ تھا کہ تم نے میری خبر خود آنکر نہ لی، لوگوں کو بھیجا، معلوم ہوتا ہے یہاں سے یہ لکھا جاتا تھا کہ تم نے خاندان کو بدنام کیا وہ غیر وہ غیر۔ کیوں کہ ایک میں واضح طور پر یہ تھا کہ اگر تم بھی اس مقدمے کی کارروائی کو سچ سمجھتے ہو اور میری سزا کو حق جانتے ہو اور خاندان کے

لیے میری رشتہ داری کو بدنامی کا باعث تو اپنی بہن کو بلاوا۔ معلوم ہوتا ہے یہاں سے کھسکا گیا کہ اچھا انھیں بھیج دو۔ ایک فرستادہ کا بھی ذکر تھا۔ غالب کا خط کہتا تھا کہ تمہارے آدمی خط لے کر آئے، تمہاری بہن جانے سے انکاری ہیں۔

قاری کے کئی خطوط علاء الدین خاں علائی میرے دارا کے نام بھی تھے اور کسی اور بزرگ (غیر خاندانی) کے نام جو اس وقت لوہارو میں رہتے تھے۔ علائی کے نام اکثر خط تعلیمی لگتے تھے۔ مگر ان میں کچھ بڑے بڑے خاندانی ضرور تھا۔ اردو کے کئی خطوط میں محض طلب ذریعہ صرف طلب ذرا اور عذر گاہ گاہ پر سرزنش، راپور کی تعریف، مرزا آفتاب اور شیفتہ کی حالیہ اور سابقہ خدمتوں بطور خاص ”فتوح“ کی تعریف، کچھ احباب کی شکایت بس مجھ پر ہے۔

میں نے لوہا نواب صاحب مرحوم کی توجہ اس طرف دلائی۔ انھیں استفسار نہ تھا۔ اس وقت وہ ایک نوجوان دہلی ریاست تھے۔ ریاست بہت چھوٹی سی (آج کے تناظر میں حالات سمجھنا مشکل بھی ہے) مگر تھے تو دہلی ریاست۔ صاحب تصنیف ہو چکے تھے (ایک ناول) شعر بھی رسایا شوق گاہ گاہ کے طور پر کہہ لیتے تھے۔ (بعد میں آزادی کے بعد بہت لکھا) مگر اس وقت ان کا مزاج ادب دوست تو کسی حد تک تھا، اتنا غالب پرست نہ تھا، نہ وہ اتنے روشن خیال تھے۔ انھوں نے سرسری طور پر فرمایا، جی ہاں مجھے علم ہے کہ ان خطوط میں کیا ہے ان کی اشاعت ہمارے خاندانی وقار کے خلاف ہے۔ پچھلے زمانے میں بھی جو خطوط آپ کے (میرے) والد اور دلوانے دے دیے دیکھ بھال کر دینے چاہیے تھے۔ مرزا مرحوم سے ہمارے قبیلے کی ایک خاتون کیا بیانی، ان کی تمام فضولیات میں ہمارا خاندان ضرور ملوث ہوتا ہے آپ رہنے دیجئے میں سوچوں گا۔ (نواب امین الدین خاں اڈل اور ان کے چھوٹے بھائی نواب سیام الدین خاں نیرور عثمان کی اولاد کے مابین آدمی کی تقسیم پر تنازعہ رہ چکا تھا۔ اس کے آوازے باہمی شادی بیاد کے باوجود اس زمانے تک گشت کرتے تھے۔ نواب سیام الدین خاں کی صاحبزادی کہہ نیکن کو غالب اپنی منہ بولی بہو بنا کر لائے تھے۔)

پتہ کہ میں بھی نہ تو کوئی حیثیت رکھتا تھا، نہ اس وقت اس موضوع کا اتنا دلچسپ تھا۔ بعد میں ہمارے تعلقات میرے نظریات اور رویوں کی وجہ سے کسی حد تک ناخوش گوار ہو گئے۔ میرے خیالات بھی بدلتے رہے۔ میں نے ان سے مزید گھٹکوں کی نہ ضرورت سمجھی نہ جرأت

کی۔ پھر ریاست (۱۹۳۷ء میں) ختم ہو گئی۔ وہ بے پور چلے گئے بھاگ کر جانا پڑا۔ قلعے پر کئی حملے ہو چکے تھے۔ ریاست میں اس وقت (۱۹۳۷ء میں) کوئی مسلمان نہ رہا تھا۔ سب بے سرو سامان بھاگ گئے تھے۔

۱۹۵۷ء میں (پہلی بار) ہندوستان گیا اور ان سے ملنے اور اجیر شریف کی زیارت کرنے سے پور پہنچا تو ان کا مزاج بھی بدل چکا تھا اور میں بھی بڑا ہوا ہو گیا تھا۔ ان خطوط کی یاد دلائی۔ فرمایا سارا کتب خانہ راہپور کتب خانہ میں چلا گیا ہے وہاں زیادہ محفوظ رہے گا۔ لوہارو کوئی آتا ہے نہ جاتا ہے۔ قلعہ بند، محلات چلاؤ کتب خانہ تھامی کیا، جاہ بھی ہو اور قلعہ وغیرہ حکومت ہند کی تحویل میں آ گیا۔ وہ اسے تحصیل کے دفتر کے طور پر استعمال کرتی ہے۔ اب آپ ان خطوط کو یاد دلا رہے ہیں تو میں خود راہپور لکھ کر دیکھوں گا، کیا بنا گیا ہوا۔ اس وقت تک ان کی صاحبزادی نور بانو نواب رضا علی خاں مرحوم والی راہپور کے چھوٹے صاحبزادے نواب زادہ ذوالفقار علی خاں ممبر پارلیمنٹ کو پہلا جنگی تھیں۔ راہپور سے تعلق کھرا ہو گیا تھا۔

پھر ان سے اس موضوع پر گفتگو تو کیا، کوئی خاص خط کتابت بھی نہ ہوئی۔ میں ۱۹۸۲ء تک ہندوستان بھی نہ گیا۔ اس دور ان میں ہندوستانی فضلاء آتے تھے اور ملاقات ہو جاتی تھی تو میں ذکر کرتا تھا۔ مخدومی عرشی صاحب سے خام طور پر کہا۔ یہ کوئی بیس برس کی بات ہے۔ انھوں نے واپس جا کر مجھے خط لکھا (وہ محفوظ نہیں) کہ انھیں کچھ نہیں ملا۔

۱۹۸۲ء میں مخدومی مالک دام صاحب سے کہا۔ انھوں نے بڑی دلچسپی لی فرمایا کہ اب میں جستجو کروں گا۔ خود نواب صاحب کو یاد دلایا۔ وہ اس وقت پنجاب (ہند) کے گورنر تھے۔ انھیں یاد ہی نہیں رہا تھا۔ فرمایا آپ خود راہپور چلے جائیے اور تلاش کیجئے۔ لیکن یہ گفتگو انھوں نے سرسری کی، گو دلچسپی بہت دکھائی۔ اب وہ اس بات کے قائل ہو چکے تھے کہ غالب کے وہ خطوط بھی اب کا ایک عجیب و غریب سرمایہ ہوں گے اور خاندانی وقار وغیرہ کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ پھر میں نے عرشی زادہ صاحب کو لکھا۔ اُن کا جواب بھی وہی آیا کہ وہ دستیاب نہیں۔ میں راہپور بھی گیا نہیں۔ اب جانتا بھی تو کیا مل جاتا۔ اب تو وہ کتب خانہ زیرِ تنقیح بھی بند ہے۔

گویا وہ خط ضائع ہو گئے، ضائع نہ ہو گئے ہوتے تو اب تک کسی نہ کسی کو مل جاتے لیکن یہ

بات ریکارڈ ہے کہ غالب کے وہ خط راقم الحروف نے دیکھے ہیں۔ کیوں ضائع ہوئے، کب ضائع ہوئے، اب یہ بحث لاحاصل ہے۔

اپنے چچا سے سنتا تھا کہ غالب کے سب سے زیادہ عاشق میرے دوا اعطاء الدین خاں علائی تھے جو ان کے درس و سخن کے شاگرد بھی رہے۔ ان کے بعد میرے والد نواب امیر الدین فرخ سرزاد لیکن ان کے زمانے میں یہ مملوٹ کیوں عام اشاعت کے لیے نہ گئے۔ اس کی وجہ بھی وہی خاندانی وقار ہو گا جو ان کے پوتے (اور میرے چچے) نواب امین الدین خاں علانی آخری دہائی نوہارہ کو مملوٹ تھا) واللہ اعلم بالصواب۔ اس ضمن میں اس وقار کی نسبت سے ایک اور واقعہ بھی ریکارڈ کروں کہ بہر حال یہ تمام اشاعت غالب سے متعلق ہے۔

غالب شناس جانتے ہیں کہ غالب نے اپنی سالی کے بیٹے زین العابدین خاں عارف کے دولہ کے پالے تھے۔ ان میں سے ایک باقر علی خاں کامل تھے۔ ان کی شادی نواب ضیاء الدین خاں نیرور خٹاں کی صاحبزادی معظم زلمانی عرف گجگم سے ہوئی (مملوٹ غالب میں ان کا ذکر آتا ہے اور ان کی بڑی صاحبزادی چند و گجگم کا بھی، جنہیں غالب مرزا جیون بیک کے خطاب سے یاد کرتے ہیں۔ یہ نیرور خٹاں کے پوتے نواب شہار الدین خاں تاباں برادر بزرگ نواب سراج الدین خاں ساکن سے چاہیں (گجگم کے نواسے، ان کی چھوٹی صاحبزادی کے بیٹے، فخر الدین علی احمد مرحوم ایک وقت میں صدر ہندوستان ہوئے) آزادوی سے پہلے ان گجگم سے پروفیسر حمید احمد خاں مرحوم نے ایک تفصیلی انٹرویو لے کر شائع کیا تھا۔ دور شتے میں میرے والد کی چوٹ بھی ہوتی تھیں۔

ہم عید بقرعید پر ان کے سلام کو جاتے تھے۔ بالکل پھونس ہو گئی تھیں۔ میری شادی کے بعد غالباً ۱۹۳۵ء میں وفات پائی۔ بصارت تقریباً جا بھکی تھی، سماعت جاری تھی، ایک بار میں نے ان سے خوب کھوکھو مرزا غالب کی شراب نوشی پر پوچھا (وہ ان کے آخری زمانے میں بہت چھوٹی عمر میں پیادہ کر آئی تھیں) بہت برا فروخت ہوئیں۔ فرمایا کم بخت میرے سر کو شرابی کہتا ہے۔ شراب سے کیا تعلق ان کا۔۔۔ میں نے جوئے اور قتل کا ذکر کیا تو اور بھی زجر و توبیخ کی۔ یقیناً یہ واقعہ ان کی پیدائش سے بہت پہلے کا تھا اور مرد بزرگوں نے ممکن ہے انہیں نہ بتایا ہو لیکن یہ تو ناممکن ہے کہ دولوی امر گجگم نے جو نہایت وفادار بیوی ہونے

کے باوجود اپنے ہی خاندان کی ایک فرد، اپنی بہو کے سامنے (جو آخرش اسی خاندان سے تھیں) کبھی مرزا صاحب کے یہ واقعات بیان نہ کیے ہوں۔

بہر حال میں نے ایک بار سے زیادہ یہ بات چیمیزی (اس وقت ”ہیرنگ ایڈز“ تھیں مگر ہم ان کے کانوں پر ایک نگلی یا کتلی الٹی رکھ کر بات ان تک خوب پہنچا دیتے تھے) انھوں نے کبھی اس امر کی تصدیق نہ کی بلکہ الٹا ڈانٹا۔ یہ باتیں اس وقت کی ہیں جب میں انیس برس کا ہو چکا تھا، سب خوب یاد ہے۔

اس ماحول اور ان اقدار میں اگر وہ خطوط، نواب صاحب لوہار دمر حوم نے خود نہیں تو کسی اور خاندانی نے ضائع کر دیے ہوں تو کچھ عجب نہیں۔“

حواشی

(۱) ”دیوان غالب کامل تاریخی ترتیب سے“ مطبوعہ ۱۹۸۸ء، ص ۱۹۶۔

غالب کے سفر کلکتہ کی توقیت

۱۸۴۵ء (تقریباً جون):

سفر کلکتہ (آٹھ نومبر ۱۸۴۵ء) سے پہلے آخری بار نواب احمد بخش خاں سے ملنے (سلسلہ بخش) فیروز پور گئے۔ نواب صاحب نے کہا تہہ رے پور حمل کرو کیوں کہ جنرل اختر لوئی سے ان کے تعلقات خوش گوار نہیں۔ اس پر غالب ہاکام دہلی واپس آ گئے۔ لارڈ ایمرسٹ، گورنر جنرل نے جنرل اختر لوئی کا ریاست بھرت پور میں غل و پنا پسند نہیں کیا۔ اس پر اختر لوئی نے استعفیٰ دے دیا۔ سر چارلس مٹکاف کی تہذیبی۔

۱۸۴۵ء (۱۵ جولائی):

اختر لوئی (آکڑ لوئی) ریڈیٹ دہلی کا ضلعی پور پھاری کی وجہ سے انتقال۔

۱۸۴۵ء (۲۶ اگست):

سر چارلس مٹکاف نے دہلی کے ریڈیٹ، سول کمشنر اور گورنر جنرل کے ایکٹ برائے راجپوتانہ کا عہدہ سنبھالا۔

۱۸۴۵ء (۲۱ اکتوبر):

مٹکاف کلکتہ سے دہلی پہنچے (قیاس ہے کہ انھیں لپام میں نواب احمد بخش خاں بھی پیشوائی کے لیے دہلی آ گئے ہوں گے) اس سے پہلے ۱۸ ستمبر کو لارڈ ایمرسٹ کی طرف سے مٹکاف کو ہدایت ہو چکی تھی کہ وہ جس طرح چاہیں بھرت پور کا قرضہ لیں۔

حکاف کا بھرت پور پر چڑھائی کی تیاری کا اعلان
غالب کی نواب احمد بخش خاں کی معیت میں،
سرچارلس حکاف اور ان کی فوجوں کے ساتھ دہلی
سے بھرت پور کی طرف روانہ ہوئے (اسے سفر نکلتے کا
آغاز کہنا چاہیے کیوں کہ اب جو دہلی سے نکلے تو
غالب سفر نکلتے قسم کر کے ۲۹ نومبر ۱۸۲۵ء ہی کو دہلی
واپس آئے)
مقررہ ایجنڈے۔

قلعہ بھرت پور کا محاصرہ (یہ لڑائی لارڈ بکر میر کی
کمانڈ میں لڑی گئی تھی۔ بکر میر کو ۱ اکتوبر ۱۸۲۵ء کو
ہندوستان میں انگریزی فوجوں کا کمانڈر انچیف مقرر
کیا گیا تھا۔ (ولادت ۱۷۷۳ء)

انگریزی فوجوں کی فتح۔
حکاف کی بھرت پور سے دہلی کی طرف واپسی۔
موسم گرما شروع ہو گیا تھا۔ دہلی سے راجپوتانہ کے
دورے پر روانہ ہوئے۔

گورنر جنرل (لارڈ ایمرسٹ) کی نکلنے سے شمالی ہند
کے دورے پر روانہ ہوئے۔

قیاس ہے کہ انھیں دونوں فیروز پور میں غالب کو
گورنر جنرل کے دور کی اطلاع ملی ہوگی۔

غالب فیروز پور ہی میں رہے (ملاحظہ کیجئے رائے
منجمل کے نام کا خط محرمہ تقریباً اگست ۱۸۲۶ء)
غالب کی فرخ آباد کے راستے کان پور کو روانہ ہوئی۔

کان پور پہنچے اور وہاں پہنچتے ہی سخت بیمار ہو گئے اور
گورنر جنرل کے کان پور پہنچنے سے پہلے ہی لکھنؤ منتقل
ہو جانے پر مجبور ہو گئے۔

۱۸۲۵ء (۲۵/ نومبر)

۱۸۲۵ء (۲۸/ نومبر)

۱۸۲۵ء (۶/ دسمبر)

۱۸۲۵ء (۱۰/ دسمبر)

۱۸۲۵ء (۱۸/ دسمبر)

۱۸۲۶ء (نواکرا پریل)

۱۸۲۶ء (۳/ اگست)

۱۸۲۶ء (نواکرا اگست)

۱۸۲۶ء (نواکرا ستمبر)

۱۸۲۶ء (نواکرا اکتوبر)

۱۸۲۶ء (نواکرا نومبر)

۱۸۲۶ء (۱۸/ نومبر)

لارڈ ڈائریسٹ (گورنر جنرل) کانگان پور میں درود۔۔۔۔۔
 بادشاہ اودھ (غازی الدین حیدر) کی گورنر جنرل کے
 حضور میں ہارپائی۔ غالب اس وقت بیماری کی حالت
 میں لکھنؤ میں مقیم تھے۔ دوسرے دن انگریز حکام نے
 شاہ اودھ سے جوابی ملاقات کی۔

۱۸۲۶ء (۲۰/ نومبر)

انگریزی پارٹی لکھنؤ پہنچی اور سال کے آخر میں واپس
 انگریزی ملائے میں آگئی
 آگرے میں گورنر جنرل کا درود۔

۱۸۲۶ء (یکم دسمبر)

۱۸۲۷ء (۸/ جنوری)

غالب لکھنؤ سے کان پور کو روانہ ہوئے (گویا لکھنؤ
 میں کم و بیش آٹھ ماہ مقیم رہے اگرچہ ابھی تک یہ
 معلوم نہیں ہو سکا کہ لکھنؤ میں انھوں نے یہ مدت
 کیوں کر گزاری)۔

۱۸۲۷ء (۲۲/ جون)

کان پور واپسی۔

۱۸۲۷ء (۲۵/ جون)

کان پور سے باندہ کے لیے روانہ۔ قیاس ہے کہ
 جوائی کے پہلے بھٹے میں باندہ پہنچے ہوں گے۔ باندہ
 کے سفر کا مقصد کلکتہ کے سفر کے لیے زور دہ فراہم
 کرنا تھا۔ باندہ آکر پتار پڑ گئے تقریباً ساڑھے چار ماہ
 باندہ ہی میں رہے۔

۱۸۲۷ء (۲۸/ جون)

کلکتہ کے لیے روانہ ہوئے

۱۸۲۷ء (تقریباً ۱۳/ نومبر)

مودہا پہنچے۔ ۱۸/ نومبر تک آرام کیا۔ ۱۹/ نومبر کو
 وہاں سے روانہ ہو کر رات ایک گاؤں میں بسر کی۔

۱۸۲۷ء (۱۵/ نومبر)

چلے تارا پہنچے۔ اسی روز "لڑھیا" تل گاڑی چھوڑ کر
 کرائے کی کشتی میں الہ آباد کے لیے روانہ ہو گئے۔

۱۸۲۷ء (۲۰/ نومبر)

الہ آباد پہنچے۔ یہ شہر غالب کے لیے انتہائی وحشت
خیز ثابت ہوا اس لیے علی الصبح کشتی ہی کے ذریعے
بنارس کا سفر اختیار کیا۔

۱۸۴۷ء (۲۷ نومبر)

بنارس پہنچے۔ یہ شہر انھیں بہت پسند آیا (خیر بہو روی
مرحوم نے فروغ اردو غالب نمبر مطبوعہ ۱۹۶۹ء میں
بنارس میں مرزا غلام احمد و غیرہ کو غالب کا میزبان
قرار دیا ہے مگر یہ زاجعل ہے۔ نامہ ہائے غالب و
غلامی سرشہ تترندی میں خود غالب نے ایک خط میں
لکھا ہے کہ بنارس میں وہ پہلے سرالے نیرنگ آباد
(نورنگ آباد) میں چارپانچ روز مقیم رہے تھے۔ پھر
اسی سرالے کے عقب میں مٹھالی اور میاں رمضان کی
حوٹلی میں کرائے پر رہنے لگے تھے۔ اسی حوٹلی سے ملی
ہوئی کو سی خانہاں کی حوٹلی تھی۔)

۱۸۴۷ء (یکم دسمبر)

بنارس سے کلکتہ کے لیے روانگی کشتی کی سواری مہنگی
ہونے کی وجہ سے مسافت خشکی کے راستے کھوڑے
کی سواری سے طے کرنی پڑی۔

۱۸۴۷ء (۲۹ دسمبر)

نواب احمد بخش خاں کا انتقال اکتوبر ۱۸۴۷ء میں ہوا
تھا۔ یہ خیر غالب کو سفر کلکتہ کے دوران میں
مرشد آباد میں ملی تھی۔ قیاس ہے کہ غالب
جنوری ۱۸۴۸ء میں مرشد آباد پہنچے ہوں گے۔

۱۸۴۸ء (جنوری)

کلکتہ پہنچے (غالب نے سہ شنبہ چہارم شعبان
۱۲۴۳ھ) لکھا ہے۔ سہ شنبہ ۲ شعبان کو پڑتا ہے جو
مطابق ہے ۱۹ / فروری کے اور ۳ شعبان پنج شنبہ تھا جو
مطابق ہے ۲ / فروری کے)

۱۸۴۸ء (۱۹ یا ۲۱ فروری)

- ہنگی کے نواب علی اکبر خاں سے ملے گئے۔
 انٹائی میں سراج الدین علی خاں مرحوم (باندہ کے
 مولوی محمد علی خاں کے بھائی اور سابق قاضی القضاہ
 کلکتہ) کی بیگم کے ہاں گئے۔
- گورنر جنرل کے پرنسپل سکریٹری مسٹر انڈریو
 سٹرنگ اور گورنمنٹ کے پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ کے
 سکریٹری مسٹر سامنٹ فریزر سے ملاقات ہوئی۔
 عرضداشت داخل کی۔
- ایک خط میں لکھتے ہیں کہ چھوٹے بھائی مرزا یوسف
 کے ہاتھ کا ۱۳/ اپریل کا لکھا ہوا خط ملا۔ معلوم ہوا کہ
 اس کی طبیعت پہلے سے بہت اچھی ہے اور اب وہ
 "زن و دختر دادر" کو "نساء و دختر دادر" سمجھنے لگے
 ہیں۔ گویا غالب اور مرزا یوسف کی ماں بھی ان دونوں
 آگے سے دہلی آئی ہوئی تھیں اور مرزا یوسف کے
 یہاں رہ رہی تھیں۔
- کلکتہ میں ایک مشاعرے میں شمولیت۔
 پھر مشاعرے میں شمولیت مرزا حسین علی وکیل
 رئیس ہرات کی اشعار غالب کی ستائش مگر حامیان
 قتل کی اشعار غالب پر کلکتہ بھینی۔
- ایک اور مشاعرے میں شمولیت اور اپنے مسٹر حسین
 کے اعتراضات کا جواب۔
- سپریم کونسل کی ہدایت کہ ریڈیو ڈنٹ دہلی کے توسط
 سے عرضی دیں۔ باندہ کے مولوی محمد علی خاں کو لکھا
 کہ وہ ایک ہزار روپیہ قرض لے کر کلکتہ بھجوانے کا
 بندوبست کریں۔
- ۱۸۲۸ء (۲۲/ فروری)
 ۱۸۲۸ء (۶/ اپریل)
 ۱۸۲۸ء (۲۸/ اپریل)
 ۱۸۲۸ء (۳۰/ اپریل)
 ۱۸۲۸ء (یکم جون)
 ۱۸۲۸ء (۸/ جون)
 ۱۸۲۸ء (۱۵/ جون)
 ۱۸۲۸ء (۲۰/ جون)

۱۸۲۸ء (۱۵ / جنوری)

۱۸۲۸ء (۹ / اکتوبر)

۱۸۲۸ء (۲۶ / اکتوبر)

۱۸۲۸ء (۲۵ / دسمبر)

۱۸۲۹ء (۱۰ / فروری)

۱۸۲۹ء (۱۶ / فروری)

۱۸۲۹ء (۱۰ / مارچ)

۱۸۲۹ء (مئی)

۱۸۲۹ء (جون)

۱۸۲۹ء (یکم گشت)

اصنام پر مختار نامہ تیار کر کے دہلی گورنمنٹ کیا۔

مولوی محمد علی خاں (ہاتھ) سے مبلغ دو صد روپے کی
بھٹی موصول ہوئی۔

دہلی سے کلکتہ تک کے سفر میں ایک گھوڑا، ایک
سائیکس، ایک چمکنا، تین ذاتی خدمت گار اور ایک
کھار، غالب کے ساتھ تھے۔ انہوں نے اخراجات
کے پیش نظر ۱۳۶ اکتوبر سے پہلے گھوڑا بیڑہ سو روپے
میں فروخت کر دیا اور سائیکس اور چمکے کو بھٹی دے
دی۔ واپسی کا سفر کشتی سے طے کیا۔

کرسمس کے موقع پر مسٹر فریزر سے ملاقات۔

دہلی ریڈیلے فسی میں عرضی داخل کی۔

گورنر جنرل کے دربار میں شمولیت۔ نوپ علی اکبر
خاں کے ساتھ دسویں نشست۔

پھر مولوی محمد علی خاں (ہاتھ) سے ہزار روپے کا
قرض مہیا کرنے کی درخواست کی۔

مولوی محمد علی خاں کی طرف سے - / ۳۰۰ روپے کی
شاہ جوگ بھٹی موصول ہوئی

آگرہ سے - / ۳۵۰ روپے کی بھٹی ملی۔ ظاہر ہے
والدہ غالب نے کبھی ہوگی۔ شاید مرزا یوسف کے
ٹھیک ہونے پر والدہ غالب و یوسف واپس آگرہ چلی
گئی ہوں گی۔

پھر گورنر جنرل کے دربار میں حاضری۔ معلوم ہوا کہ
گورنر جنرل ہندوستان کے دورے پر نکلیں گے، سو
غالب نے بھی دہلی پلٹ آنے کی ٹھانی۔

- ۱۸۲۹ء (۱۵/ اگست) کلکتہ سے ایک خط مورخہ ۱۳/ اگست ۱۸۲۹ء میں
 غالب نے لکھا ہے کہ وہ کل ۱۵/ اگست کو بہر حال
 کلکتہ سے روانہ ہو جائیں گے۔
- ۱۸۲۹ء (۳۰/ اکتوبر) بانڈہ واپس پہنچے (۱۵/ اگست کا سفر ملٹوی ہو گیا۔ وسط
 اکتوبر تک کلکتہ سے روانہ ہوئے ہوں گے۔)
- ۱۸۲۹ء (۷/ نومبر) بانڈہ سے دہلی کے لیے روانہ ہوئے۔
- ۱۸۲۹ء (۲۹/ نومبر) دہلی واپس پہنچے۔

عارف اور فرزندِ غالب؟

غلام حسین خاں سردار (پ: ۸۷/۸۷ء) (و: ۱۸۵۳ء اکتوبر)

محمد اسد اللہ بیگ خاں غالب (پ: ۱۷۹۷ء ۲۷ دسمبر) (و: ۱۸۶۹ء ۱۵ فروری)

زمین العابدین خاں عارف (پ: ۱۸۱۷ء) (و: ۱۸۵۴ء اپریل)

ا۔ غالب، میاں داد خاں سیاح کو ۲۵/ اگست ۱۸۶۷ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں:

”تمہارے ہاں لڑکے کا پیدا ہونا اور اس کا سر جانا معلوم ہو کر مجھ کو بڑا

غم ہوا۔ بھائی اس داغ کی حقیقت مجھ سے پوچھو کہ ۷۳ برس کی

عمر میں سات بچے پیدا ہوئے، لڑکے بھی اور لڑکیاں بھی اور کسی کی

عمر چند رو مہینے سے زیادہ نہیں ہوئی.....“

امرو بیگم غالب سے دو سال چھوٹی تھیں۔ اس لحاظ سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان ساتوں

بچوں کی ولادت اور وفات ۵۰/ ۱۸۳۹ء سے پہلے ہو چکی تھی۔

ذکر غالب کے پانچویں ایڈیشن کے ص ۱۳۶ پر درج ہے۔

ص..... جب مرزا غالب کا اپنا کوئی بچہ زندہ نہ رہا تو انھوں نے زمین العابدین

خاں (عارف) کو حقیقی کر لیا۔ مگر افسوس کہ انھیں عارف کی

جوانمردی کا داغ اٹھانا پڑا۔ اس جوان صالح کا..... میں عالم شباب میں

تکسیر سے بہ کثرت خون ضائع ہو جانے اور اسپتال کے مرض سے

اپریل ۱۸۵۴ء (جمادی الثانی ۱۲۶۸ھ) تک نہیں انتقال ہوا۔ انتقال کے

وقت ” عمر صرف ۳۶ برس کی تھی۔“

خسر و مرزا لکھتے ہیں:

”بس ان (غالب) کا رجحان محبت، بوجہ لاولدی، اولاد بنیادی نیکم (دختر الٰہی بخش خاں معروف، زوجہ غلام حسین خاں مسرور) سے ایسا والہانہ ہوا کہ انھوں نے زمین العابدین خاں عارف کو اپنا بیٹا بنالیا۔“

”..... زمین العابدین عارف..... کو مرزا غالب نے مستثنیٰ بنالیا اور ان کی اولاد کو اپنے گھر کا فرد سمجھا۔“

غالب کے عارف کو مستثنیٰ بنالینے کی بات اوروں نے بھی کہی ہے مگر ان میں سے کوئی ایسا نہیں جس نے غالب یا عارف کو دیکھا ہو اور جو ان کے ہم عصر ہیں وہ اس بات کا قطعاً ذکر نہیں کرتے۔ چنانچہ مولوی کریم الدین گلدستہ بھٹائی میں عارف کے ترحے میں لکھتے ہیں:

”عارف مخلص نواب زمین العابدین خاں بہادر، بیٹے نواب غلام حسین خاں بہادر، حلف الرشید چناب نواب فیض اللہ بیگ سہراب بیگ کے، اور خواہر زاوہ امور شاگرد نواب اسد اللہ خاں غالب معروف پہ مرزا نوشہ کے۔۔۔ اصلاح شاہ نصیر سے لیتے تھے لیکن بعد ایک مدت کے جب کہ نواب اسد اللہ خاں بہادر وارد شہر ہذا ہوئے نسبت کلمہ بھی ان سے حاصل کی اور طرز طرح آؤل کو طرح دی۔ ان روزوں میں اس عاجز (کریم الدین مولف تذکرہ) کے مکان پر محفل مشاعرہ جو منعقد ہوتی ہے۔ یہی صاحب (عارف) میر مشاعرہ ہیں۔۔۔ دیکھ ان۔۔۔ معرض طبع میں آیا چاہتا ہے۔۔۔“

انھیں مولوی کریم الدین نے تین سال بعد ایک اور تذکرہ تالیف کیا جس کا نام طبقات شعراے ہند رکھا۔ یہ تذکرہ ۱۸۴۷ء میں مکمل ہوا اور ۱۸۴۸ء میں چھپا۔ اس کے صفحات

۱۵۳۹ء پر عارف کا ترجمہ درج ہے۔ لکھتے ہیں:

۵۔ ”عارف تخلص، نام زین العابدین خاں خواہر زادہ^۹ نواب اسد اللہ خاں

مرزا نوشہ غالب کے۔ ... جن ایام میں کہ میرے چھاپہ خانہ میں
مشاعرہ ہوا کرتا تھا، یہی شاعر میر مجلس اور میر مشاعرہ مقرر تھا۔۔۔
اب ان ایام میں بسبب حدت ذہن اور تیزی فکر سخن کے سوکھ کر مثل
کانٹے کے ہو گیا ہے، بہت دلا پتلا سا قد ہے۔ واڑھی بھر کر نہیں نکلی۔
ٹھوڑی ہی پر کچھ بال ہیں۔۔۔ اس سال میں کہ ۱۲۶۳ھ میں، عمر اس کی
قریب تیس برس کے ہے۔“

اسی تذکرے کے ص ۳۱۹ پر عارف کے والد غلام حسین خاں مسرور کا ترجمہ بھی ہے۔
ملاحظہ کیجئے:

۶۔ مسرور۔ نواب غلام حسین خاں بہادر مسرور، والد نواب زین العابدین
عارف کے۔ میری ان کی ملاقات ایک دفعہ اس طور پر ہوئی تھی کہ
نواب زین العابدین عارف یعنی ان کے بیٹے، جو میرے بہت دوست
اور مہربان ہیں، ان کی بیماری کی خبر کو ان کے گھر گیا تھا۔ اس جاسے میں
نے ان کو دیکھا، قریب ساٹھ برس ان کی عمر ۱۲۶۱ھ میں تھی۔۔۔ جن
ایام میں میرے مکان پر مشاعرہ ہوتا شروع ہوا، انھوں نے بھی ایک
دفعہ ایک غزل اپنے خلف الصدق عارف مذکور کے ہم دست روانہ کی
تھی۔۔۔۔۔“

مرزا قادر بخش صاحب تذکرہ گلستان سخن میں جو انھوں نے ۱۸۵۵ء میں تالیف کیا تھا، لکھتے

ہیں:

۷۔ ”عارف تخلص، نواب زین الدین خاں مرحوم، خلف رشید نواب
غلام حسین خاں مسرور مسرور تخلص، شاگرد مرزا اسد اللہ خاں
غالب۔۔۔۔۔ سن بارہ سو ستر سنہ ہجری میں رخصت سفر ہاندا کہ گلشن
جہاں کی طرف راہی ہوا۔۔۔۔۔“

جائی، یادگار غالب میں ”اولاد“ کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں :

۸۔ ”مرزا صاحب کے اولاد کچھ نہ تھی۔ ابتدا میں سات بیٹے پے درپے ہوئے، مگر کوئی زندہ نہیں رہا۔ اس لیے ایک مدت سے وہ اور ان کی بی بی تھانہ کی بسر کرتے تھے مگر ندر کے چند سال پہلے جب ان کی بی بی کے بھانجے زین العابدین خان عارف کا انتقال ہو گیا۔۔۔ تو مرزا اور ان کی بی بی نے چھوٹے لڑکے حسین علی خاں کو جو اس وقت بہت کم عمر تھا، اپنے سایہ عاطفت میں لے لیا۔۔۔ جب زین العابدین خاں کی والدہ کا انتقال ہو گیا تو حسین علی خاں کے بڑے بھائی باقر علی خاں کو بھی مرزا نے اپنی سرپرستی میں لے لیا۔۔۔“

اب اس سے پہلے کہ غالب کے مختلف غلطوں کے ذریعے یاد دہرے شوہر دولہا نکل سے جائزہ لیا جائے کہ غالب اور عارف کے تعلقات حقیقت میں کیا تھے۔ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ غالب کی ان تین تحریریں کا ذکر کر دیا جائے جن سے ظاہر اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ عارف واقعی غالب کے مستحق تھے۔

پہلی۔ غالب کے ”امرئہ عارف کا ایک شعر دیکھیے :

۹۔ ”تم باہ شب چار دہم تھے میرے گھر کے

بھر کیوں نہ رہا گھر کا وہ نقشا کوئی دن اور“

دوسری۔ عارف کے انتقال سے تقریباً دو مہینے بعد ۱۸ جون ۱۸۵۲ء کو لکھتے ہیں :-

۱۰۔ ”سنو صاحب، یہ تو تم جانتے ہو کہ زین العابدین خاں مرحوم میرا فرزند

تھا اور اب اس کے دونوں بیٹے کہ وہ میرے پوتے ہیں، میرے پاس

آ رہے ہیں اور دم بدم مجھ کو سناتے ہیں۔“

۱۱۔ تیسری۔ غالب کا وہ قطعہ جو غالب کے کلیات نظم فارسی کے ص ۳۰ پر

درج ہے۔

یہ مجموعہ کلام پہلی بار ۱۸۳۵ء میں شائع ہوا تھا۔ ظاہر ہے کہ عارف کے متعلق غالب کی

تحریر ہو دی گئی دونوں تحریروں سے پہلے کی ہے۔ ۱۵/ اشعد کے اس قتلے سے چہرا ہم شعر
نکش کیے جاتے ہیں:

”اں پسندیدہ خوے عارف نام کہ زخشن شمع دو دہان مست
☆☆☆

آنگہ در بزم قرب و خلوت انس غم گسار و مزاجدان مست
☆☆☆

جولا فداے نام علی ست چوں بنامشہ چشیں کہ جان مست
☆☆☆

لے کہ میراث خواہ من پاشی اندر اردو کہ اں زبان مست
☆☆☆

۲

غالب کے کلام پر نظم و نثر میں پہلے پہل عارف کا ذکر ان کے ایک قاری خط بام آرزوہ
میں آیا ہے۔ یہ خط شیخ آہنگ کے خطوط محررہ ۱۸۳۵ء میں شامل ہے۔ لہذا یہ جب کا ذکر ہوا
جب عارف کی عمر ابھی ۱۸ سال سے بھی کم تھی۔ ۳ اس کا مفہوم یہ ہے:

۱۲۔ آپ نے مفتی مرزا سدید کے لیے جو چارہ سازی کی اس پر شک
آیا۔ اقبال نکلیں مرزا بنیٰ علیا بنیٰ خاں کی سازش کا جو جواب مجھ تک
پہنچا ہے، اس نے زخموں پر نمک پاشی کی۔ اب جیسے جیسے مگرمی
مرزا داخل بیگ کا کام کر دیں۔

شیخ آہنگ میں ایک خط ۳ مورخہ ۱۲۳ ہج (۱۸۴۳ء) بام شیفہ شامل ہے۔ عارف کی

عمر اس وقت ۲۵ سال کے قریب ہو گی۔ مفہوم حسب ذیل ہے:

۱۳۔ جس کی رات کو برسم سخن آراستہ ہوئی مگر چوں کہ میں نے غزل نہیں کہی
تھی اس لیے اس میں شامل ہونے سے گریز کر رہا تھا کہ خیال اللہ بنیٰ خاں

۱۶۔ ”بھائی غلام حسین خاں مرحوم کے متبع ہو کر زمین العابدین و حیدر حسن اور ان کی اولاد کو بھی منہ نہ دیکھا۔۔۔۔۔“

۳

نہجۃ الہادیہ میں درج ہے۔

۱۷۔ ”عارف۔ نواب زمین العابدین خاں۔ نواب غلام حسین خاں۔ سردار مرحوم کے خلف الصدق۔ نواب ضیاء الدین احمد خاں خیر و خشاں کے بھانجے، مرزا غالب کے شاگرد و شید اور سسرال کے رشتہ سے ان کے بھی بھانجے تھے۔۔۔۔۔“

عارف ۱۲۳۳ھ میں پیدا ہوئے۔ ۳۵ سال تک دنیا کی ہوا کھائی۔ ۱۲۶۸ھ میں عالم قدسی کو سد عارے۔ حالت نزاع میں جب حضرت غالب عیادت کو تشریف لائے تو بستر پر پڑے پڑے یہ شعر پڑھا۔
آنکھوں میں دم ہے مثل چراغ سحر ہوں میں
لو لگ رہی ہے جان کو کیا انتظار ہے
مولوی کریم الدین ۱۸ لکھتے ہیں:

۱۸۔ ”نواب ضیاء الدین خاں بہادر سے کمال اور جلال اور محبت اس (عارف) کو رہتی ہے۔۔۔۔۔“

کلیات عارف میں عارف کا ایک ۷۱ شعر کا قطع ہے جو غالب سے مخاطب ہو کر کہا گیا ہے۔ لکھا ہے۔

۱۹۔

قلبہ ”جان و دل ترا فدوی
اسد اللہ نام ہے تیرا
درد نام بزرگ کا تیرے
تجھ کو کہوے برا یہ طاقت ہے؟
اس بزرگی کی کچھ نہایت ہے
اس میں کچھ شک نہیں عبادت ہے

تجھ سے روکش ہو کس کی طاقت ہے؟
 مجھ پہ جب یہ تری حمایت ہے
 کچھ نہ پروا ہے کچھ نہ حاجت ہے
 گرچہ میری خلاف عادت ہے
 ان کی جس وجہ یہ شرارت ہے
 جو بدل کا قتلہ لامت ہے
 ہدف ہو کب سلامت ہے
 آہاں کی انھیں نہایت ہے
 دل میں ان کے زہیں قسوت ہے
 ایک آفت ہے اک قیامت ہے
 بس کہ عزت اسے نہایت ہے
 یہ ہمیشہ سے اس کی عادت ہے
 زوف ہے، گر یہی شجاعت ہے
 قول میں ان کے کب صداقت ہے؟

حق نے سب پر کیا تجھے غالب
 مجھ کو زیبا ہے جتنا ہار کروں
 نظر مستحقِ فلک کی مجھے
 مرض کرتا ہوں شکوہ، شکوہ
 وہ سبب میں بیان کرتا ہوں
 فیضِ صحبت سے تیری حمرا غلام
 سستی اس ذمہءِ خواہج میں
 خیر و نحو ہیں سرے دشمن
 بات ان کی لگے ہے پھر سی
 ان کی کیا کیا صفت کروں تحریر
 ایک جلا ہے رکھ سے دائم
 دوسرا جو کینہ جبرئی ہے
 زور کرتے ہیں ناقواں پر
 ہیں وہ سارے جہاں کے جھوٹے

☆☆☆

۳

۱ و ۸ سے ظاہر ہے کہ غالب کے ساتھ اولاد ہوئی، لڑکے بھی لڑکیاں بھی۔
 غالب یہ بھی بتاتے ہیں کہ ”۷۳ برس کی عمر میں“ ہوئیں۔ جس سے صرف یہ مراد ہے کہ
 آج (۲۹ / اگست ۱۸۶۷ء) تک (یا دوسرے لفظوں میں جب تک اس کو بیگم بچہ پیدا کرنے
 کے اہل رہیں، یعنی تقریباً پچاس برس یا ۱۸۳۹ء تک) ان کی سات اولادیں ہوئیں۔ اس بیان
 سے حالی کے قول کی نفی ہو جاتی ہے کہ غالب کے ابتدائیں سات بچے درپے درپے ہوئے۔“
 بالقرض یہ بچے درپے درپے بھی پیدا ہوئے ہوں اور ابتدا ہی میں پیدا ہوئے ہیں تو بھی ایسے

حالات میں غالب کو مستغنیٰ کرنے کا خیال پچاس سال کی عمر سے پہلے نہیں ہو سکتا کیوں کہ نبویؐ یا کچھ نہیں اور اس کی پچیدہ کرنے کی عمر ابھی باقی ہے۔ غالب ۱۸۵۳ء میں پچاس سال کے اور ۱۸۵۴ء میں پچپن سال کے ہوئے اور اسی سال اپریل ۱۸۵۴ء میں ۳۵ سال کی عمر میں عارف کا انتقال ہو۔ لہذا غالب کا عارف کو باقاعدہ گوہر لینا ایک مفروضے کے سوائے کچھ بھی نہیں۔ اس کے علاوہ:

۱۔ ۶۰ میں مولوی کریم الدین لکھتے ہیں کہ عارف یعنی ان (سرور) کے بیٹے جو میرے بہت دوست اور مہربان ہیں، ان کی بیماری کی خبر کو ان کے گھر گیا تھا، اس جاے میں نے ان (سرور والد عارف) کو دیکھا، قریب ساٹھ برس ان کی عمر ۳۶ھ میں تھی..... میرے مکان پر مشاعرے (میں) انھوں نے بھی ایک دفعہ ایک غزل اپنے حلق الصدوق عارف نے گور کے ہر دست روایت کی تھی۔

۲۔ ۱۰۱ میں ہے کہ حالت نزاع میں، جب حضرت غالب، (عارف کی) عیادت کو کشریف لائے تو بہتر پر پڑے پڑے (عارف نے) یہ شعر پڑھا۔

آنکھوں میں دم ہے مثل چراغ سحر ہوں میں
لو لگ رہی ہے جان کو کیا انتقاد ہے

ان ہر دو بیانات سے ظاہر ہے کہ عارف جو سرور کے حلق الصدوق تھے کبھی غالب کے ساتھ ان کے ساتھ ان کے گھر میں نہیں رہے۔ وہ مرتے دم تک اپنے گھر یا اپنے باپ کے ساتھ رہے۔ اگر وہ غالب کی فرزند بی میں ہوتے تو غالب کے ساتھ غالب کے گھر میں رہتے۔

۳۔ ۱۰۱ میں غالب کا فقرہ کہ "زین العابدین حال مرحوم میرا فرزند تھا" محض اس کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ غالب، عارف کو بے حد عزیز رکھتے تھے اور مثل فرزند کے سمجھتے تھے۔ ورنہ عارف سے اپنا حقیقی رشتہ انھوں نے فقرہ ہی کے نام ایک اور خط میں بیان کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

۲۔ '۱۵' مجھ کو اس شخص (عبدالرحمن) سے شس برابر علاقہ عزیز داری کا نہیں۔ اگر وہ حسن اخلاق اگر عزیز لکھ دیا تو کیا ہو تا ہے۔ زمین العابدین خان عارف میری سالی کا بیٹا۔ یہ شخص (عبدالرحمن) اس کی سالی کا بیٹا۔ اس کو جو چاہو سمجھ لو۔"

۵

نواب النبی بخش خاں معروف کی دو صاحبزادیاں تھیں۔ بنیادی بیگم^{۱۹} اور امیرہ بیگم۔ بنیادی بیگم کا نکاح نواب غلام حسین مسرور سے ہوا اور امیرہ بیگم کا مرزا غالب سے۔ بنیادی بیگم اور مسرور میں زیادہ دل نہ بنی تاہم اس تھوڑی سی مدت میں ان کے دو صاحبزادے پیدا ہوئے۔ زمین العابدین خاں (عارف) اور حیدر حسن خاں۔ جب میاں بیوی میں علاحدگی ہو گئی تو مسرور نے ایک مکان بنیادی بیگم کے نام پر کر دیا اور وہ دونوں بچوں کے ساتھ اس میں رہنے لگیں (مسرور نے بعد میں ایک عورت سنگی بیگم سے نکاح کر لیا تھا۔ غلام حسین خاں تو اسی دوسری بیوی کے بہن سے تھے۔ تو بھی غالب سے اصلاح لیتے تھے۔) چند وجوہات کی بنا پر غالب، عارف کو بہت عزیز رکھتے تھے۔ کیوں؟ یہ ملاحظہ کیجئے:

(الف) دونوں بھائیوں میں زمین العابدین خاں زیادہ جو شیار اور لائق تھے اور بہت اچھے شاعر بھی تھے۔ حیدر حسن خاں کو شعر و سخن سے شغف نہ تھا، دوسرے ان کی شادی ان کی والدہ بنیادی بیگم کی حقیقی بچہ زاد عمشیرہ بیگم (دختر نواب احمد بخش خاں) سے ہوئی تھی۔ اس طرح بیگم زوجہ حیدر حسن خاں، بنیادی بیگم کی بہو بھی تھیں اور سنگی بچہ زاد بہن بھی۔ وہ بنیادی بیگم کی اطاعت کما حقہ نہیں کرتی تھیں^{۲۰}۔ ساس بہو میں جھگڑا ہوتا تھا۔ ظاہر ہے کہ غالب نے بنیادی بیگم ہی کا (جسے وہ مظلوم سمجھتے تھے) ساتھ دیا ہو گا اور حیدر حسن خاں کے رویے کو ناپسند کیا ہو گا۔

(ب) عارف، غالب کے شاگرد تھے^{۲۱}۔

(ج) ۱۱ میں دیئے گئے اشعار غالب کے کلیات نظم فارسی میں شامل ہیں جو ۱۸۳۹ء

میں شائع ہوئی تھی۔ اس قلعے میں یہ شعر خاص اہمیت کا حامل ہے۔

بتولا خداے نام علی ست

چون ہاشد جنس کہ جان من ست

یہ قلعہ عارف کے نام ہے اور قیاس ہے کہ ۱۸۴۰ء میں یعنی شاگردی عارف کے کچھ ہی عرصے کے بعد کہا گیا ہو گا۔ اس شعر میں عارف نے بڑے بڑے کہا ہے کہ عارف نہایت عقیدت سے حضرت علی کے نام پر خدا ہے اور ایسا کیوں کر نہ ہو تا وہ میری جان ہے (اس لیے ہر حال میں میری پیروی ہی کرتا)۔

(د) ۱۹۰۳ء یہ قلعہ عارف کا فکر کر رہا ہے جو عارف کو مخاطب ہو کر کہا گیا ہے۔ اس قلعے کے کئی شعر اہمیت کے حامل ہیں یہاں صرف ایک شعر درج کیا جاتا ہے۔ باقی اشعار پر آگے چل کر بحث ہوگی:

فیض محبت سے تیرے غلام

جو بدل قائل امامت ہے

یعنی اے عارف! تیرا غلام (یعنی عارف) جو تیرے فیض محبت سے بدل و جاں امامت کا قائل ہو چکا ہے۔ یعنی شیعہ بن چکا ہے۔۔۔۔۔ یہ شعر گویا عارف کے مندرجہ بالا شاہی شعر کی تصدیق و تائید ہے۔

اب اس بحث کے بعد کچھ کہنے کی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ عارف عارف کو کیوں بہتول فرزند سمجھتے تھے اگرچہ وہ ان کے باقاعدہ مستحق نہ تھے۔

(۱) جب عارف اپریل ۱۸۵۲ء میں انتقال کر گئے تو ان کے چھوٹے بیٹے مرزا حسین علی خاں (شاہاں و خیالی) صرف دو برس کے تھے۔ چوں کہ ان کی والدہ یعنی زوجہ عارف چند ماہ پہلے انتقال کر چکی تھیں اس لیے عارف کی بیوی امر و بیگم انھیں اپنے پاس لے آئیں۔ عارف کی والدہ بنیادی بیگم اور امر و بیگم سگی بہنیں تھیں۔ حسین علی خاں کے بڑے بھائی باقر علی

خاں (باقرو کا آئل) جو حسین علی خاں سے تین برس پہلے تھے، عارف کی وفات کے بعد اپنی دہائی بنیادی بیگم ہی کے پاس رہے تھے۔ لیکن ان کی وفات کے بعد وہ بھی غالب ہی کے پاس آگئے۔ مندرجہ بالا روایت اب عام طور پر تسلیم کر لی گئی ہے۔ لیکن غالب کے خطاط محمد عمر ۱۸ جون ۱۸۵۲ء سے لکھے اور شہرہ ہوتا ہے۔ لکھتے ہیں:

”عارف) کے دونوں بچے کہ وہ میرے پوتے ہیں میرے پاس آرہے ہیں اور وہ میرے گھر کو سناٹے ہیں اور میں تھک کر رہا ہوں۔۔۔۔۔۔
مجھے کہتا نہیں کھانے دیتے، مجھ کو دوپہر کو سونے نہیں دیتے، ننگے ننگے پاؤں میرے چنگ پر رکھتے ہیں، کہیں پانی لڑھکتے ہیں، کہیں خاک ڈالتے ہیں، میں ننگ نہیں آتا۔“

اب یہ سلسلہ ہے کہ عارف نے اپریل ۱۸۵۲ء (جولائی ۱۸۶۸ء) میں وفات پائی۔ اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ وہ یکم اپریل ۱۸۵۲ء (۱۰ جولائی ۱۸۶۸ء) کو مرے تو غالب کے مندرجہ بالا خط تک انھیں انتقال کیے صرف دو ماہ سترہ دن ہوتے ہیں۔ اس خط کی روشنی میں لگتا ہے کہ اس عرصے میں دونوں بچے غالب کے سایہٴ عاطفت میں آچکے تھے۔ لیکن یہ درست نہیں۔ ایسا عارضی طور پر ہوا ہو گا کیوں کہ باقر علی خاں مستقل طور پر اپنی دہائی بنیادی بیگم کے انتقال کے بعد ہی غالب کے پاس لائے گئے تھے اور بنیادی بیگم کا انتقال ۱۳ جون (۲۸ رمضان) ۱۸۵۵ء کو ہوا تھا^{۲۲}۔

(II) ۳ ۱۴ کے تحت قطعہ عارف کی نثر کچھ اس طرح ہو گی (اے غالب) اے قبلہٴ جان و دل! تیرا خداؤں (یعنی عارف) تجھ کو کس طرح برا کہہ سکتا ہے۔ تیرا نام اللہ (یعنی شیر خدا) ہے۔ جس کی بزرگی کی کوئی انتہا نہیں۔ تیرے نام کا درود، عبادت کے برابر ہے۔ تجھے (اے شیر خدا) خدا نے سب پر غالب کیا ہے اس لیے کس کی بہال جو تجھ سے زد کش ہو۔ بلکہ مجھے تو جتنا تازہ کروں دنیا ہے کہ تو مجھ پر مہربان ہے۔ مجھے خوشی^{۲۳} فلک کی نظر کرم کی نہ ہی پردا ہے نہ حاجت۔ اگرچہ یہ میری عادت نہیں تاہم میں حاسدوں کی شکایت کیا

چاہتا ہوں اور وہ سب بیان کیا چاہتا ہوں خود شرارت بنا ہوا ہے۔
 (اے غالب) تیرا ظلام (یعنی عارف) جو تیرے فیضِ محبت
 سے دل و جان سے لاسمت کا قائل ہو گیا ہے (یعنی شیعہ ہو گیا ہے) اور
 ان خاندانوں^{۲۴} کے ذمے میں تیرا لاسمت کا فکڑنا ہوا ہے۔ تیرے اور
 نحو^{۲۵} میرے دشمن ہیں اور وہ اپنے آپ کو خدا کا قائم مقام سمجھتے
 ہیں۔ وہ اتنے سنگدل ہیں کہ ان کی بات چیر کی طرح لگتی ہے ان کی
 صفت یہ ہے کہ ایک کو آفت کہا جائے اور دوسرے کو قیامت۔ اگرچہ
 ایک (تیرے) انتہائی معزز انسان ہے مگر وہ لہرِ ملک سے آتشِ جہاں ہے
 اور دوسرا (نحو) کینہ جوئی میں ٹھو ہے جیسا کہ وہ ایضاً کرتا آتا ہے۔ وہ
 کزوروں پر زور کرتے ہیں، لعنت ہے انکی شجاعت پر، اور جہاں بحر
 کے جھوٹے ہیں ان کے کسی قول میں صداقت نہیں۔“

قلعے کا مطلب تو واضح ہے یہاں صرف یہ اضافہ کرنا ہے کہ یہ بھڑکنا عارف کے تبدیل
 مسلک کے فوراً بعد اٹھ کھڑا ہوا اور غالب کو بھی شاید لپیٹ میں لے لیا گیا ہو۔ گ۔ اس لیے
 قیاس کیا جاسکتا ہے کہ یہ قلعہ ۱۸۸۱ء کے لگ بھگ کا ٹکڑا کر دیا ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ طبعیتیں دو ایک سال ہی کے بعد کافی حد تک صاف ہو گئی تھیں۔ اس
 سلسلے میں نامہ غالب عام شیخو (۲ مئی ۱۳) مورخہ ۲۳ مارچ ۱۸۸۳ء اور نامہ غالب عام
 ضیاء الدین احمد خاں تیر (۲ مئی ۱۳) شمولہ شیخ آپک اشاعت نول ۱۸۸۹ء پیش کیے جاسکتے
 ہیں۔ پہلے میں تیر کا عارف اور نحو کو کپا چھوٹے کر غالب کے گھر بھیجے اور مشاعرے میں شامل
 کرنے کا ذکر ہے اور دوسرے سے پتا چلتا ہے کہ تیر، عارف کی ہراس میں آکر ہلکے ہوئے
 ہیں۔ اس کے علاوہ کریم الدین (۳ مئی ۱۸) ۷۱۸۳ء میں لکھتے ہیں کہ جواب ضیاء الدین خاں
 بہادر (تیر) سے کمال درجہ اور محبت اس (عارف) کو رہتی ہے۔ ”تاہم معلوم ہوتا ہے کہ
 دلوں میں کچھ نہ کچھ جھگڑ ضرور رہ گئی تھی ورنہ غالب، عارف کے مرنے پر یہ نہ لکھتے:

مجھ سے جسے قدرت سہی۔ تیر سے لڑائی
 بچوں کا بھی دیکھا نہ تھا کونئی دن اور

یہ بھی ممکن ہے کہ یہ شو کے محفل اس محبت کے کرب کی وجہ سے ہوں جو دل و جاں سے غالب کو عارف سے تھی۔

حواشی

(۱) کریم الدین مذکورہ طبقات شعراے ہند (ص ۴۱۹) میں لکھتے ہیں کہ غلام حسین خاں مسرور والد..... زمین العابدین خان عارف..... میں نے ان کو دیکھا، قریب ساٹھ برس کے ان کی عمر ۱۳۶۱ھ میں تھی..... اس سے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ مسرور ۱۲۰۱ھ کے لگ بھگ پیدا ہوئے ہوں گے۔ ۱۲۰۱ھ مطابق ہے ۸۷۱/۸۷۲ء کے۔

(۲) اسی تذکرے کے ص ۳۰۰ پر درج ہے "اس سال میں کہ ۱۳۶۳ھ میں عمر اس (عارف) کی قریب تیس برس کی ہے کہ یہ اشعار مذکور کے ہیں..... مگر یا ولادت ۱۲۳۳ھ میں ہوئی تھی۔

(۳) یہ غالب کا سہو ہے۔ یہ خط اردوئے معلیٰ پبلائیٹیشن ۱۸۶۹ء کے ص ۲۱/۲۰ پر درج ہے۔

(۴) کن ولادت ۱۲۳۳ھ (۱۸۱۷ء) قرار پاتا ہے۔ انتقال اپریل ۱۸۵۴ء میں ہوا اس طرح عارف نے عمر مزید کے ۳۵ سال بھی پورے نہیں کیے۔

(۵) اسہد الغالب ص ۶۳۔ مطبوعہ فردوسی ۱۹۶۹ء

(۶) اسہد الغالب ص ۸۰۔ مطبوعہ فردوسی ۱۹۶۹ء

(۷) یہ تذکرہ اواخر ۱۸۳۴ء میں تالیف ہوا اور ۲۹ جولائی ۱۸۳۵ء کو مولف ہی کے مطبع رقاہ عام سے شائع ہوا۔

(۸) یہ غالب کے خواہر زلوے نہیں بلکہ ان کی بیوی اسرار بیگم کے خواہر زلوے یعنی بھانجے تھے۔

(۹) "خواہر زلوہ زوجہ نواب اسد اللہ خاں مرزا نوشہ غالب کے" ہوتا چاہیے۔

(۱۰) خسرو مرزا لکھتے ہیں ”بقول عائنی ماں معظم زبانی بیگم صاحب (زوجہ باقر علی خاں کا قتل خلف عارف) مرثیہ، مرزا غالب، جنازہ (عارف) کے ساتھ ساتھ پڑھتے جاتے تھے اور لوگوں کو رلاتے تھے۔“ (امبار الغالب ص ۶۵) یہ کہانی محض بیانِ ماتم میں شدت لانے کے لیے گھڑی گئی ہے۔

(۱۱) اردوئے معلیٰ ص ۶۷ پہلا ایڈیشن ۱۸۶۹ء خطِ تمام نقت۔

(۱۲) خط کا شروع اور آخر یہ ہے ”قبلہ حاجات، اگر ایس ہندہ..... نماز عمر و دولت ز حساب افزوں باد۔“

(۱۳) خط کا شروع اور آخر یہ ہے ”جان را از تن سپاس و خواجہ..... ایر قطره فشاں بود و ہوا محرک باد۔“

(۱۴) خط کا شروع اور آخر یہ ہے ”بر اور، اشک و آو غالب نامراد..... بہ میر کرم علی صاحب سلام۔ والسلام خیر تمام۔“

(۱۵) مولف تذکرہ گلدستہ یازنیاں اور طبقات شعرائے ہند۔ (دیکھیے طبقات شعرائے ہند۔ ص ۳۰۱-۳۰۰)

(۱۶) پہلا ایڈیشن۔ ۱۸۶۹ء مکمل المطالع دہلی۔

(۱۷) جلد پنجم۔ ص ۵۰۹

(۱۸) تذکرہ طبقات شعرائے ہند مولفہ ۱۸۳۷ء، ص ۳۰۰

(۱۹) ذکر غالب (پانچواں ایڈیشن ص ۱۳۶) میں بنیادی بیگم کو بڑی صاحبزادی اور امراؤ بیگم کو چھوٹی صاحبزادی لکھا ہے مگر علامہ غالب (بار دوم ص ۳۹۱) میں بنیادی بیگم کو چھوٹی صاحبزادی لکھا ہے۔

(۲۰) امبار الغالب۔ ص ۸۵

(۲۱) عارف پہلے شاہ نصیر سے اصلاح لیتے تھے۔ انھوں نے ایک دیوان بھی ”مطلع مہر سعادت“ کے نام سے مرتب کر لیا تھا جو سراسر شاہ نصیر کے اسلوب کا آئینہ دار تھا۔ بعض تذکرہ نویسوں کا کہنا ہے کہ جب مرزا غالب نے دلی کو اپنا مستقر بنالیا تب عارف نے شاہ نصیر کی شاگردی ترک کر کے غالب کی شاگردی اختیار کر لی، مگر یہ قطعی غلط ہے کیوں کہ

بب غالب مستقل طور پر دلی آئے ہیں اس وقت عارف کے وجود میں آنے میں ابھی لگ بھگ پانچ سال باقی تھے۔ بعض کا خیال ہے کہ جب شاہ نصیر عازم دکن ہوئے تب عارف نے غالب سے استفادہ شروع کیا۔ یہ بھی درست نہیں معلوم ہوتا کیوں کہ نصیر نے دکن کے کئی سفر کیے۔ آخری سفر میں حیدر آباد دکن میں ۳۹/۱۸۴۸ء میں انتقال کیا۔ اس وقت عارف میں انیس برس کے تھے۔ میری رائے میں عارف نے شاہ نصیر کی وفات کے بعد ہی غالب سے اصلاح کلام کے لیے رجوع کیا۔ وہ پہلے بھی غالب کے عزیز تھے مگر اب غالب اور عارف گویا یک جا ہو گئے۔ حتیٰ کہ غالب کی تقلید میں عارف شیعہ بھی ہو گئے۔

(۲۲) مکتوب بنام نبی بخش حقیر ۲۳ جون ۱۸۵۵ء۔ گویا ہا قر علی خاں مستکلا غالب کے پاس ۱۳ جون اور ۲۳ جون ۱۸۵۵ء کے درمیان کسی روز لائے گئے تھے۔ عین ممکن ہے کہ ۱۳ جون کو ہی آگئے ہوں۔

(۲۳) عطارد۔ سہد سیارہ میں سے ایک ستارے کا نام۔ خیونش میں اسے بدھ کہتے ہیں۔ اسے علم اور عقل کا نگہبان کہتے ہیں۔ فارسی میں ٹٹنی فلک کو دیر فلک بھی کہتے ہیں۔

(۲۴) خارجی مسلمانوں کے اس فرقے کو کہتے ہیں جو اہل بیت اور خصوصاً حضرت علی کو برا کہتا ہے اور ان سے دشمنی رکھتا ہے۔ قلعے میں عارف نے یہاں خارجیوں کے مقابلے میں خود کو ٹٹنی کہا ہے جسے مراد "سنت پر عامل" کے ہیں۔

(۲۵) ضیاء الدین احمد خاں خیر و رفیع (اکتوبر ۱۸۴۱ء تا ۲۷ جون ۱۸۸۵ء) غلام حسن خاں محمود لادت تقریباً ۱۸۴۲ء۔ ۱۸۶۶ء تک زندہ تھے۔

غالب کا ملازم خاص کلو داروغہ

۱۔ غالب کی زندگی میں

غالب کے کم از کم ۱۹ خطوں میں کلو کا ذکر آیا ہے۔ یہ سب غالب کے علاحدہ اور اصحاب کے نام ہیں۔ فشی فشی بخش حقیر (۳ خط) بحر دح (۳ خط) حسین مرزا (۳ خط) یوسف مرزا (۳ خط) شفق (ایک خط) بے قبر (ایک خط) سالک (ایک خط) حکیم غلام نجف خاں (ایک خط) ملائی (ایک خط) ثاقب (ایک خط منظوم) میاں دلا خاں سپاح (ایک خط)۔ پہلا خط جس میں کلو کا ذکر آیا ہے۔ حقیر کے نام ہے اور ۲۱ مئی ۱۸۵۲ء کا لکھا ہوا ہے۔ غالب کہتے ہیں:

”کل رات کو پا کھل کا مرہ مر جان میں رکھ کر اور اس کو مونی جامہ سے بند کیا اور اس پر اپنی مہر کر کر کلو کے ہاتھ مرزا (حسن علی بیگ) کے پاس بھجو لایا۔ کلو ان کو مرہ دے کر رات کو اپنے گھر رہا۔ اب صبح ہوئی اور کلو آیا تو اس نے بیان کیا کہ مرزا حسن علی بیگ نے بندگی بھی ہے اور کہا ہے کہ میں کل نہ جاؤں گا، پر سوں جاؤں گا۔“^۱

اس خط سے دو باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ پہلی یہ کہ کلو کوئی پانچ سات سالہ بچہ نہ تھا (اس وقت یوڑھلیاویہ عمر کا تو وہ ہو ہی نہیں سکتا تھا، کیوں کہ جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہو گا اس نے بہت لمبی عمر پائی) جو ایسا ذمہ داری کا کام کر سکتا۔ میرے خیال میں کلو اس وقت ۲۰ یا ۲۲

سال کا ضرور ہو گا اور اس طرح اس کا سال ولادت ۱۸۳۰ء کے قریب ہونا چاہیے۔ دوسری یہ کہ کٹو خاص دلی کارہنے والا تھا اور رات کو غالب کے مکان پر نہیں رہتا تھا بلکہ اپنے گھر سونے کے لیے چلا جاتا تھا۔ اس کی تصدیق ۱۶۰/۱۸۵۹ء کے ایک خط بنام حسین مرزا سے بھی ہوتی ہے۔ کہتے ہیں:

”پرسوں کٹو جوتا لے آیا، کل دونوں طرف سے کھلا ہوا (پارسل) لے کر گیا۔ ذراک کے کار پر دائروں نے الٹا پھیر دیا اور کہا کہ پو لنده بتاؤ۔ پو لنده بتا کر لے گیا۔ کہا، بارہ پر دو بجے لے جائے گا۔ (کٹو وہاں) بیٹھا رہا۔ رات کے نو بجے (پارسل) اس (کٹو) کے سامنے روانہ ہوا۔ رسید لے کر اپنے گھر گیا۔“

یعنی دو پارسل کی رسید لے کر غالب کے پاس نہیں آیا۔ بلکہ زیادہ رات ہو جانے کی وجہ سے اپنے گھر چلا گیا۔ اس سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ کٹو کا یہ دستور کم از کم ملازمت کے پہلے سات سال تک ضرور قائم رہا۔

کٹو کی عمر کے بارے میں ہنگامہ نگار صاحب (ہا قریٰ خاں کاتل کی اہلیہ جنھوں نے غالب کی زندگی کا آخری دور اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا) کا قول ”ہے کہ کٹو چودہ برس کی عمر میں مرزا (غالب) صاحب کے پاس آکر رہے۔“ چودہ برس کی عمر کے عقین میں حافظے کی قلعی بھی ہو سکتی ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کٹو ۱۸۵۲ء (خط بنام حقیر) سے کئی برس پہلے غالب کی ملازمت میں آیا ہو۔ کٹو جس کا اصل نام کالے خاں تھا، غالب کے خطوں میں پہلی بار ۱۵ ستمبر ۱۸۵۳ء کے خط میں داروہ (یعنی غالب کے ملازمین کے محلے کا سربراہ) کہہ کر پکارا گیا۔ حقیر کو لکھتے ہیں:

”صاحب ایک چپ بھیلی ہے کہ کوئی گھرنہ ہو گا جس کے آدھے آدمی چپ میں جھلاتا ہو۔ باری کی چپ توبہ۔ کٹو داروہ، اس کی ماں، مداری کی گھر والی اس کے بچے، سب بیمار۔“

اگر میرا قیاس کر دو سال ولادت ۱۸۳۰ء سمجھ لے تو داروہ بھی کا خطاب پانے کے وقت کٹو ۲۳ سال کا قریب ہوتا ہے۔ یوں بھی اس سے کم عمر کے ملازم کا داروہ و دلی ان خانہ مقرر ہونا حلیم

نہیں کیا جاسکتا۔

معلوم ہوتا ہے کہ کلو کھم دو کم شروں میں اپنے دوسرے زخائے کاری طرح سوم و صلوٰۃ کا پابند ہوتا تھا۔ ۳ جون ۱۸۵۳ء کے خط بنام حقیر میں غالب رقم طراز ہیں۔ ”میرے چار خدمت گار ہیں۔ چاروں درودہ دار ہیں۔“ ظاہر ہے کہ ان چار خدمت گاروں میں ایک کلو ہے۔ یا پھر مئی ۱۸۶۱ء کا خط بنام بخروج..... ”کلو، دیار کے سر پر قرآن رکھو، کلیان کے ہاتھ میں کنگا جلی^۵ دو.....“ ایک محکوم خط غالب کے نام ملتا ہے۔ اس رباعی میں غالب نے کلو کو حافی لکھا ہے۔ کیا کلو واقعی حج کر آیا تھا یا کلو کے مذہب سے لگاؤ کو دیکھتے ہوئے غالب نے ایسا لکھ دیا ہے؟

رقم کا جواب کیوں نہ سمجھا تم نے
غالب حرکت یہ کی ہے بے جا تم نے
حافی کلو کو دے کے ہے وجہ جواب
غالب کا پکا دیا کلیجہ تم نے

مگر کلو کے اس مذہبی شغف کے متوازی چند چشم دید بیانات بھی ہیں اور وہ اس قابل ہیں کہ انھیں راوی ہی کی زبان میں بیان کیا جائے۔ عارف کے سچے مرزا محمد حسن خاں عرف خضر مرزا لکھتے ہیں۔

”کلو دارودہ نگاہ و صحر کر آدھ پاؤ شراب اس میں ڈال دیتا اور نگاہ و صحر کر ان (غالب) کے پاس رکھ دیا کرتا تھا..... یہ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے.....“

حالی کہتے ہیں:

”جس بکس میں بو عسیر رہتی تھی، اس کی کنگی (کلو) دارودہ کے پاس رہتی تھی..... دارودہ (کلو) نہایت شہر خواہ تھا (یعنی رات کو مانگنے پر بھی زیادہ شراب نہ دیتا تھا).....“^۸

قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب کے آخری ۱۸ سال میں کلو ان کی زندگی کا جزو بن

گیا تھا۔ گھر میں، سڑ میں، آلام میں، سڑ میں ہر قدم پر، غالب کا ہم قدم ہے۔ غالب بھی ہر طرح کٹوکا خیال رکھتے ہیں۔ پتھری میں اپنے بچوں کے ساتھ، اس کی صحت کے لیے بھی دعا کرتے رہتے ہیں۔ غلوں میں سبزی کے اقتباسات اس کے شاہد ہیں۔

۱۵/ جولائی ۱۹۵۹ء
اس وقت کلو کے پاس ایک روپیہ سات آنے باقی ہیں۔ بعد اس کے نہ کہیں سے قرض کی امید ہے نہ کوئی جنسہ عن دھنچ کے قابل۔

۳۱/ دسمبر ۱۹۵۹ء
میر شفیق سے ملاقات کے غیر میں چنہ کر صاحب سکرٹری، بہار کو اطلاع کر دئی۔ چڑھی کے ساتھ کلو بھی گیا جو اب آیا کہ بہار اسکا ہمدرد کو کہ فرست نہیں ہے۔

۱۸۶۰ء.....؟ - عام خوش
میرے گھر میں دو آدمی تپ میں چلا ہیں ایک بڑا لڑکا (باقری علی خاں) اور ایک میرا دلروفہ (کلو) تھا ان دونوں کو صحت دے۔

۲۲/ جنوری ۱۸۶۱ء عام بکرمج
۱۸۶۳ء عام ہے تھر
اب دو بچہ ان خانہ میں ایک میں ہوں اور ایک دلروفہ (کلو) اور ایک بہار خد مت جاگ۔

۱۱/ جولائی ۱۸۶۳ء
عام ساگ
کلو دلروفہ کو کوروش عرض کرتا ہے اوروں کو یہ پایہ حاصل نہیں کہ وہ کوروش بھی بھلا لیں۔

۲۱/ اکتوبر ۱۸۶۵ء
عام حکیم نظام نجف خاں
(رام پور میں) میں خوش، لڑکے (باقری علی خاں اور حسین علی خاں) بھی خوش۔ کلو اچھا ہو گیا۔

۲۲/ دسمبر ۱۸۶۵ء عام چٹائی
۱۷/ جون ۱۸۶۷ء عام بکرمج
کلو اور لڑکا نیا علی یعنی ذبیحہ آدمی میرے پاس ہیں۔

۱۷/ جون ۱۸۶۷ء عام بکرمج
۱۷/ جون ۱۸۶۷ء عام بکرمج
اے لڑکا آج بریلی سے ایک بھنگی ایک دوست (عبدالحمید) جتوں کی گھنگی ہوئی آئی، دو نوکے، ہر نوکے میں ۳ آم۔ کلو دلروفہ نے میرے سامنے دو نوکے کھولے۔ سو میں تراسی آم اچھے کھلے اور ایک سو سترہ آم بالکل خرابے ہوئے۔

اس طرح اور بھی خط ہیں، جن میں کٹو داروندہ اور اس کے ساتھی ملازموں کا کام اور کام موجود ہے ان میں سے ایک خط کا ذکر یہاں خاص طور پر کیا جاتا ہے، یعنی خط مورخہ ۲۸ نومبر ۱۸۵۹ء بنام یوسف مرزا لکھتے ہیں:

”اب خاص اپنا دو کہ روٹا ہوا۔ ایک بیوی، دو بچے، تین چار آدمی گھر کے، کٹو، کلیمان ملایا، یہ باہر، مداری کے جو روٹے بدستور، گویا مداری موجود ہے۔“

اس سے پہلے ۱۵ ستمبر ۱۸۵۳ء کے خط بنام حقیر میں تب کا ذکر کرتے ہوئے غالب کہہ چکے ہیں کہ کٹو داروندہ، اس کی ماں، مداری کی گھر والی، اس کے بچے، سب بنیاد پڑے ہیں۔ ۳۶ جولائی ۱۸۵۹ء کے خط بنام یوسف مرزا میں لکھا ہے کہ ”یا قری علی اور حسین علی، اپنی داوی کے ساتھ ہیں۔۔۔ قلب صاحب گئے ہوئے ہیں، نیاز اور نیاز علی بھی ان کے ساتھ ہیں۔“ ۱۸/ اگست ۱۸۵۹ء کے خط بنام یوسف مرزا میں تحریر ہے ”یا علی، یا علی، یا علی، دوس ہارول میں کہا ہو گا کہ مداری کا بیٹا دوڑ ہوا آیا اور تین خط لایا۔ یعنی وہ نیچے حویلی میں تھا، ذاک کے ہر کارے نے خط لا کر دیے۔ نیاز علی اوپر لے کر آیا“ ۳۰ ستمبر ۱۸۶۵ء کے خط بنام عطاء کی میں ہے۔ ”کٹو اور لڑکا نیاز علی یعنی ڈیڑھ آدمی میرے پاس ہیں۔“

مداری (پورا نام مداری خاں) غالب کا ایک قدیم نوکر تھا۔ اس کا ذکر بطور ایک فعال نوکر کے پہلی بار شیخ آجنگ قلمی مکتوب ۹، ۱۸۳۵ء میں ایک خط میں آیا ہے۔ غالب دہلی سے مراد

علی بخش خاں کو لکھتے ہیں۔۔۔ مداری خاں سے رسد و نامہ رائے رسالہ (یعنی مداری خاں میرے رشتے کے ساتھ آپ کے پاس پہنچتا ہے) خود کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خط سفر نکلتے سے بہت پہلے کا ہے یعنی ۱۸۳۶ء سے پہلے کا۔ گویا مداری ۱۸۳۶ء میں یا اس سے پہلے سے غالب کا ملازم تھا، مگر جیسے ۱۸۳۹ء کے بعد کسی جیتے جاگتے مداری کا نام نہیں ملا۔ ۱۸۵۳ء، ۱۸۵۹ء کے لوہے بیان کردہ خطوں میں مداری کی بیوی اور اس کے بچوں کا ذکر تو ملتا ہے مگر خود مداری کا نہیں۔ اس سے اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ ۱۸۳۹ء اور ۱۸۵۳ء کی درمیانی مدت میں مداری کا انتقال ہو چکا تھا۔ یہ لڑکا نیاز علی جس کا ذکر اوپر کئی خطوں میں آیا ہے۔ مداری ہی کا بیٹا تھا۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۶۵ء سے پہلے مداری کی اولاد، یعنی نیاز علی کی والدہ کا

بھی انتقال ہو چکا تھا۔ جہول بگہ بیگم صاحبہ (آئینہ غالب ص ۹) مداری خاں کے لڑکے نیاز علی کو ”مرزا صاحب نے“ لے لیا تھا۔ ”اور بیٹی آبادی کو کلونے اپنی بیٹی بنالیا تھا۔“ مداری کے عاتبا کی دو بیٹے تھے۔

اب مندرجہ بالا سے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ غالب کے یہاں ملازمت کے زمانے میں کلون کی ماں زندہ تھی اور باپ شاید زندہ نہ تھا۔ کلون کی یا تو شادی ہی نہیں ہوئی تھی یا اس کے کوئی اولاد نہیں تھی۔ جب ہی اس نے مداری کی بیٹی آبادی کو اپنی بیٹی بنالیا تھا۔

ایک جگہ حارف کے بیٹے حسین علی خاں کا غالب سے شوقیاں کرنے کا حال بیان کرتے ہوئے حضرت مرزا فرماتے ہیں۔ (آئینہ غالب ص ۷) ”کھیل تاشے کا تو انھیں (حسین علی خاں کو) پکا تھا۔ کٹہ چٹلیوں کے تاشے پر ایک دفعہ میں روپے خرچ کر دیے اور پھر مرزا صاحب کے پاس ملے بسورے ہوئے آئے کہ دلوا جان میں روپے دلوائیے۔ مرزا صاحب نے کلون کو بلا کر کہا۔ ”بھئی انھوں نے ایک پتھر اور مارا دے دے ہیں روپے۔“

غالب کی زندگی میں کلون کا ذکر آخری بار غالب کے انتقال کی گزریوں میں آتا ہے۔ مالک داس رقم طراز ہیں۔ (ذکر غالب۔ بارہم ص ۱۳۳):

”بگہ بیگم فرماتی تھیں کہ موت سے ایک دن پہلے (مرزا صاحب کو) کچھ اتفاق ہوا تو کھانے کی خواہش کا اظہار فرمایا۔ پھر ملازم سے کہا کہ مرزا جیون بیک (یعنی مرزا باقر علی خاں اور بگہ بیگم کی سب سے بڑی صاحبزادی) کو بلا لانا۔ یہ عموماً انھیں کے پاس کھیلتی رہتی تھیں۔“

ملازم انھیں بلانے کے لیے محل سراے میں آیا تو وہ آرام کر رہی تھیں۔ بگہ بیگم نے کہا کہ سو رہی ہے۔ جو نمی جاگتی ہے، بجھتی ہوں۔ ملازم (کلون) نے واپس آکر یہی کہہ دیا۔ اس پر فرمایا کہ بہت اچھا، جب وہ آئے گی ہم کھانا کھائیں گے۔ اس کے بعد جو نمی گاؤ بیٹھے پر سر رکھا، بے ہوش ہو گئے۔ اسی حالت میں اگلے دن ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء کو دوپہر چلے اس باکمال کا انتقال ہو گیا۔“

۳۔ غالب کے انتقال کے بعد

ذکر غالب ^{۱۲} میں لکھا ہے کہ ”مدار آئی، کھودا روغہ اور کلیان تینوں بہت لمبے عرصہ تک

ان (غالب) کے پاس (مدار) رہے۔ بلکہ کھو کا انتقال بھی مرزا کے بعد اسی گھر میں ہوا۔“
(جس میں مرزا غالب کا انتقال ہوا تھا۔)

چوں کہ کتاب میں اس بیان کے ماتخذ کی نشان دہی نہیں کی گئی تھی۔ اس لیے میں نے جناب مالک رام سے ماتخذ کے بارے میں اور کھو کی تاریخ وفات کے بارے میں دریافت کیا۔ انھوں نے فرمایا ^{۱۳}۔

”کھو کے بارے میں اطلاع راجا بیگم سے ملی تھی۔ افسوس کہ اس وقت میں نے زیادہ پوچھ گچھ نہ کی ورنہ ممکن ہے کہ اس کا سال وفات بھی معلوم ہو جاتا۔ وہ ٹھیک سال تو شاید نہ بتا سکتیں لیکن کچھ آچا ضرور مل سکتا تھا۔۔۔۔۔“

پھر بھی رہ رہ کر ذہن میں یہی خیال آتا تھا کہ کھو امر و بیگم (اپنے غالب) ہی کی زندگی تک اس مکان میں رہ پایا ہو گا؟ کیا بیگم کے انتقال کے بعد بھی وہاں کھو کی سکونت کا امکان ہو سکتا ہے؟ اگر ایسا امکان نہیں تو کھو زیادہ سے زیادہ ۱۸۷۰ء تک انتقال کر چکا ہو گا؟ مگر ہمارے پاس شہادتیں موجود ہیں کہ کھو ۱۸۷۰ء کے کافی عرصہ بعد تک زندہ رہا۔ چنانچہ ان دوسو سوں کو ذہن میں رکھ کر میں نے پھر استفسار کیا۔ جناب مالک رام نے دیانت داری سے اس بات پر روشنی ڈالی ^{۱۴}۔

”۔۔۔ آپ کے سوال کا جواب آسان بھی ہے اور مشکل بھی۔ جب اس سلسلے میں میری گفتگو مر حومہ راجا بیگم سے ہوئی ہے تو ان کے الفاظ تھے ”کھو کی وفات اسی مکان میں ہوئی، ہم اس وقت نواب ضیاء الدین احمد خاں فیر درخشاں مرحوم کے مکان میں بیٹھے تھے۔ جہاں راجا بیگم اپنی بیوگی کے بعد سکونت پذیر ہو گئی تھیں اور وہیں ان کا انتقال بھی ہوا۔ میں نے تفصیل دریافت نہیں کی کہ اسی مکان سے ان کی کیا مراد ہے۔“

اس سے ظاہر آپکی معلوم ہوتا ہے کہ کھوسر نو بیگم کی وفات کے بعد نئے درمیش کی ملازمت میں آگیا تھا اور انھیں کے وہاں اس کی وفات ہوئی، رہا یہ کہ تقریباً کون سے سال اس کا انتقال ہوا ہوگا۔ اس کے بارے میں قیاس ناممکن ہے۔ یہ تک تو معلوم نہیں کہ غالب کی وفات کے وقت اس کی عمر کیا تھی۔ اگر اس کا کچھ اندازہ ہوتا تو ممکن تھا کہ کچھ قیاس آرائی کی جاسکتی۔“

حقیق کا یہ فرض ہے کہ اسر ذمہ تحقیق کے بارے میں جو کچھ بھی وہ جانتا ہو دیانت داری سے ظاہر کر دے۔ اپنی طرف سے کوئی قیاسی اضافہ نہ کرے۔ یہی چناب مالک رام نے کیا۔ البتہ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ مزید تحقیق سے کھوسر کے سال ولادت کی طرح اس کے سال وفات کا بھی کچھ سراغ مل گیا۔ مرحوم درگاہ بیگم نے ملاقات کے دوران جو حمید احمد خاں نے ان سے جولائی ۱۹۳۸ء میں کی تھی، فرمایا تھا^{۱۵}۔

”کھوسر دودھ کو مرے ہوئے چند روز میں ہو گئے۔“

گویا کھوسر کا انتقال ۱۹۲۳ء میں ہوا۔ اگر چند روز سال کے بیان کو ایک ضعیف خاتون کا قیاسی بیان بھی مان لیا جائے تو بھی ۱۹۲۰ء کو سال وفات تسلیم کر لینا کچھ زیادہ بے جا نہ ہوگا۔ اسی طرح ۱۸۳۰ء کو سال ولادت مان کر یہ کہنا پڑے گا کہ کھوسر دودھ نے سال دو سال اوپر اور ۹۰ برس کی لمبی عمر پائی وہ ۲۰ سال سے بھی کم عمر میں مرزا غالب کی ملازمت میں آیا، تقریباً ۲۰ سال ان کی ملازمت میں رہا اور ان کے انتقال کے بعد تقریباً ۵۰ سال زندہ رہا۔ یہ سب بیگم فرماتی ہیں^{۱۶}۔

”لوگ ان (کھوسر) کی زیارت کو بہت آتے تھے۔۔۔۔۔ (وہ) پاؤں کی آہٹ سے پہچان لیتے تھے کہ لڑکیاں ہیں، بھویں ہیں یا بوڑھیاں۔“
خسرو مرزا لکھتے ہیں^{۱۷}۔

” (۱۸۹۵ء) کے بعد میں اپنے علی گڑھ کے دو استادوں کو ان کی خواہش کے مطابق دہلی لایا اور ولوالہ غالب مرحوم کے ملازم و دودھ کھوسر

سے جو ہماری محل سرا کے ذیو زحمی ہانوں میں شمار ہوتے تھے، ملاقات کرادی اور دارودہ کلو سے ان کی گفتگو ہوئی۔ دارودہ کلو نے یہ بھی بتایا کہ مرزا غالب دربار قیسری کے رکن بن گئے تھے اور ان کو بہت پارچات کا خلعت معہ مالائے مروارید اور جیدہ مرصع عطا ہوا تھا۔ یہ گفتگو سن کر وہ ان کی تاواندگی کی وجہ سے متحیر ہو کر عیش عیش کرنے لگے۔ یہ دارودہ وہ تھے جن کو بعد وفات دلو غالب ہماری محل سرا کی ذیو زحمی پر ملازم رکھ لیا گیا تھا اور یہ ہمارے تمام ملازمین میں اس زمانہ کی تہذیب کے مطابق دلو اکلو کے نام سے خطاب کیے جاتے تھے۔ ”

حمیدہ سلطان^{۱۸} صاحبہ جن سے میں نے ۳۱ اکتوبر ۱۹۸۰ء کو علی حوالہ دہلی میں

ملاقات کی تھی، فرماتی ہیں:

”کلو کا انتقال ثانی ماںں ہجہ بیگم صاحبہ کے قول کے مطابق محل سرا کی ذیو زحمی میں ہوا۔ یہ محل سرا کا مکان نواب خیاں الدین احمد خاں نے اپنی بیٹی ہجہ بیگم (ثانی ماںں) کے جہیز میں دیا تھا۔ ثانی ماںں فرماتی تھیں کہ کلو خاصی عمر کے آدمی تھے۔ شاید ۹۰، ۸۰ سال کی عمر کے۔ دارودہ جو تھے ذیو زحمی میں پڑے رہتے تھے۔“

اب سید جانب دہلوی نے جو کچھ کلو سے سنایا وہ مستتر سمجھ کر درج کر دیا وہ بھی پڑھ لکھے

کا^{۱۹}۔

”کلو نے ان (غالب) کی وفات کے بعد پھر کسی کی نوکری ہی نہیں کی اور ساری عمر ان کی یاد اور قاتحہ خوانی میں گزار دی“^{۲۰}۔ راقم الحروف نے کلو سے بارہا مرزا صاحب مرحوم کے حالات سنے ہیں مگر کبھی اس نے ٹھنڈا سانس لیے اور سخت حسرت ظاہر کیے بغیر ان کا ذکر شروع نہیں کیا۔ دلو ان خاندان میں بیٹھنے والوں کی نسبت وہ کہا کرتا تھا کہ جناب مرزا صاحب بعض اوقات دنوں نیچے نہ اترتے تھے اور ان کی صورت

نہ دیکھتے تھے۔ مگر وہ غل مپاڑہ گویا ان کی نذر اسے روح تھا، جس کے بغیر انھیں کل نہ چڑتی تھی۔ ان لوگوں سے اگر وہ کبھی کام لیتے تھے تو یہ لیتے تھے کہ جب کوئی نیا مضمون ہاندہتے تھے اور اس کی مسرت کے کیف میں بے خود ہو جاتے تھے تو نیچے تشریف لے آتے تھے اور وہ شعر لوگوں کو سناتے تھے اور دالے کر پھر اٹھنے پاؤں واپس چلے جاتے تھے۔ کبھی ایسا موقع ہوتا تھا کہ دیوان خانہ میں چند ناخواندہ شخص جمع ہیں جو شعر کا مطلب تو در کنار اس کی ترکیب لفظی کو بھی نہیں سمجھ سکتے تھے مگر مرزا صاحب موصوف پر شوق کا وہ غلبہ ہوتا تھا کہ انھیں کو سناتے تھے۔ کھڑکایاں ہے کہ کئی مرتبہ ایسا بھی دیکھا کہ دیوان خانے میں چڑیا بھی نہیں، لیکن مرزا صاحب آئے اور دروازے میں کھڑے ہو کر آپ نے فرمایا ”لو بھی اسنو! کیا مضمون ہاتھ آیا ہے۔“ اور پھر آپ نے شعر پڑھا اور ضروری تشریح کی اور مطمئن ہو کر پھر کوٹھے چلے گئے۔ ملازم چوں کہ ان حالتوں سے واقف تھے اس لیے خاموش رہتے تھے اور بعض اوقات کسی معمولی آدمی کو چپکے سے دیوان خانہ میں بھیج دیتے تھے کہ مرزا صاحب کی تکلیف دہائیگاں نہ جائے اور وہ آزد وہ نہ ہوں، حالانکہ انھی مرزا نوشہ کی نازک دماغی کا یہ حال تھا کہ بعض موقعوں پر جناب نواب ضیاء الدین خاں مرحوم ضرور غشاش اور نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ میرور اور نواب علاء الدین خاں علوی مغفور جیسے رؤسائے بلند پایہ ملتیں کرتے کرتے تھک جاتے تھے اور وہ ایک مصرع تک زبان پر نہ لاتے تھے۔ اللہ اللہ! کیا کہا ہے کہ شاعر اپنے رنگ میں پادشاہ سے بڑھ کر ہوتا ہے۔“

اب اس بیان سے، زیادہ سے زیادہ یہی نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ عمر کے ساتھ ساتھ ان پڑھ اور دقاہ اور نوروں میں مبالغہ آرائی کی عادت میں بھی اضافہ ہوتا رہتا ہے۔

حواشی

- (۱) نادرات غالب۔ ص ۲۳۔ خط نمبر ۱۹
- (۲) خطوط غالب۔ از: مہر، ص ۳۹۳۔ خط نمبر ۵
- (۳) آئینہ غالب۔ ص ۹
- (۴) نادرات غالب۔ ص ۶۳۔ خط نمبر ۳۶
- (۵) نادرات غالب۔ ص ۵۳۔ خط نمبر ۴۰
- (۶) خطوط غالب۔ از: مہر، ص ۳۹۷۔ خط نمبر ۳۵
- (۷) اولیٰ دنیا سالنامہ۔ ۱۹۳۰ء۔ ص ۲۲۶
- (۸) یادگار غالب (معیاری ادب) ص ۸۲
- (۹) شیخ آجک قلمی مکتوبہ ۱۸۳۹ء اور ۱۸۳۰ء میں بھی یہ خط شامل ہے اور پہلے ایڈیشن مطبوعہ ۱۸۳۹ء کے ص ۲۰۹ پر بھی۔
- (۱۰) یعنی اپنے یہاں بطور ملازم رکھ لیا تھا۔
- (۱۱) آئینہ غالب۔ ص ۱۱ پر یہی روایت درج ہے۔ مگر وہاں ملازم کا نام کھڑکے بجائے احمد بیگ ہے۔ لیکن مالک رام صاحب کی روایت زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے کیوں کہ حمید احمد خاں صاحب ایک ہی بار گج بیگم صاحبہ کی ملاقات کو گئے۔ جب کہ مالک رام صاحب اکثر ان سے ملاقات کیا کرتے تھے بلکہ بعد میں اس بزرگ بیگم نے ان سے پردہ کرنا بھی ترک کر دیا تھا۔
- (۱۲) پانچواں ایڈیشن مطبوعہ فروری ۱۹۷۶ء، ص ۲۰۵
- (۱۳) خط نام راقم مورخہ ۳۰ ستمبر ۱۹۸۰ء
- (۱۴) خط نام راقم مورخہ ۲۰/ اکتوبر ۱۹۸۰ء
- (۱۵) آئینہ غالب۔ ص ۹

(۱۶) آئینہ غالب۔ ص ۹

(۱۷) اسرار الغالب۔ ص ۵

(۱۸) بیچ بیگم صاحبہ رشتے سے حمیدہ سلطان صاحبہ کی سگی بانی تھیں۔ بیچ بیگم صاحبہ کے انتقال

(۱۹۳۵ء) کے وقت حمیدہ سلطان صاحبہ کی عمر ۳۰ سال سے اوپر تھی۔ اس لیے میں نے

بلور خاص ان سے چند سوالات کیے تھے۔

(۱۹) مکتوبات آزاد۔ بار و قسم۔ دیباچہ (۱۹۰۷ء) ص ۱۰

(۲۰) یہ قطعاً غلط ہے۔ کلر کو نواب ضیاء الدین احمد شاہ کے یہاں باقاعدہ ملازم رکھ لیا گیا تھا۔

مرزا عباس بیگ

آج تک ”دعا الصباح“ کے قاری محکوم ترجمہ غالب کی اشاعتِ نفل کا صرف ایک ہی نسخہ معلوم ہے جو غالب کی زندگی میں نو لکھنؤ سے حسبِ الایمانے مرزا عباس بیگ صاحب اکشر اسٹنٹ کشنر لکھنؤ شائع ہوا^۱۔ غالب کے اس ترجمے سے متعلق تو کئی مضامین شائع ہو چکے ہیں^۲۔ مگر مرزا عباس بیگ کے حالات ابھی تک تحقیق نہیں ہوئے تھے۔ جس کی وجہ سے غلط فہمیاں رونما مانی تھیں۔ اس مقالے میں مرزا عباس بیگ سے متعلق بہت سا مواد جمع کر دیا گیا ہے۔

۱۷۷۵ء کے لگ بھگ مرزا غالب کے دواوقہ خان بیگ کے ساتھ قبیلہ برلاس کے ایک امیر زادے مرزا بیون بیگ خاں جو حضرت سہرپوش کی اولاد میں تھے اپنے خاندان سمیت دہر دہندوستان ہوئے^۳۔ ان کی تین اولادیں تھیں مرزا اکبر بیگ، مرزا افضل بیگ^۴ اور امیر القسام بیگم۔ مرزا غالب کی بڑی بہن چھوٹی خانم (شاید غالب کی والدہ کو بڑی خانم کہہ کر پکارا جاتا ہوگا) کی شادی انھیں مرزا بیون بیگ کے بڑے صاحبزادے مرزا اکبر بیگ سے ہوئی۔ ان کے بہن سے تین صاحبزادے مرزا عاشور بیگ، مرزا عباس بیگ، مرزا جو ابو علی بیگ عرف مرزا مغل بیگ اور ایک صاحبزادی لمانی خانم پیدا ہوئیں۔ اس مضمون کا موضوع مرزا اکبر بیگ کے بھٹے صاحبزادے اور مرزا غالب کے بھٹے بھانجے مرزا عباس بیگ ہیں۔ ان کی تارخِ ولادت کا علم نہیں مگر اندازہ ہے کہ مرزا عباس بیگ (جنھیں آئندہ سطور میں ہم

صرف مرزا کہہ کر نکلیں گے) ۱۸۱۲ء کے لگ بھگ دہلی میں پیدا ہوئے۔ وہ ۱۸۹۷ء میں آکسفورڈ اسٹنٹ کینسر کے عہدے سے ریٹائر ہوئے تھے۔ اگر ریچرڈ منٹ کے وقت ان کی عمر پچیس سال مان لی جائے تو ان کی ولادت کا سال ۱۸۱۲ء قرار پائے گا۔

مرزا نہایت حسین اور سرخ و سفید تھے۔ سانچے میں اعلیٰ ہوا جسم، دراز قد اور نہایت قوی الجشہ۔ گو عیاشی، رنگین مزاجی اور احباب پرستی کے سبب پڑھنے کا شوق کم تھا، تاہم ذہین تھے۔ جب انگریزی پڑھنے کا شوق پیدا ہوا تو اس قدر پڑھ لی کہ تحریر و تقریر بخوبی سراجھام دے سکتے تھے۔ فارسی کی لیاقت معمولی تھی اور عربی سے نااہل تھے۔ رنگین مزاجی کے باوصف شعر گوئی تو ایک طرف شعر صحیح پڑھ بھی نہ سکتے تھے ۵۔ صاحب "سکارنامہ سروری" کے مطابق کچھ عرصے ناصر رام چندر کے بھی شاگرد رہے تھے۔ مگر یہ قرین قیاس نہیں کیوں کہ ناصر رام چندر ۲۸ فروری ۱۸۳۳ء کو دہلی کالج میں ریاضی کے مدرس مقرر ہوئے تھے اور اس وقت ان کی عمر پچیس سال (سال ولادت ۱۸۱۲ء۔ سال وفات ۱۱/ اگست ۱۸۸۸ء) تھی جب کہ ہمارے قیاس کے مطابق مرزا تیس سال کے تھے۔ اس کے علاوہ عکسوں کی پہلی لڑائی (دسمبر ۱۸۳۵ء) کے دوران مرزا فیروز پور (پنجاب) کے کوٹوال یا تحصیل دار تھے۔ اور کئی سال پہلے دہلی چھوڑ چکے تھے۔ جس کا حال آگے آئے گا۔ ممکن ہے کبھی پرائیوٹ ٹیوشن سے پڑھا ہو۔ الغرض انگریزی تحریر و تقریر کی لیاقت پیدا کر کے مرزا وسیع ترقیہ ان کی تلاش میں رہنے لگے۔ اتفاق سے یہ موقع بھی انھیں جلد ہی مل گیا۔ ہوا یہ کہ جب ان کے حقیقی بچا مرزا افضل بیگ سفیر سلطنت مغلیہ وائسرائے سے ان امور کا تصفیہ کرانے میں ناکامیاب رہے جن کے لیے انھیں کلکتہ بھیجا گیا تھا تو انھوں نے مشہور رفاہ مرہم موہن رائے کو راجا کا خطاب دلا کر تصفیہ امور کے لیے انگلینڈ روانہ کر دیا (۱۸۳۰ء) اور خود کچھ عرصے بعد دہلی واپس آگئے۔ آتے ہوئے اپنے ساتھ ایک بنگلہ "ملتان" کو بھی لے آئے مگر بوڑھے ہو چکے تھے۔ زندگی نے مزید ساتھ نہ دیا اور انتقال کیا۔ یہ جواں سال بیٹہ مرزا کے حسن و جمال پر فریفتہ ہو گئی۔ جس کا ان کے والد ماجد مرزا اکبر بیگ نے بہت برا مانا۔ مآل کار مرزا اس عورت کو لے کر پنجاب کی طرف نکل کھڑے ہوئے ۶ اور ایک راجا کے ہاں مصاحب خاص کی حیثیت سے نوکری کر لی۔ مگر یہ نوکری جلد ہی چھوڑ دی، کیوں کہ راجا کے

دل میں اس کے مصاحبوں نے کچھ بدگمانی پیدا کر دی تھی جو اگرچہ بعد میں غلط فہمی تاہم مرزا نے وہاں رہنا گوارا نہ کیا۔

وہاں سے سبکدوش ہو کر مرزا انگریزی عملداری میں سٹیج کے اس پار لدھیانہ اور فیروزپور کے نواح میں پہنچے جہاں ان کی انگریزی سے واقفیت خاندانی اور ذاتی وجہات و محنت کام آئی اور سرہنری لارنس نے متاثر ہو کر ان کو ”کووال شہر“ (شاید فیروزپور) مقرر کر دیا۔ اس کے بعد کا حال ان کے بچپن کے آخری ایک مہینے ”کارنامہ سروری“ سے سنیے^۹۔

”چچا (مرزا عباس بیگ مرحوم) بیان کرتے تھے کہ سرہنری ایک وحشی مزاج نگر اور اے فرض منہمی میں از حد پابند قواعد اور اپنے مانت اعمال کے رفتار کردار کا نگران تھا۔ ایک روز مرزا بازار میں ایک دکان دار سے کسی امر پر برسر حساب تھے اور خد مت گار ان پر چھتری لگائے ہوئے تھے کہ سرہنری لاسر سے کبھی پر نکلا۔۔۔ اور کہاں دل نواب صاحب ہم تم پر چھتری لگائے گا۔ مرزا اکڑ کر آگے ہو لیے۔ سرہنری نے۔۔۔ ان کو کوٹھی پر حاضر ہونے کا حکم دیا۔۔۔ کوٹھی پر بھی انھوں نے جواب ترکی پہ ترکی دیا۔ ان کی دلیری اور صاف گوئی پر ہنری نے بجائے سزا تنخواہ میں اضافہ کر دیا۔

ایک روز۔۔۔ سرہنری ان کو اپنے ساتھ لے گئے راستے میں ایک جمیل پایاب واقع تھی۔ سرہنری اس وقت۔۔۔ افہام و تفہیم کر رہا تھا۔ مرزا نے۔۔۔ اختلاف رائے کیا۔ کبھی سچ جمیل میں پہنچ گئی تھی۔ سرہنری نے غصہ میں آکر ان کو گاڑی سے اتر جانے کا حکم دیا۔ یہ بھی پانی میں کود پڑے۔ ان کی یہ حرکت بھی مفید ثابت ہوئی اور فیروزپور کے تحصیل دار مقرر ہو گئے۔ یہاں بھی انھوں نے سیکھوں کے مقابلے میں بڑی خیر خواہیاں کیں اور جنرل ایٹ ”اڑھی کو میداں جنگ سے اٹھالائے۔“

اس کے بعد سرہنری لارنس کے دل میں مرزا کی عزت یہاں تک بڑھ گئی کہ ہندوستانی افسروں کے علاوہ انگریز افسر بھی حسد کرنے لگے۔ اور مدد ملی میں مرزا کے اہل خانہ ان بھی ان سے سخت ہراس میں تھے۔ سو ان کے بھائی مرزا مظفر بیگ اور بہن امانی خانم (غالب کا چھوٹا بھانجہ اور بھانجی) کے کوئی دن سے بات تک کرنا گوارا نہ کرتا تھا^{۱۲}۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ کل خانہ دہلی جاگیریں "بوجہ عدم ثبوت و اختلاف استدلال سرکار میں ضبط ہو گئی تھیں اور مرزا عباس بیگ نے اس سلسلے میں قلعہ آغاقل پر تاقا"^{۱۳}۔

مرزا اپنے عہد اور رسوخ کے نقشے میں کچھ ایسے چور ہوئے کہ شرافت کی تمام حدیں چھاند گئے۔ رشوت خوری کا یہ عالم تھا کہ (بقول خود) آٹھ آنے بھی قبول کر لیتے تھے۔ اسی طرح بہت سی دولت قواکشا کر لی مگر بے شمار دشمن بھی پیدا کر لیے۔

انھیں ایام میں جب کہ مرزا مظفر بیگ اور امانی خانم ان سے ملنے فیروز پور آئے ہوئے تھے۔ ایک ہمایہ ایک چھو کر لی کو لایا اور کہا کہ آپ اس چھو کر لی کو رکھ لیں میں دو تین روز کے لیے باہر جاتا ہوں اور آکر اپنی چھو کر لی کو لے جاؤں گا۔ مرزا خود کچھری میں تھے۔ مرزا مظفر بیگ سمجھے یہ مرزا کا کوئی بے تکلف دوست ہے انھوں نے چھو کر لی کو اندر رناتے میں بھجوا دیا۔ وہ شخص تو چلا گیا مگر سازش کے مطابق پوسٹ آں پہنچی اور چھو کر لی کو برآمد کر کے لے گئی۔ ڈپٹی کمشنر موقع کا منتظر تھا۔ اس نے فوراً مرزا پر پردہ فردوسی کا مقدمہ کھڑا کر کے انھیں معطل کر دیا۔ اس مقدمے نے اتنا طول کھینچا کہ مرزا کی تمام پونجی صرف ہو گئی۔ حتیٰ کہ وارنٹ گرفتاری جاری ہو گیا^{۱۴}۔ جموز ایٹ اس وقت (۱۸۵۷ء) انگریزوں کے پالیٹیکل

ایڈوائزر کے طور پر ملتان کے علاقے میں متعین تھا۔ مرزا ابیس بدل کراؤنٹ پر سوار ہو کر چھپتے چھپاتے رات کو ایٹ کے پاس پہنچے اور کل ماجرا بیان کیا۔ سمجھتا تھا کہ اس کو ساتھ لے کر ڈاک گاڑی سے لاہور پہنچا اور سرہنری لارنس^{۱۵} ریڈیٹنٹ پنجاب سے ملا جو خود بھی مرزا کا بڑا مددگار اور خیر خواہ تھا۔ چنانچہ وارنٹ کی منسوخی کا حکم جاری ہوا اور اس نے مرزا کو واپس منسل^{۱۵} صاحب کے محلہ ہندوستان میں خدمت عطا کر دی۔

پنجاب کے انگریزی ایڈمنسٹریٹیشن میں اس وقت دو بھائی لارنس اور جان لارنس

مستند ترین شخصیتیں تھیں۔ جان لارنس ٹکوار کے زور سے حکومت کرتا چاہتے تھے اور بہتری لارنس عوام کی رائے سے۔ دونوں بھائیوں نے ایک ساتھ استعفیٰ دے دیا تاکہ لارڈ ڈلبوڈی ان دونوں میں سے جس کا چاہے پنجاب میں تقرر کر دے۔ ظاہر ہے ڈلبوڈی ایسا جان لارنس ہی کو پسند کرتا۔ اس طرح سر بہتری لارنس کو پنجاب چھوڑنا پڑا اور وہ وہاں سے اودھ آگیا۔ مرزا بھی سر بہتری کے ساتھ ہی چلے آئے اور بدستور تحصیل داری کی خدمات انجام دیتے رہے۔ چنانچہ کارنامہ سر دوری (ص ۵۳) سے اطلاع ملتی ہے کہ وہ ۱۸۵۷ء یعنی ”کیام ندر“ میں ملاچر کے تحصیل دار تھے۔ ”بپ“ ”بانی“ سپاہیوں نے اس تحصیل پر حملہ کیا تو انھوں نے بڑی بہادری سے خزانے کو لوٹرام^{۱۶} کے پاس روانہ کر دیا اور خود پایادوہ بھیجیں بدل کر جنگل جنگل چھپے ہوئے بلگرام پہنچ گئے۔ اہل بلگرام نے انھیں اپنے ہاں پناہ دی^{۱۷}۔ تاہم یہاں وہ کر بھی مرزا نے انگریزوں سے باقاعدہ خط و کتابت جاری رکھی اور ”ہانفیوں“ کی حرکات و سکنات سے ان کو براہر مطلع کرتے رہے۔ یہاں سے انھیں فرخ آباد بھیجا گیا۔ معلوم ہوتا ہے یہ واقعہ ”ندر“ فروہ ہونے کے بعد کا ہے اور ”ندر“ کے دوران انگریزوں سے وفاداری کے صلے میں فرخ آباد میں بحیثیت ڈپٹی کلکٹر ان کا تقرر ہوا تھا۔ پھر جلد ہی خیر خواہی سرکار میں لارڈ کیننگ نے علاقہ بڑاگنوں کی جاگیر انھیں عطا کی اور چھ سو روپیہ ماہوار پر آکسٹرا اسٹنٹ کسٹمر مقرر کر کے بیٹھاپور منتقل کر دیا^{۱۸}۔

اس کے بعد یعنی ملازمت سے ریٹائرمنٹ (۱۸۶۷ء) تک کے حالات بڑی حد تک پردہ خفا میں تاہم مرزا غالب کے خطوط اور دوسرے ماخذوں سے جو کچھ معلوم کیا جاسکتا ہے وہ یہاں پیش کیا جاتا ہے۔

قتل و فساد فرد ہو جانے کے بعد جب صوبہ اودھ کی خلع بندی ہوئی تو بلگرام کو ہر دوئی خلع میں شامل کر لیا گیا۔ چنانچہ چند سال بیٹھاپور میں رہنے کے بعد مرزا کا جاولہ (۱۸۶۳ء) کے آخر میں پاشروغ (۱۸۶۳ء) میں ہر دوئی ہو گیا۔ غالب ندر بلگرامی کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

”بر خوردار مرزا عباس کی بدلی کی خبر میں نے پہلے ہی سنی ہے مگر یہ نہیں معلوم تھا کہ وہ کہاں گئے۔ اب دریافت ہوا کہ تھمارے ہمسائے

میں آئے ہیں۔ اب ان سے ملنے خدا ان کو مروت کی توفیق دے۔“

قدر کے نام دوسرے خطوں سے بہ آسانی اندازہ ہوتا ہے کہ یہ خط آخر ۱۸۶۲ء یا شروع ۱۸۶۳ء کا لکھا ہوا ہے اور قیاس چاہتا ہے کہ بلگرام ہی کو بھیجا گیا تھا۔ یہاں مرزا نے قدر کو صاحب خلیج سے سفارش کر کے ہر دوئی اسکول میں مدرس فارسی کر لیا۔ قدر بلکرای بہ مرزا کی مہربانیاں آئندہ بھی جاری رہیں۔ اس کی شروعات غالب کے ایک گم شدہ سفارشی خط سے ہوئی جس کے ثبوت میں غالب کا خط بنام قدر (محررہ ۱۸۶۰ء) پیش کیا جاسکتا ہے:

”برخوردار مرزا عباس کو دوبارہ تحریر کی حاجت نہیں اگر وہ سعادت

مند ہیں تو وہی ایک خط کافی ہے۔“ (خطوط غالب۔ لا: مہر، ص ۵۳۹)

قدر بلکرای کے نام غالب کا خط ”محررہ صبح یکشنبہ ۳ رمضان۔ ۱۲۲۲ فروری سال حال

(۱۲۷۹ھ مطابق ۱۸۶۳ء) ہم ہے۔ لکھا ہے:

”..... مرزا عباس میری حقیقی بہن کا بیٹا ہے تو پھر میں مرزا کی اولاد کا

بھائی کیوں کر بناؤ؟ مرزا کی بی بی میری بہن ہے بیٹی نہیں تم نے جو لکھا ہے

کہ میرے نواسے کی شادی ہے کیا سمجھ کے لکھا؟ میں مرزا کی اولاد کا

بھائی کیوں کر بناؤ؟ بھائی کی اولاد پوچھا جاتی ہے نہ نواسا نواسی۔۔۔ مرزا کی

استدعا سے قطع نظر میرا دل بھی تو پتھر لوہے کا نہیں جو اپنے بچوں کو

دیکھنے کو نہ چاہے۔ ایک بہن اس کی مجموع اولاد وہاں، میرا تو وہ خانہ باغ

ہے۔“.....

پہلے ”ایک بہن اس کی مجموع اولاد وہاں“ کی تشریح سن لیجئے۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا

ہے۔ چھوٹی خانم کے تین لڑکے تھے۔ یعنی مرزا عباس بیگ کے علاوہ ان کے بڑے بھائی مرزا

عاشور بیگ جو اپنے لڑکے احمد بیگ کے ساتھ ”قدر“ میں شہید کر دیے گئے تھے اور چھوٹے

بھائی مرزا جو ابو علی بیگ عرف مرزا مغل بیگ جو ۱۸۵۷ء کی اور کی شورش میں مع اہل و عیال

ٹکالے گئے تھے۔ یہ تمام افراد نیز مرزا عاشور بیگ مرحوم کی بیوی^۹ اور بچے مرزا عباس بیگ کے

پاس ہی رہنے لگے تھے^{۱۰}۔ شاید صاحبزادی (مرزا کی بہن) امانی بیگم کی اولاد میں سے بھی چند

لوگ وہاں موجود تھے۔ غالب نے اسی لیے کہا ہے کہ چھوٹی خانم کی ”مجموع اولاد وہاں رہ

رہی ہے۔

اب خط کے اس جملے ”میرے نواسے کی شادی ہے“ پر غور کیجئے۔ ہمیں محمد رفیع الدین بیک وحشی ابن عاشور بیک مناجاتی، برادر زادہ مرزا عباس بیک کے دیوان ”غزلیات وحشی“ میں دیے ہوئے شجرہ نسب (مس ۷) سے خبر ملتی ہے کہ مرزا کی اولاد میں صرف ایک لڑکی تھی۔ (گود لیا ہوا لڑکا ۱۸۶۳ء میں محض چار سال کا تھا۔ لہذا اس کی شادی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اولاد سے متعلق تفصیلات آگے آئیں گی) اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ خط کے اس جملے ”میرے نواسے“ کی شادی ہے کہ میری نواسی کی شادی سے چڑھنا چاہیے۔ اتفاق سے خطوط غالب کے تمام مرتبین نے یہ غلطی دہرائی ہے۔ حالانکہ ۲۴ نومبر ۱۸۶۳ء کا خط سال بنی کی شادی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ ملاحظہ ہو:

”..... یہ (مرزا عباس بیک) اپنے والدین کے خاندان کا فخر ہے اور چوں کہ اس کی ماں کا اور میرا لہو اور گوشت اور ہڈی اور قوم اور ذات ایک ہے پس وہ فخر میری طرف بھی عائد ہوتا ہے۔ وہ مرزا عباس بیک اپنے بچے میں کہتا ہو گا کہ ماموں میری بیٹی کے بیلہ میں نہ آیا اور صرف درو سے بنی چہ لیا.....“

چند سال ہر دوئی میں رہنے کے بعد مرزا ۱۸۶۷ء میں یا اس سے پہلے اسی عہد سے پر یعنی آکسفورڈ اسٹنٹ کشنر کے طور پر لکھنؤ میں تبدیل ہو گئے۔ ۱۸۶۷ء میں ان کا لکھنؤ میں ہونا ثابت ہے۔ اس سلسلے کا ایک خط غالب بنام قدرد بکرای دیکھیے:

”تم قدرد اور نور چشم مرزا عباس قدرد والد۔ خاطر جمع رکھو۔ نوکری تمھاری ہو جائے گی۔ صاحب کی اور راجا کی تقریب کے قصیدے واقعی گل و ستے ہیں مگر مرزا کی مدح کے قصیدے کو گل و ستہ نہ کہو یہ تو ایک بانغ ہے سر سبز و شاداب جس میں نگین ہزار در ہزار ہو اولاد درخت بے شمار زمین سرسبز و زار۔ بہت خوش بہت خیر، مثی نظر نہیں آتی۔ سبز دیا لہریں، فقیر غالب تمھارا خیر خواہ اور تمھارے

ممدوح کا دعا گو ۲۲ ہے۔

صاحب سے مراد ولیم ویٹ فورڈ ڈائریکٹر تعلیمات اودھ اور راجا سے مہاراجا مان سنگھ
تاج جنگ ہے۔ یہ قصیدے کلیات قدّر میں موجود ہیں۔ جو قصیدہ مرزا کی شان میں ہے اس کا
نام گلِ عباس ہے۔ کل اشعار ۱۵۱ ہیں۔ سر قصیدہ یہ عبارت ہے ”ممدوح ڈپٹی ۲۳ مرزا عباس
بیک خان بہادر اکثر اسٹنٹ کمشنر لکھنؤ۔۔۔“ قصیدہ کا آخری شعر یہ ہے:

”گلِ عباس“ رکھتا ہم نے اس قصیدے کا

کریں تا میرزا عباس بن کن کر ذرا افتخانی

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مرزا ۱۲۸۴ھ یعنی ۱۸۶۷ء میں لکھنؤ میں ایکٹر اسٹنٹ
کمشنر تھے۔ مگر یہی سال فن کی ملازمت کا بھی آخری سال معلوم ہوتا ہے۔ وہ ۱۸۶۷ء کے
آخر میں پنشن پر رٹائر ہو گئے۔ ”کلیات قدّر“ (مسحورہ المصنف) میں یہ جملہ دیکھیے:
”..... (مرزا عباس بیک) صاحب پنشن پا کر لکھنؤ میں کالج شروع
(کیننگ کالج) کے ممبر بن گئے تھے۔۔۔“

اور کیننگ کالج کا قیام نومبر ۱۸۶۷ء میں عمل میں آیا تھا۔ چھائی شروع ہی سے جاری
تھی مگر عمارت کے مکمل ہونے میں گیارہ سال لگے اور وہ ۱۸۷۸ء میں تیار ہوئی۔ تاریخی
قطرہ جس کے ہر مصرع سے تاریخ (۱۸۷۸ء) نکلتی ہے قدّر بکرا ہی نے کہا۔ یہ کلیات قدّر
(۲۳۹) میں موجود ہے۔ کل اشعار چودہ ہیں۔ ان میں سے چند اشعار جو تاریخی شواہد کی
حیثیت رکھتے ہیں۔ نقل کیے جاتے ہیں:

کو نہ جزل عالی روش لارنس ۲۴ صاحب نے

بعد و جد کل اشعار سو سز سہ نومبر میں

قوی ذالی بنائے خیر خود کیننگ کالج میں

مگر سب سکندر جس طرح وقت سکندر میں

عمارت بن چلی وہ پختہ پختہ بن گیا کالج

زمان بدل در دھندل سر جارج کوہ میں

نئی دل سر مہاراجہ بہادر مصنف لائق
 ہے نہ پائے شجاعت و گنجے سنگھ اسم دفتر میں
 ہائیوں بہرہ فانی میرزا عباس خان صاحب
 ہیں سرکاری یہ ممبر عمر و افش جملہ ممبر میں
 ☆☆☆

کمل نظم وہ نکلی ہے قدر بکراہی نے
 ہیں سال عیسوی مقصود ہر اک مصرعہ تر میں
 ☆☆☆

سرور الدولہ آغا مرزا بیک مصنف "کارنامہ سروری" نے مئی ۱۸۷۲ء پر عمر ۲۴ سال
 اپنے عم یزد گوار مرزا عباس بیک کی اجازت سے لکھنؤ کو خیر باد کہا^{۲۵}۔ اور علامہ حیدر آباد
 ہوا۔ اب اس کے چند بیان متعلقہ کالج ملاحظہ کیجئے اور یہ حقیقت سامنے رکھیے کہ ہر بیان مئی
 ۱۸۷۲ء کے پہلے کا ہے:

(الف) "اسی زمانے میں جب کہ کیننگ کالج قائم ہوا جنرل ۲۶ سیر و چیف
 کنشز اودھ نے مرزا عباس بیک اور بابو دکنار نجن کمر جی کو اپنے ہم
 رائے کر کے قیصر باغ میں تعلقہ داران و امراء اودھ کی تعلیم کے
 واسطے ایک خاص تعلیم خانہ قائم کیا جس کا نام دارالانشی فیو شن رکھا گیا
 اور تعلیم خانہ کیننگ کالج کی ایک شاخ مقرر کیا گیا..... (اس میں) مع
 راقم و محمود بیک و خدا داد بیک، رفیع الدین بیک ہم کوئی ۱۸ طلباء
 تھے۔ بابو اندالال رائے بہادرے کورنر اور دکنار نجن کور عم مرحوم
 (مرزا عباس بیک) و وزیر یعنی گران کار نامہ ہوئے..... تعلیمات
 میں سب طلباء اپنے اپنے علاقوں پر چلے جاتے تھے ہم چار چوں کہ
 مقیم لکھنؤ تھے۔ ہر روز شام کو بچا صاحب مرحوم (مرزا عباس
 بیک) کے ساتھ کھانا کھا کر فوراً واپس جاتے تھے۔ دن کا کھانا
 (مرزا عباس بیک کے) گھر سے آجاتا تھا۔"

(کارنامہ سروری ص ۳۳-۳۴)

(ب) لکھنؤ میں جب ان (مرزا عباس بیگ) کا قیام ہوا تو جنرل چر و چیف کاشنر یعنی اسیر ملک اودھ اور مہاراجہ مان سنگھ قائم جنگ صدر الصدور تعلقہ داران اودھ تھے۔ ان تینوں کی رائے سے کیننگ کا لُج اور..... دارڈانشی ٹیوٹن قائم ہوا..... (اور) مجلس تعلقہ داران اودھ قائم کی گئی جس کے صدر..... مہاراجہ مان سنگھ..... قرار پائے اور بابو دکنار نجن معتقد یعنی سکریٹری تاحر د ہوئے۔ جب مرزا (عباس بیگ) نے پٹن لیا تو بعد میں دکنار نجن بہ خود سکریٹری بنائے گئے..... کا لُج قائم ہوتے وقت تعلقہ داران کا ایک جلسہ شوریٰ منعقد ہوا جس کے صدر خود کاشنر اودھ اور نائب الصدور مہاراجہ اور معتقد مرزا (عباس بیگ) تھے۔

(کارنامہ سروری۔ ص ۵۴)

مندرجہ بالا سے یہ قیاس کرنا غلط نہ ہو گا کہ مرزا ۱۸۶۷ء سے پہلے لکھنؤ میں بطور کاشنر اسسٹنٹ کاشنر متعین ہو چکے تھے اور کہ کیننگ کا لُج کی تجویز ۱۸۶۶ء یا ۱۸۶۷ء میں مکمل ہوئی جس میں شروع ہی سے مرزا، چیف کاشنر آف اودھ کے صلاح کار رہے۔ ۱۸۶۷ء ہی میں جب کا لُج قائم ہوا تو مرزا رنار ہو چکے تھے اور اس کے پہلے جلسہ شوریٰ میں انھوں نے معتقد یعنی سکریٹری کے فرائض انجام دیے۔ جب کہ پیر داس کے صدر اور مہاراجہ مان سنگھ قائم جنگ نائب صدر تھے۔ مندرجہ بالا سے یہ بھی ثابت ہے کہ قیام کا لُج (۱۸۶۷ء) سے کا لُج کی عمارت کی تعمیر کے اختتام (۱۸۷۸ء) تک مرزا کا لُج کی مجلس شوریٰ کے خاص رکن رہے۔ خیال کیا ہے کہ وہ آخر تک کا لُج سے وابستہ رہے ہوں گے۔

مرزا نے تقریباً ۶۷ سال کی عمر پر کرکٹھنہ جمادی الاول ۱۲۹۶ھ (۱۸۷۹ء) کو لکھنؤ میں انتقال کیا ۲۸۔ قدر بگڑائی کے کلیات قدر (ص ۳۵۲-۳۵۳) میں ایک قطعہ اور ایک رباعی ملتی ہے۔

تاریخ وفات ڈپٹی مرزا عباس بیگ خان بہادر دہلوی

یہ بھائی الوداعی یکشنبہ و وہم شب آفتاب کے برہیں پہ فشرہ دے
یعنی بمرور ڈپٹی عباس بیگ خاں ہے ہے گلے بہاؤ لادت فشرہ دے
برخراہ قدر مویہ تاریخ ہجریش عباس بیگ خان بہادر بمرور دے

۱۲۹۶ھ

دلہ رباغی

گور عباس جاں فزا شد اے دل از ہم بگر قدر پیا شد اے دل
خاموش کتابہ در مسکئی سال است شاید کہ چنگ خطہ پاشد اے دل
”ہے ہے گلے بہاؤ لادت فشرہ“ اور ”شاید کہ چنگ خفتہ پاشد“ سے جو تصویر پیدا ہوتی
ہے اسے غلام حسین قدر بگرای نے مدتوں اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ اگرچہ مرزا نے اس
وقت کے اسمروں کی طرح انگریزی حکام کی دل و جان سے مدد کی اور اطاعت گزار رہے تاہم
ان میں ایک فطری خودداری و تمکنت بھی تھی جو ہمیشہ لادت اور رعب داب میں اضافے کا
باعث بنتی رہی۔

جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں مرزا کی اپنی اولاد صرف ایک لڑکی تھی۔ جس کی شادی
۱۸۶۳ء میں ہوئی تھی۔ جس سے متعلق ہم غالب کے دو خطوط بھی پیش کر چکے ہیں۔ شادی
کس کے ساتھ ہوئی؟^{۲۹} اور صاحبزادی کا سال ولادت کیا ہے۔ ہمیں کچھ معلوم نہیں۔

۱۸۳۵ء سے ۱۸۵۰ء تک یا کوئی اور سال کچھ بھی قیاس کیا جاسکتا ہے۔ اولاد فرید چوں کہ
نہیں تھی اس لیے مرزا نے اپنے بھائی مغل بیگ کے ایک بیٹے مرزا فیاض بیگ کو گود لے لیا
تھا۔ یہ داستان فیاض بیگ کے بھائی آغا مرزا بیگ مصطفیٰ ”کارنامہ سردری“ (ص ۱۸) سے
سنیے جو فیاض بیگ سے گیارہ سال بڑا تھا:

”چچا صاحب (مرزا عباس بیگ) مرحوم نے کہ اولاد فرید نہ رکھتے
تھے ایک روز والد (مغل بیگ) مرحوم سے کہا کہ اب جو بچہ تمہارے
یہاں پیدا ہو مجھ کو اس طرح دے دو کہ پھر اس سے کچھ تعلق نہ

رکھو..... الغرض فیاض بیگ مرحوم پیدا ہوا اور بچانے اس کو اپنی
فرزندگی میں لے لیا۔“

فیاض بیگ ۱۸۵۹ء میں سیٹاپور میں پیدا ہوئے۔^{۳۰} قدر بگڑائی نے تاریخ بھی۔ قلعہ
چار شعر کا ہے۔ پہلا اور آخری شعر دیے جاتے ہیں:

خان ذی رتبہ و ذی عوصلہ مرزا عباس
پسرے نام خدا یافتہ عالی نے
بگڑاں غنچہ ”تاریخ ولادت اے قدر
برومید اس گل عباس ز نخل عجمے

۱۲۷۶ھ

یادہ تاریخ نہایت بر محل ہے اور فیاض بیگ کے مستطی ہونے کی طرف صاف اشارہ
کرتا ہے۔

فیاض بیگ کی شادی ۱۸۷۷ء میں لکھنؤ میں ہوئی۔ ”تاریخ گود خدائی..... بطریق سہرا“
قدر نے کہی جس کا ہر مصرع تاریخی ہے۔ قدر اس وقت کھنگ کالج میں ملازم تھے۔ گل
اشعار تو ہیں صرف چار شعر دیے جاتے ہیں:

حلقہ شوق ہے یہ ہاتھ میں سگلتا دلخواہ
دامن حسن ہے فیاض کا سر پر سہرا
جس نے دیکھا نہ ہو خورشید زمین کرتوں میں
دیکھے ان کا رخ نایاب چٹا کر سہرا
تاج ہے روشنی الفت مرزا عباس
دامن گل نعلدار ولادہ سہرا
ایک اک مصرع تاریخی مسکئی سے طا
کہیں اس زور کا اے قدر سخور سہرا
(کلیات قدر۔ ص ۳۳۸)

۱۸۵۷ء کی لڑائی کے بعد تعلق دارالہند و مسلمان اور ہندو دونوں کو خاص قانون کے

تحت مسئلے لینے کا اختیار مل گیا تھا۔ اسی بناء پر مرزا نے فیاض بیگ کو ۱۸۵۹ء میں کودلیا تھا اور لازمی قوائد علاقہ بڑاگلاس کی جاگیر کا وارث اسی کو بنایا تھا^{۳۱}۔ فیاض بیگ نے مین جولائی میں ۷ مئی ۱۸۸۲ء کو انتقال کیا۔

مرزا ابھی پنجاب ہی میں تھے کہ انھوں نے اپنے اہل خاندان کے برخلاف اپنا مذہب تبدیل کر لیا یعنی وہ سنی سے شیعہ ہو گئے۔ کہتے ہیں کہ ایک شب انھوں نے خواب دیکھا کہ ایک چھینکے میں ایک سر بریدہ رکھا ہوا ہے اور ان سے کہتا ہے کہ تم اہل بیت سے محبت رکھو^{۳۲}۔ برسوں بعد جب وہ پنجاب سے لکھنؤ آئے تو مشہور مرثیہ گو دیر لکھنوی ابھی زندہ تھے۔ انھیں دیکھ کر مرزا کو فوراً یاد آیا کہ وہ سر بریدہ جو خواب میں انھوں نے چھینکے میں رکھا دیکھا تھا ہم شکل دیر تھا۔ اس کے بعد تمام عمر مرزا کنڑ شیعہ رہے جس کا ثبوت کئی ماخذوں سے بہ آسانی مل جاتا ہے^{۳۳}۔

مرزا ملازمت کے آخری ایام میں اور ریٹائرمنٹ کے بعد لکھنؤ ہی میں مستقل طور پر رہے اور وہیں آخری سانس لی۔ ہمیں ان کی جائے قیام سے متعلق دو اندراج ملتے ہیں۔ مرزا فرحت اللہ بیگ نے رسالہ اردو اپریل ۱۹۲۱ء، ص ۲۵۱ کے حاشیے میں لکھا ہے۔
 ”یہ جگہ ڈپٹی عباس بیگ صاحب کی اس کوٹھی میں ہوا تھا۔ جو قیصر باغ کے دروازے کے بالکل سامنے تھی اور اب محمد محمد اکرم سڑک میں آگئی ہے۔“

ادنیٰ مخلوط غالب میں مرزا محمد عسکری نے بھی تقریباً یہی لکھا ہے۔ ”..... ان (ڈپٹی عباس بیگ) کی کوٹھی روشن الدولہ کی کوٹھی کے سامنے واقع تھی جو ابھی حال ہی میں محمدی ہے۔“

قدّر بکرای کے اس قصیدے میں بھی جو انھوں نے ۱۸۶۷ء میں ”گل عباس“ کے نام سے لکھا تھا مرزا کی کوٹھی، ان کی فیاضی اور ان کے مذہب سے متعلق اشارے ملتے ہیں۔
 (کلیات قدّر۔ ص ۵۵-۵۶)

کہیں نہری کہیں گلشن پھر آگے ہے دی کوٹھی
 جو ہے جنت بڑی تھہلا نہاد کی جانی

رفیع الدرجہ رامت پست جس سے امت حاتم
 وسیع الدرجہ وسعت تنگ جس سے عزم سلطانی
 بھی اتنی دلہن بھی منہ چھائے جس سے گھونگھٹ میں
 ہزاروں کرسیاں میزیں چلو قصہ ہے طو لانی
 امیر وقت ٹپٹی میرزا عباس خاں صاحب
 کہ جس کی ذات ہے عزت وہ نوابی و خانی
 سخی ایسا کبھی رہنے نہ پائے گانٹھ میں پیسا
 جو کچھ پائے بہالے جائے اس کا جوش فیضانی
 غم شبیر کے نشے میں یہ مدہوش رہتا ہے
 نہ آئے ہوش میں آنکھیں نہ چھڑکیں جب تلک پانی

☆☆☆

مرزا کے حسن و جمال، رنگین مزاجی اور عجب داب کے قصے تو سن چکے مگر ان کی کوئی
 تصویر ہمارے علم میں نہیں۔ ایک تصویر مرزا فرحت اللہ بیگ کے خاندان میں ۱۹۳۱ء تک
 موجود تھی۔ اب معلوم نہیں ہے کہ نہیں۔ یہ تصویر باقوسی دانت کی بنی ہوئی تھی اور خواجہ
 بدرالدین عرف خواجہ لان نے بنائی تھی۔ (رسالہ اردو، ۱۹۳۱ء، ص ۲۳۹)
 اب ہم دہلی میں ان تمام باتوں کو اکٹھا کر رہے ہیں جو ہمارے خیال میں مرزا کے کیر کئر
 اور ان کے مقام کو سمجھنے میں مدد دیتی ہیں۔

اقتباسات از ”اردو“ اپریل ۱۹۳۱ء

خواجہ بدرالدین خاں عرف خواجہ لان مرحوم و مغفور۔ از مرزا فرحت اللہ بیگ۔
 ۱۔۔۔ (لکھنؤ) کے چند رئیسوں نے خواجہ لان کے بھائی ذیابی عباس بیگ
 مرحوم سے کہا کہ ہمیں کسی طرح خواجہ صاحب کا ستار سنوا دو اور
 اگر ممکن ہو تو یہاں کے استادوں سے ان کا مقابلہ بھی کر لو۔ مرزا
 عباس بیگ نے ترکیب یہ کی کہ ایک جلسہ کر کے لکھنؤ کے رؤسا

شہر کو نہ ہو کیا اور اس میں وہاں کے چارپانچ مشہور استادانِ ستار کو بھی بلوایا۔ خواجہ امان مرحوم وہیں تھے۔۔۔۔۔ استادانِ فن نے کمالات دکھانے شروع کیے۔۔۔۔۔ خواجہ صاحب۔۔۔۔۔ کہنے لگے میاں عباس لاؤ ہم بھی بجائیں۔۔۔۔۔ مگر۔۔۔۔۔ ہم اکیلے نہیں بجائیں گے۔۔۔۔۔ غرض ستار لایا گیا۔ انھوں نے ایک چیز پھینری دوسروں نے ساتھ دیا۔۔۔۔۔ ساجد بیگ (سرور الدولہ آغا سردا بیگ کے بھائی) مرحوم کہا کرتے تھے کہ چچا خواجہ امان کا ستار۔۔۔۔۔ سن کر۔۔۔۔۔ جلسہ کی یہ کیفیت تھی کہ گویا جینی کی سورتیں دم بخود بیٹھی ہیں۔ (ص ۲۵۰)

۲۔ ڈپٹی عباس بیگ مرحوم کے پاس (خواجہ امان) اکثر لکھو چلایا کرتے تھے۔ لکھو کی مشہور طوائف مشتری جان کا تو یہ حال تھا کہ لاوحر اس نے سنا کہ خواجہ صاحب آئے ہوئے ہیں اور لاوحر شام کو وہ بن بلائے آ موجود ہوئی۔ یہ ستار لے کر بیٹھے اور اس نے نیچے سروں میں گانا شروع کیا کوئی دو گھنٹے تک یہی صحبت گرم رہی۔ انھوں نے ستار دکھا اور وہ سلام کر کے رخصت ہوئی۔ جب تک یہ لکھو میں رہتے ممکن نہیں تھا کہ شام کو مشتری کو ٹھہی پر نہ آ جاتی ہو۔ (ص ۲۵۳)

اقتباسات از ”کارنامہ سردری“

۳۔ اس ہی زمانے (تقریباً ۱۸۷۰ء) میں سید حسن بگلرانی (نواب عماد الملک) کالج میں لاوہ پایو کیوب چنرو پایو کاندھلری و بیلی درجوں کے لیے مقرر ہوئے۔ چون کہ اس وقت ملک مسلمانوں میں بی اے پاس بہت کم تھے۔ سید صاحب کی قدر میرے چچا سردا عباس بیگ بہت کرتے تھے۔ اس وجہ سے بھی کہ ان کے چچا ترائو نندو سے قبل نواب ضیاء الدین خان، نواب امین الدین خان و خٹس الدین خاں۔۔۔۔۔ کی تعلیم کے لیے ایک ہی جگہ ملازم تھے۔۔۔۔۔ (ص ۲۷)

۴۔۔۔ پنجاب (تقریباً ۱۸۸۳ء) میں ایک فقیر نے ان (مرزا عباس بیگ) کو ایک نقش دست غیب کا بھٹا اور ان کا قول تھا کہ کل دنیاوی کامیابی ان کو اس نقش کی بدولت حاصل ہوئی تازبات و قات یہ نقش دو بعد نماز ظہرین لکھا کرتے تھے ۳۳۔ (ص ۵۲)

۵۔ صالچ (کیننگ) کا تخم ہوتے وقت (۱۸۶۷ء) ایک جلسہ شور کی منعقد ہوا جس کے صدر۔۔۔ کشنر اودھ اور نائب صدر مہاراجہ مان سنگھ (کا تخم جنگ) اور معتقد مرزا تھے۔ اس جلسے میں۔۔۔ اس امر پر بھی بحث ہوئی کہ مدرسہ قرار پائے پا کا لچ اور ابتدا اہیہ ماسٹر مقرر ہو یا پرنسپل۔۔۔ مرزا نے اس پر پرنسپل کی دی۔ مہاراجہ نے طر کیا کہ ہاں مرزا صاحب آپ کے بچے (یعنی بھتیجے وغیرہ) اس میں پڑھتے ہیں اس واسطے آپ نے یہ رائے دی ہے۔ مرزا کہ تاک پر نکھی نہ بیٹھتے دیتے تھے کیا ایک جاے سے باہر ہو گئے اور جواب دیا کہ ”خود تو ایک دھوٹی بند، سورا (شورپ)، سکر (شکر) پونے والا، تو معاملات تعلیم و تربیت کو کیا سمجھے“ مہاراجہ اس مرتبہ کے آدمی تھے کہ تمام تعلقہ داران اودھ کیا ہندو کیا مسلمان مہاراجہ کی پوجا کرتے تھے۔ یہ الفاظ سن کر دنگ ہو گئے جنرل جرنل دے انگریزی میں یہ قصد کیا مرزا کیپ یور لمیٹر (Keep Your Temper) اپنے مزاج کو قابو میں رکھو۔

رضا: یہ قصد طولانی ہے مختصر یہ کہ بعد میں مہاراجہ مرزا کے گھر پہنچے۔ مرزا بہت دھم دے اور کہا ”برائے خدا اب آپ مجھ کو زیادہ خود میری آنکھوں میں حقیر نہ کیجئے اور میری گستاخی معاف کیجئے اور مجھ کو اپنا ایک لائق خدمت بناد رکھیے۔“ (ص ۵۶، ۵۵، ۵۴)

۶۔ راجہ امیر حسن خان (محمود آباد)۔۔۔ کے والد راجہ نواب علی خان (کا) خدر میں۔۔۔ انتقال ہو گیا۔۔۔ اس پر شہر بغاوت کا قاتم ہو گیا تھا۔ رانی صاحبہ محمود آباد امیر حسن خان کمن متیم کو اپنے ساتھ

(۱۸۵۸ء۔ ۱۸۵۹ء) سینا پور لے آئیں اور مرزا کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر فرمایا کہ مرزا صاحب اس حقیقہ کو آپ فرزند ہی میں لکھیے۔۔۔۔۔ مرزا نے راجہ کو آغوش میں لے لیا۔۔۔۔۔ مرزا نے بکمال کوشش ان کا علاقہ چھڑ لیا اور راجہ سرکاری دارڈ ہو گئے۔۔۔۔۔ سینہ جسے دیال تعلقہ دار بسواں نے جیل میں مجھ سے کہا کہ مرزا نے جو سلوک رائی صاحبہ (محمود آباد) کے ساتھ کیا اس کے کافیات ان کے پاس اب تک موجود ہیں۔ (ص ۵۶)

۷۔۔۔۔۔ (مرزا عباس بیگ نے) سید حسین بکرائی کو دوسرے روز مع اپنے خیمہ کے ان (میر تراب علی سالار جنگ، مختار الملک) کی خدمت میں بھیج دیا۔ نواب کو ان کے خیالات پسند آئے اور تین سو روپے حالی مشاہیرہ پر اپنے پاس ملازم رکھنا چاہا مگر چون کہ تین سو روپے یعنی ڈیڑھ سو کالج سے اور ڈیڑھ سو بیچا (مرزا عباس بیگ) مرحوم لکھنؤ، قمر ۳۵ سے دیا کرتے تھے۔ سید صاحب نے انکار کر دیا۔۔۔۔۔ (ص ۶۳)

۸۔ نواب وزارت پٹنہ (سالار جنگ) نے میرے ہم بزرگوار مرزا عباس بیگ چاکیر دار بڑا گاؤں ملک اودھ جو منجاب کور خٹت اس دربار (دلی دربار ۱۸۷۶ء۔ ۱۸۷۷ء) میں آئے ہوئے تھے کی ملاقات و قدم بوسی حضور پر نور (آصف چاہ ساس اس وقت دس گیارہ برس کی عمر تھی) سے کرائی۔ مگر جو خلعت و جو اہر نواب وزارت پٹنہ نے ان کے واسطے تجویز کیا۔ اس کو بلا اجازت سرکار (انگریزی) قبول کرنا ناممکن تھا اور اس کے واسطے ہم بزرگوار (مرزا عباس بیگ) نے کوئی طویل کارروائی مناسب نہ کی۔

۱۸۷۶ء۔ ۱۸۷۷ء کا دلی دربار ۱۸۷۷ء میں اپنے مستقلی مرزا فیاض بیگ کی شادی ۱۸۷۸ء کا چلہ ختم تغیر کیلنگ کالج شاید آخری بڑی تقریبات ہیں۔ جن میں مرزا چوری شان سے شامل تھے۔ انھوں نے ۱۸۷۹ء میں انتقال کیا۔

استدراک

۱۔ غالب نے ایک خط (تمام قدر بکھرائی) میں مرزا عباس بیگ کے نام کے ساتھ ”خان بہادر“ لکھا ہے۔

”سید صاحب۔ تم نے جو خط میں بر خوردہ کامکار مرزا عباس بیگ ”خان بہادر“ کی رعایت اور عنایت کا شکریہ ادا کیا ہے۔“
 قدر بکھرائی نے بھی مرزا عباس بیگ کے ساتھ ”خان بہادر“ کا اضافہ رواد رکھا ہے۔ (دیکھیے کلیات قدر بکھرائی ص ۵۴ اور ۳۴۸) ظاہر معلوم ہوتا ہے کہ خان بہادر کا خطاب سرکار انگریزی کا عطا کردہ ہے۔ مگر یہ درست نہیں۔ لوگوں نے انھیں ایسا کہنا شروع کر دیا تھا۔ چوں کہ خان نام کا جز ہے اس لیے ”بہادر“ کے اضافے کے معنی یہ نہیں ہو سکتے کہ انھیں ”خان بہادر“ کا سرکاری خطاب ملا ہو۔ ”بہادر“ محض تعظیم اللفظ ہے۔

۲۔ مرزا عباس بیگ کی صاحبزادی کا نام وجیہہ النساء بیگم تھا۔ شادی مرزا کے بچپن سے یعنی مرزا عاشور بیگ کے بیٹے محمود بیگ سے بیجاپور میں ہوئی مگر کوئی اولاد نہ تھی۔ (غالب نام آور ص ۱۹۶)

۳۔ مرزا کی جائے سکونت اور دیگر تعمیرات سے متعلق نام بیجاپوری لکھتے ہیں کہ انگریزوں کے تسلط (۱۸۵۷ء) کے بعد مرزا نے بیجاپور کو مستقل اپنا وطن بنالیا تھا۔ ریلوے اسٹیشن (چھوٹی لائن) کے قریب مہاراجہ پور قلعہ کی کوٹھی خرید کر اسی میں رہ بس گئے تھے۔

(غالب نام آور ص ۲۰۴)

اس کے علاوہ ایک کوٹھی قیصر باغ لکھنؤ میں بھی تھی لیکن ۱۸۵۷ء کے بعد جب قیصر باغ کا شمالی حصہ منہدم کیا گیا تو کوٹھی بھی تہہ بے ہوا ازاں انھوں نے ”روشن الدولہ“ کے چاہ جنوب اس جگہ پر جہاں اب کوٹلی قیصر باغ ہے ایک شاندار کوٹھی اور تمام بازہ

تقریر کر لیا۔ کوٹھی کا بیڑا حصہ تو کوٹوالی قیصر باغ میں آیا۔ لیکن غلط حالت میں امام بازو اب بھی موجود ہے۔ جہاں ہر سال محرم میں تعویذ داری ہوتی ہے۔ (غالب نام آورم۔ ص ۲۰۵)

۴۔ جنگ آزادی کے ۱۸۵۷ء میں نواب برہمپور کا ساتھ دینے کے جرم میں انگریزوں نے لوٹے سنگھ راجہ متولی کا بہت بڑا علاقہ ضبط کر لیا تھا اور ٹکڑے ٹکڑے کر کے اپنے خیر خواہوں میں تقسیم کر دیا تھا جس میں سے علاقہ بڑاگاؤں مرزا کو عطایت ہوا۔ ظاہر ہے کہ یہ تعلقہ بہت بڑا تو نہیں ہو سکتا تھا مگر مرزا نے اپنے تذکرہ اور فہرست سے اسے ایسا بنا دیا کہ وہ باقاعدہ تعلقہ داروں کی فہرست میں شامل کیا گیا۔

(غالب نام آورم۔ ص ۲۰۴)

۵۔ مرزا کے انتقال کے بعد یہ تعلقہ (مرزا کی تحریر کے مطابق جو انھوں نے اپنی زندگی ہی میں لکھ دی تھی) مرزا کے مستحق مرزا فیاض بیگ کی ملک قرار پایا بعد ازاں مرزا فیض حسین بیگ بن مرزا فیاض بیگ اور پھر مرزا وقار علی بیگ بن مرزا فیض حسین بیگ کی طرف منتقل ہوا جو بقول تادم بیٹا پوری (غالب نام آورم۔ ص ۲۰۶، مطبوعہ ۱۹۶۱ء) ”بقید حیات ہیں اور وقار منزل سول لائن بیتا پور میں گوشہ نشینی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔“

۶۔ سرور الدولہ آغا مرزا بیگ مصنف ”کارنامہ سروری“ نے جون ۱۹۳۳ء میں یہ مقام علی گڑھ انتقال کیا۔ لاش دہلی لائی گئی۔ ”قبر“ مہمندپور میں یعنی ایمان غالب کے قریب ہی قبرستان حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی میں ہے۔

۷۔ سید افضل حسین صاحب (حیات و تہذیب۔ ص ۳۸۹، ۳۹۰) نے بھی مرزا عباس بیگ کا تذکرہ کیا ہے، حاشیہ میں لکھا ہے ”یہ حالات کچھ میں اپنے تادم حرم سے کچھ جناب مرزا ابوج صاحب قبلہ سے سن کر لکھتا ہوں۔“

میں خود بھی ڈپٹی عباس بیگ کی خدمت میں اپنے ہاتھ مرحوم کے ساتھ بارہا گیا ہوں اور محرم کی مجلسوں میں جو ۸ بجے سے ۱۲ بجے رات تک ہوتی تھی اپنے ہاتھ کی خوش خوانی میں کبھی کبھی سلام بھی میں نے پڑھا ہے۔۔۔۔۔ "جانت کے مزید حکایات سے جو باتیں سامنے آتی ہیں وہ یہ ہیں۔

(الف) مرزا بعدِ غدر ۱۸۵۷ء اودھ میں اکثر اسٹنٹ کمشنر ہو کر آئے اور لکھنؤ میں رہے۔

(ب) مرزا دیرِ مغفور کے معتقد خاص تھے۔

(ج) ۳۶ مرزا شعر کہتے تھے غالباً اپنے ماموں مرزا غالب کے شاگرد تھے

مگر جیسا کہتے تھے اس سے بہتر شعر کے حسن و قبح کو سمجھتے تھے۔

(د) اکثر دیرِ مرحوم کے رویداد مرزا غالب کے اشعار پڑھا کرتے تھے اور دیرِ حسب مذکورہ دلاوتے تھے۔

(و) مرزا کے ہم غالب جو خطوط لکھتے تھے وہ محفوظ نہیں رہ سکے ان میں "مرزا دیر کو سلام اور ایک نہ ایک پھر آتا ہوا فقرہ بطور پیام وہ (غالب) ضرور تحریر فرماتے تھے۔"

(و) مرزا کے "فرزند مرزا فیاض بیگ مرحوم حاتم تخلص (جو منصف بھی ہو گئے تھے) جناب استاذی حضرت آج مذخلہ کے شاگرد تھے جن کے بعض سلام و فتر ماقم میں چبے ہیں۔"

(ز) ۵ فروری ۱۸۷۸ء (م ۸) کے اودھ فتح میں "رسید زر" کے تحت ایک فہرست ان لوگوں کی ہے جنہوں نے اظہار کی معاونت کی ان میں "جناب ڈپٹی مرزا عباس بیگ صاحب دام اقبالہ" کے نام کا اندراج بھی ہے۔

حواشی

- (۱) یہ کتاب راقم کے ذخیرہ غالبیات میں موجود ہے۔
- (۲) دیکھیے راقم کا مقدمہ ”وعائے صباح“ غالب کا فارسی منظوم ترجمہ۔ مطبوعہ بمبئی۔ دسمبر ۱۹۷۷ء۔
- (۳) اردو، اپریل ۱۹۳۱ء، ص ۲۳۶ ”خواجہ امان مرحوم“ از: فرحت اللہ بیگ۔
- (۴) اکبر شاہ جانی کی طرف سے انگریزی دربار میں سفیر ہو کر کلکتہ میں مقیم تھے۔ تفصیلات آ کے علاحدہ مضمون میں آئیں گی۔
- (۵) ”مکارنامہ سردری“ ص ۸۳۸ از: نواب آغا مرزا بیگ سردر جنگ، سردر الدول، سردر الملک بہادر۔ یہ مرزا عباس بیگ کے چھوٹے بھائی مرزا مغل بیگ کے صاحبزادے تھے۔ ۱۸۳۸ء میں پیدا ہوئے۔ پرورش مرزا عباس بیگ کے سائے میں پائی۔ بعد میں حیدر آباد چلے گئے۔ وہاں بہت عروج پایا۔ میر محبوب علی خاں، آصف چاہ سادس کے تالیق مقرر ہو کر مندرجہ بالا خطابات سے سرفراز ہوئے۔ ”مکارنامہ سردری“ (مطبوعہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۱۹۳۳ء) ان کے خود نوشت سوانح ہیں جسے ان کے صاحبزادے نواب ذوالقدر جنگ بہادر پیر سٹراٹ لائے ترتیب دیا تھا۔ مولوی عبدالحق ۸ مئی ۱۹۵۶ء کے خط میں مولوی نصیر الدین ہاشمی کو لکھتے ہیں ”..... آپ کا کہنا صحیح ہے کہ ”مکارنامہ سردری“ میں بہت سی باتیں غلط ہیں۔ شاید آپ کو اس کا علم نہیں کہ اس کتاب کے مسودے میں سے بعض حصے خارج کر دیے گئے تھے وہ ناقابل طبع سمجھے گئے غلط ہونے کے علاوہ ناشائستہ بھی تھے (مکتوبات عبدالحق، مرتبہ جلیل قدوائی ص ۳۵۴)۔ ہم نے جو مواد بھی ”مکارنامہ سردری“ سے لیا ہے اسے دوسرے ماخذوں سے مقابلہ کر کے منتخب کیا ہے تاکہ حتی الوسع صحیح تصویر پیش کی جائے (اس ضمن میں ”خلافت اہل سنت“ مصنفہ نواب ذوالقدر جنگ کا باب سوانح

مصنف ص ۸۵۱ تا ۸۵۲: عنایت اللہ بھی ہمارے پیش نظر رہا ہے۔

(۶) فی الحال یہ کہنا ممکن نہیں کہ مرزا لڑائی سے کب نکلے۔

(۷) "سارنامہ سروری" میں لاہور لکھا ہے اور کہا ہے کہ وہاں اس وقت سر بہری لارنس "حاکم کل پنجاب" تھا مگر یہ درست نہیں کیوں کہ سر بہری لارنس ۹ مارچ ۱۸۴۶ء کو سکھوں کی پہلی لڑائی (شہ کی فیروز شاہ بہراؤں) کے نتیجے کے طور پر لاہور و دربار کا ریڈیلینٹ مقرر ہوا تھا جب کہ مرزا لڑائی کے دوران فیروز پور کے تحصیل دار تھے۔ بہری لارنس یقیناً اکتوبر ۱۸۴۳ء میں ستلج کے اس پار ان علاقوں میں موجود تھا۔

(I) Sunset of the Sikhs.

(II) The History and Culture of Indian People. Vol. IX

(۸) یہ غالب مولوی سید رجب علی (جو بعد میں اسطو جاہ کے خطاب سے مشہور ہوئے) کی سبکی و سفارش سے ہوا۔ دیکھیے مکتوب غالب نمبر ۷ بنام جواہر سنگھ جوہر مورخہ ۲۶ ستمبر ۱۸۴۸ء۔ پانچ دودر (تحقیق نامہ) مرتبہ وزیر المصن عابدی۔ ص ۲۴

(۹) کارنامہ سروری۔ ص ۵۰-۵۱

(۱۰) جیمز جیمز اباٹ James Abbot یہ وہی ادا ہے جس نے انگریزوں کی چال کے مطابق سکھوں کی دوسری لڑائی (۱۸۴۸-۴۹ء) کرانے میں نہایت مکاری اور چال بازی کا مظاہرہ کیا تھا اور اس طرح انگریز بلا آخر پنجاب پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔

(۱۱) کارنامہ سروری، ص ۵۱

(۱۲) یہ ۱۸۵۷ء کی بات ہوگی، جب کہ اس وقت ہم ۱۸۴۷ء کے قریب کی بات کر رہے ہیں۔ "سارنامہ سروری" میں واقعات کے تقدم و تاخر کی طرف سے بہت بے پروائی برتی گئی ہے۔ اصل تخلیق کا باعث تو مرزا کا اپنی جوان بنگالین بیٹی کو بھگالے جانا تھا۔

(۱۳) کارنامہ سروری، ص ۵۲

(۱۴) سر بہری لارنس ۳ جولائی ۱۸۵۷ء کو لکھنؤ ریڈیلینٹ کی حفاظت کرتے ہوئے مارا گیا۔

اس کا بھائی جان لارنس ۱۸۶۳ء تا ۱۸۶۵ء کو رنجنل اور دانسرانے ہند مقرر رہا۔ راجاؤں ہونے پر لاڑ پٹا پانگیا۔

(۱۵) سیرل Sir Richard Temple آصف جاہ عظیم کے زمانے میں حیدر آباد میں ریڈیو ٹیٹ ہو گیا تھا۔ ۱۸۷۶ء میں بنگال کالیفینٹ گورنر تھا۔ پھر بمبئی کا گورنر رہا۔ انڈیا کا فنانس منسٹر بھی رہا۔ اس نے تبت سے سری لنکا اور آسام سے قدح تک سیاحت کی تھی اور تقریباً ہر سرکاری جگہ میں کام کیا تھا۔ India in 1880 Sir Richard Temple- Page V ۱۹۰۱ء میں انگلینڈ میں انتقال کیا۔ مرزا عباس بیگ سے کمال محبت تھی۔ (کارنامہ سروری۔ ص ۵۳)

(۱۶) اوٹرام Outram ریڈیو ٹیٹ اودھ جو الحاق اودھ کے کاغذات لے کر ۴ فروری ۱۸۵۶ء کو واجد علی شاہ کے پاس گیا تھا۔

(۱۷) غالب دسمبر ۱۸۵۸ء یا جنوری ۱۹۵۹ء کو چودھری عبدالغفور سروری کی معرفت صاحب عالم کو لکھتے ہیں ”ہاں حضرت سچ ہے میرا امن حسن خاں میرے دوست ہیں اور مرزا عباس بیگ میرا بھائی تھا۔ قند و فساد کے زمانے میں بگرام میں رہا اور اب وہ فرخ آباد میں ڈپٹی کلکٹر ہے۔“ (خطوط غالب۔ از: مہر، ص ۷۲)

اس خط سے بعض محققین نے یہ سمجھ لیا کہ مرزا عباس بیگ ۱۸۵۷ء میں بگرام میں ڈپٹی کلکٹر تھے۔ حالانکہ اس وقت تک وہ صرف تحصیل دار تھے۔ بگرام میں توان کی حیثیت محض ایک پنڈت گزیر کی تھی۔ مزید ثبوت کے لیے دیکھیے۔ ”تکلیات قدر“ (۱۸۹۱ء، ص ۳ اور اولی خطوط غالب) (۱۹۳۰ء) ص ۳۱۳۔

(۱۸) کارنامہ سروری۔ ص ۱۷ - ۱۸

(۱۹) حکیم نواب دکن الدین وزیر وقت کی صاحبزادی اور نواب خیاء الدولہ کی بہن۔ ۱۸۵۷ء کی شورش کے بعد خیاء الدولہ کی املاک ضبط ہو گئی تھی۔ یہ اپنے وقت کا بہت بڑا میر تھا۔ ہامیہ احمد مرزا عباس بیگ ہی کے ہاں رہ رہا تھا بلکہ چند سال یہیں مقیم رہا۔ (کارنامہ سروری۔ ص ۲۲)

(۲۰) کوٹافو کوٹافو آتے رہتے تھے۔ (کارنامہ سروری۔ ص ۲)

(۲۱) نواسا (یہاں مراد چاہے) بھی ٹھیک ہو سکتا ہے کیوں کہ مرزا عباس بیگ کی بیٹی کی شادی بھی مرزا عباس بیگ کے بھائی کے بیٹے ہی سے ہوئی تھی۔ مگر یہاں نواسی ہی

درست ہے کیوں کہ مرزا عباس بیگ کی ذات زیر بحث ہے۔

(۲۲) خطوط غالب، لا: صہر۔ کے دونوں ایڈیشنوں میں ۱۲۸۴ھ مطابق ۱۸۶۵ء چھپ گیا ہے۔ ۱۲۸۴ھ مطابق ۱۸۶۷ء ہوتا چاہیے۔ خطوط غالب ہمیشہ پرشاد میں اسی طرح ہے۔

(۲۳) مرزا عباس بیگ کو عرف عام میں ڈپٹی ہی کہا جاتا تھا۔

(۲۴) سر جان لارنس، گورنر جنرل اور وائسرائے (۱۸۶۳ء تا ۱۸۶۹ء)

(۲۵) کارنامہ سردری، ص ۸۰

(۲۶) کیپٹن بیر Barrow ۱۸۵۷ء اور ۱۸۵۸ء میں سلون (اودھ) کا لڑائی کشنر قتلہ چیف

کشنر آف اودھ بعد میں ہوا۔ The History and Culture of Indian

People- Vol- IX

(۲۷) اس جگہ میں یہ طے کرنا تھا کہ لارے کا نام مدد رسہ رکھا جائے یا کالج اور ابتدا ہیڈ ماسٹر ہونا پرنسپل (کارنامہ سردری، ص ۵۳)۔

(۲۸) انتقال کے بعد یہ حسب وصیت اپنے ہی تعمیر کردہ امام باڑہ لکھنؤ میں مدفون ہوئے۔

(اردو لوب، شمارہ ۳، ۱۹۸۳ء۔ لا: صفحہ آدھ مرحوم، ص ۹۶، مضمون ”غالب اور بیٹاپور“۔)

(۲۹) لکھنؤ اسٹوراک

(۳۰) اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مرزا اس وقت بیٹاپور میں مقیم تھے۔

(۳۱) کارنامہ سردری ص ۶۱۔ جناب مشفق خواجہ نے اپنے خط مورخہ ۲۲ فروری ۱۹۷۹ء میں راقم کو اطلاع دی کہ فیاض بیگ کا انتقال ۱۸ دہرادی ۱۲۹۹ھ مطابق ۷ مئی ۱۸۸۲ء کو ہوا تھا۔

(۳۲) کارنامہ سردری، ص ۵۱

(۳۳) کارنامہ سردری، ص ۱۲۰ اسی صفحہ پر صاحب نگار نامہ سردری نے مرزا غالب کے

نے سب کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔

”... (نواب صاحب) نے فرمایا کہ آپ کے خاندان میں مرزا عباس بیگ کے علاوہ

مرزا غالب بھی تو شیعوں تھے۔ میں نے عرض کیا کہ نیم شیعوں تھے۔ حسب اہل بیت تھے مگر مذہب اختیار نہیں کیا تھا۔“

(۳۴) سرور الدولہ مصطفیٰ کارنامہ سروریؒ کے صاحبزادے ذوالقادر جنگ نے حاشیے میں لکھا ہے کہ ”یہ نقش بسم اللہ کا ہے اور والد نے مجھے بتایا ہے میں پابندی کے ساتھ لکھا کرتا ہوں۔“

(۳۵) یہ اخبار تعلقہ دارالعلوم کے مفاد کے تحفظ کے لیے شائع ہوا تھا۔
(۳۶) جہاں افضل حسین ثابت نے مرزا عباس بیگ کو شاعری میں مرزا غالب کا شاگرد اور شعر کے حسن و فصیح سے بہ خوبی واقف بتایا ہے وہاں مرزا کے بھتیجے سرور الدولہ آغا مرزا بیگ کا بیان ہے کہ مرزا شعر کوئی تو ایک طرف شعر صحیح بھی نہ پڑھ سکتے تھے۔

نواب مرزا الہی بخش خاں معروف

معروف کا انتقال ۱۲۴۲ھ / ۱۸۲۶ء میں ہوا۔ وہ جان معروف کے مقدمے میں بغیر کسی سند کے لکھا ہے کہ انتقال کے وقت ”عمر اسی سال سے تجاوز تھی“۔ گویا کم از کم ۸۰ سال۔ اس طرح ولادت کا سال ۱۱۶۲ھ / ۱۷۴۸ء ظہرے بج۔ مگر مصحفی مولف تذکرہ ہندی جس نے معروف کو ۱۲۰۹ھ / ۱۷۹۳ء میں لکھنؤ میں دیکھا تھا اسے ”جوان خوش اختلاط و وجہہ“ لکھا ہے۔ اس زمانے میں تو کیا، آج بھی کوئی کسی ۳۷ سالہ لوجیز عمر کے شخص کو جوان نہیں کہہ سکتا۔ اس لیے ۸۰ سال کی عمر قابل قبول نہیں۔ اگر جوان سے مراد مضبوط، قوی وغیرہ بھی لی جائے تو بھی معروف اس وقت ۲۵ / ۳۰ سال سے زیادہ کے نہ ہوں گے۔ گویا انتقال کے وقت عمر ساٹھ سال ہوگی۔ اس طرح سال ولادت زیادہ سے زیادہ ۱۷۶۶ء تسلیم کر لیتا چاہیے۔ پھر جب بڑے بھائی احمد بخش کا سال ولادت ۱۷۶۵ء ہے تو معروف کی ولادت ۱۷۶۶ء / ۱۸۰۰ء سے پہلے ممکن نہیں۔

معروف کی ابتدائی زندگی کے بارے میں کچھ زیادہ پتا نہیں چلتا۔ چند تذکروں میں جوان کی زندگی میں لکھے گئے، یہ حال ملتا ہے۔

الف۔ ۱۲۰۹ھ / ۱۷۹۳ء۔ تذکرہ ہندی از مصحفی ۳

”الہی بخش خاں، معروف، پسر عارف خاں (جوان خوش اختلاط و وجہہ است۔ دریا سے کہ فقیر تذکرہ با تمام رساچہ۔“

از شاہجہان آباد بہ لکھنؤ گزر آگئے۔ یہ شاگردی میاں نصیر تازش
دارو فکر شعر نیز ہر وہ ایشاں کہ تلاش است، می کنند۔ در یک دو
مشاعرہ حال صاحب عالم شریک غزل طرحی نیز بود۔ بعد یک دو ہفتہ باز
بہ شہر عود کرد۔ مطلع آزدی یاد آید۔

کیا بخشی اس کی قہار کی وہ انگلیا ہاتھ سے
ہاتھ ملتا ہوں، مگر سونے کی چڑیا ہاتھ سے

ب۔ ۱۲۱۵ھ / ۱۔ ۱۸۰۰ء۔ عمدہ منتخبہ ۴ از اعظم الدولہ سرور

”معروف ۶ تخلص، الٰہی بخش خاں، خلف رشید عارف خاں
(جان) مرحوم، برادر شرف الدولہ قاسم خاں (جان) مظلوم، از
امراء مقلید و عمد ذوالفقار الدولہ مرحوم، تخلص بسیار خوش اختلاط و
خوش فکر در فن سپاہ گری بسیار باہر۔ با مولف از قدیم تعارف و درود۔
از کلام دوست۔“

ج۔ ۱۲۲۱ھ / ۱۸۰۶ء۔ مجموعہ نغزہ از قدرت اللہ قاسم

”معروف ۶ تخلص الٰہی بخش خاں۔۔۔۔۔ خلف۔۔۔۔۔ عارف [جان] خاں (جان)
[برادر زادہ۔۔۔۔۔ قاسم خاں (جان)۔۔۔۔۔ کہ از امراء نامدار ایام
دولت۔۔۔۔۔ ذوالفقار الدولہ نجف خاں۔۔۔۔۔ (بود و اس) الٰہی بخش خاں
جو آنے است خوش خلق و نیکو، شہسوار، نیک خو، شیریں کلام۔۔۔۔۔ پار
باش، خوش معاش، فکرش درست و کلامش چست، طبع سلیم و درود۔۔۔۔۔
کہ در ایام ایام۔۔۔۔۔ دانش آزد و ناسر و گردید و بدل۔۔۔۔۔ عقیدہ آفاقی بہ
حضرات پیشہ۔۔۔۔۔ خصوصاً بجناب۔۔۔۔۔ محبوب رب العالمین۔۔۔۔۔
دارو۔۔۔۔۔ و اکثر اوقات۔۔۔۔۔ عمر گری یاد (دلی) تا حالے۔۔۔۔۔ می

گزارو۔۔۔ پدر والا قدرش و والدہ۔۔۔ و برادران۔۔۔ و دیگر کسی
 و کوئے۔۔۔ دستِ بیعت بدست۔۔۔ مولانا فخر الدین۔۔۔ دارو و
 خودش۔۔۔ ارادۂ بخد مت۔۔۔ میر ضیا الدین کہ یکے از خلقائے۔۔۔
 فخر المشرعین است و در بلدہ جے نگر علم اسلام برافراشت۔۔۔ دارو،
 فکر برائیں سررشتہ دینی (بر) قاسم۔۔۔ ٹیلے مہربان است۔۔۔ در بدرو
 شوق خنِ نخی از۔۔۔ نصیر استشارہ نمودہ و حالا بتائید ذہنِ رسائی خود
 دیوانے کے مملو بہتر النوع خنِ تالیف (فرمودہ)۔۔۔

گویا تذکروں سے معروف کی ۲۸ سال کی عمر سے پہلے کا کچھ حال نہیں نکلتا۔ تذکرہ ہندی
 بتاتا ہے کہ وہ ”جوان خوش اخلاق و جہد“ ہیں اور عارفِ جان کے بیٹے ہیں شاعری میں
 انھوں نے شاہ نصیر سے اصلاح لی ہے جس پر انھیں ناز ہے اور نواب اعظم الدولہ سردار
 (مولف عمدۂ منتجبہ) جو قدیم سے معروف سے تعارف ہیں معروف کی ۳۳ سال کی عمر تک
 صرف یہ اضافہ کرتے ہیں کہ معروف کے والد عارف جان شرف الدولہ قاسم جان مغفور
 کے بھائی تھے اور ذوالفقار الدولہ (نجم خاں) مرحوم کے عہد کے مظاہر امیروں میں سے
 تھے۔

تاہم ان وہ تذکروں سے ایک بات صاف ہو جاتی ہے وہ یہ کہ معروف نے ۳۳ سال کی
 عمر تک ترک دنیا نہیں کیا تھا۔ تذکرہ ہندی کے مولف مصطفیٰ بتاتے ہیں کہ وہ تذکرہ ختم
 کر چکے تھے کہ معروف دہلی سے لکھنؤ آئے اور ایک دو مشاعروں میں طرحی غزل لے کر
 شریک ہوئے۔ وہ ایک ماہ کے بعد پھر لکھنؤ واپس آئے۔

سردار مولف تذکرہ عمدۂ منتجبہ بتاتے ہیں کہ انھیں معروف سے ”قدیم“ سے تعارف
 ہے۔ وہ بہت خوش فکر شخص ہیں اور فنِ سپاہ گری کے بڑے ماہر ہیں۔

مشاعرے کی طرحی غزل کا جو مطلع مصطفیٰ نے درج کیا ہے وہ ظاہر کرتا ہے کہ اس وقت
 تک معروف کامیلانِ قلبی و سی کلکسی چوٹی کے مضامین کی طرف تھلہ ہی یہ مطلع نہ مصطفیٰ
 اور سردار کے بیانات کوئی اشارہ کرتے ہیں کہ معروف ترک دنیا کی طرف مائل ہیں یا کرچکے
 ہیں۔

لیکن بحوالہ ”مجموعہ نفوس“ ۸۰ سال کی عمر تک معروف جو ایک ”خوش خلق، بکرو، محبت
میر، نیک خواہ، شیریں کلام، یاد پاش، خوش معاش.....“ شخص تھے، اب دنیا سے اچاٹ
ہو چکے ہیں اور دل سے حضراتِ پیشہ (خصوصاً محبوب رب العالمین) یعنی صوفیائے کرام اور
خاص کر آنحضرت ﷺ کے عقیدت مند ہو چکے ہیں اور اپنا بیشتر وقت خدا کی یاد میں
گزارتے ہیں۔ ان کے والدین، بھائی اور دوسرے بچے سبھی تو مولانا فخر الدین سے
محبت ہیں مگر وہ خود مولانا فخر الدین کے ایک خلیفہ میر فیاض الدین بے ٹھگری کی خدمت میں
ارادت رکھتے ہیں۔

مجموعہ ”نفوس“ میں ایک ربائی بھی درج ہے جو حضرت سلطان نظام الدین لولپا کی شان میں
ہے۔

اس کا تمام کے تصدق ہواں
محبوب کے نام کے تصدق ہواں
معروف اگر پلاں تو سو جان سے آہ
سلطان نظام کے تصدق ہواں

۲۸ سال کی عمر میں کہی ہوئی (ذکرۃ ہندی) غزل کے مطلع ”کیا ٹھنی اس کی قہار کی وہ“
انگلیا ہاتھ سے ہاتھ ملا ہوں، گئی سونے کی چنیا ہاتھ سے، کے بعد درج بالا ربائی میں جو ٹھگری
تبدیلی آئی ہے وہ ظاہر ہے۔

معروف کی وفات (۱۲۳۲ھ / ۱۸۲۶ء) کے بعد متعدد تذکروں نے لکھا ہے کہ

انہوں نے ترک دنیا کر لیا تھا یہ اسی عہد یعنی ۱۲۱۵ء، ۱۲۱۶ء ہی میں وقوع پذیر ہوا ہو گا۔ اس
وقت معروف کی عمر ۳۴ سال اور ۳۰ سال کے بائیں ہو گی۔ چنانچہ بزمِ سخن، طورِ کلیم اور سخن
شعر ایش درج ہے کہ ”آخر ایام میں تعلقات دنیا کو ترک کیا“۔

معروف کی چھوٹی صاحبزادی امر الوہیکم کا نکاح غالب سے ۱۷ رجب ۱۲۲۵ھ مطابق
۱۹/ اگست ۱۸۱۰ء کو ہوا۔ اس وقت امر الوہیکم کی عمر ۱۱ سال کی اور غالب کی (نودہن) ۱۳ برس کی
تھی۔ خود معروف ۳۳ سال کے تھے اور بزم ۱۲۳۲ھ / ۱۸۲۶ء میں ان کا انتقال ہوا

اسرو ویتکم کی عمر ۲ سال عیسوی اور غالب کی ۹ سال عیسوی تھی۔

یہ تو مختلف قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ جب تک معروف زندہ رہے، غالب اور اسرو ویتکم کی گزرو بسر کے لیے وہ کچھ نہ کچھ بالائی یافت کا سامان مہیا کرتے رہے مگر یہ نہیں معلوم کہ خود غالب کا رویہ اپنے خسر یعنی معروف کے لیے کیا تھا۔ جالی یادگار غالب میں ایک لطیفہ بیان کرتے ہیں:

”مرزا اپنی شوخ طبع کے ہاتھ سے مجبور تھے اور کسی موقع پر خوش طبعی کرنے سے نہ چوکتے تھے۔ مرزا الٰہی بخش خاں معروف، جن کے نقد میں اور بزرگی کے سبب ان کے بڑے بھائی (نواب احمد بخش خاں) زانو سے لوب تہ کر کے ان کے سامنے بیٹھتے تھے اور جو مرزا (غالب) کے خسر ہونے کے سبب ان کے قبلہ و کعبہ تھے، ان کے آگے بھی مرزا اپنی شوخی سے ہانڈ آتے تھے۔ وہ (معروف) لوگوں کو مرید بھی کیا کرتے تھے اور بہت سے مرید ہو جاتے تھے تو ان کو اپنے سلیطے کے تمام مشایخ کا شجرہ لکھوا کر ایک ایک کاپی سب کو تقسیم کرتے تھے۔ انھوں نے مرزا (غالب) کو شجرہ دیا کہ اس کی نقل کرو۔ آپ نے شجرے کی نقل اس طرح کی کہ ایک نام لکھ دیا، دوسرا حذف کر دیا، تیسرا پھر لکھ دیا، چوتھا پھر ساقط۔ غرض کہ اس طرح بہت سے حذف و اسقاط کر کے نقل اور اصل جا کر ان کے حوالے کی۔ وہ دیکھ کر بہت خفا ہوئے کہ یہ کیا غضب کیا۔ مرزا نے کہا ”حضرت آپ اس کا کچھ خیال نہ فرمائیے۔ شجرہ دراصل خدا تک پہنچنے کا ایک ذریعہ ہے۔ سوز سچے کی ایک ایک سیر می اگر سچ میں سے نکال دی جائے تو چنداں ہرج واقع نہیں ہو جا۔ آدمی ذرا اچانک اچانک کے اوپر چڑھ سکتا ہے۔“ وہ یہ سن کر بہت جڑر ہوئے اور وہ نقل چھاڑ دالی اور کسی اور شخص سے اس کی نقل کر لی۔۔۔“

اس لطیفے سے غالب کی شانہنگی کو ہمیں پہنچتی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنے

خسر کی کافی عزت نہیں کرتے تھے، ورنہ اگر معروف کی نقد پس کے پیش نظر ان کے بڑے بھائی احمد بخش خاں ان کے آگے منہ کھولنے کی جرأت نہ کر سکتے تھے تو مرزا غالب کا ان سے شرفی کرنا کیا معنی؟

غالب کے خطوط میں معروف کا حوالہ کئی بار آیا ہے اور عجیب بات یہ ہے کہ بیشتر بیانات سے معروف کی شاعری کے متعلق تعریفی پہلو ہی نکلتا ہے۔ علانی کے نام ایک خط مورخہ ۳ جولائی ۱۸۶۳ء میں لکھتے ہیں:

”مرگ لب ناگہانی کہاں رہی، اسباب و آثار سب فراہم ہیں۔ ہاے
الہی بخش خاں منظور کا کیا مصرع ہے۔“

آہ جی چاہوں، نکل جائے اگر جان ”کہیں“

۷ جولائی ۱۸۶۳ء کے خط نظام علانی میں لکھتے ہیں:

”پچاس برس“ کی بات ہے کہ الہی بخش خاں مرحوم نے ایک
زمین“ نی نکالی، میں نے حسب القلم غزل لکھی۔ بیت الغزل یہ

ہے۔“

پلاوے اوک سے ساقی جو ہم سے نفرت ہے
بیالہ گر نہیں دیتا نہ دے شراب تو دے.....“

قدّر بکراہی کے نام ایک خط میں بول چال کے الفاظ اشعار میں لانے کو جائز قرار دیتے
ہوئے مثال دیتے ہیں۔ (تقریباً ۱۸۵۸ء)

”الہی بخش خاں معروف لکھتے ہیں:

تنگین دل سوا کھو دے تو گھر نیلام ہو جائے

جس طرح غالب، جب تک آگرہ میں اپنی والدہ کے پاس تنہا ہی رہے، رئیس
زادوں کی عام روش پر پڑ کر لبو و لعب میں پھنسے رہے (جس کا اشارہ انھوں نے خود اپنی
تحریروں میں کئی جگہ دیا ہے) اسی طرح سسرال (دہلی) کی عادات انھیں لے ڈوبی اور جب
تک ان کے خسر مرزا الہی بخش خاں معروف زندہ رہے غالب نے اپنی گزربسر کی فکر نہ کی۔

مگر یہ کچھ تعجب کی بات نہیں خود ان کے خسر معروف کا حال بھی جوانی میں یہی رہا تھا۔ ان کی گزر بسر کی فکر بھی ان کے بڑے بھائی نواب احمد بخش خاں ہی کرتے تھے۔
حمید احمد خاں مرحوم^{۱۴} لکھتے ہیں:

”اسرائیل بیگم (زوجہ غالب) کے باپ مرزا الٰہی بخش خاں کو شہزادوں کا سائیش و آرام میسر تھا۔ جوانی میں مرزا الٰہی بخش خاں کی زندگی کا ڈھنگ ایسا تھا کہ وہ شہزادہ گل فام کے عرف سے مشہور تھے۔“

سعادت یار خاں رتھیں ولادت ۱۷۷۰ء (۱۷۵۶-۵۷ء) وفات ۱۲۵۱ھ / ۱۸۳۵ء جو معروف کے ہم عصر ہی نہ تھے بلکہ ایک لمبی مدت تک ان کے یارِ غار بھی رہے تھے، مزاج کے بھی بے حد رتھیں تھے۔ وہ ایک خط لکھو سے معروف کو لکھتے ہیں۔ یہ ”خط بخش بہت رتھیں“ کے پانچویں حصے ”تخت رتھیں“ میں شامل ہے۔ اس خط میں اس نے معروف سے اپنے ایک فرنگی عورت پر عاشق ہونے کا ذکر کیا ہے^{۱۵}۔ یہ خط ظاہر کرتا ہے کہ ان کا تعلق معروف سے کس قسم کا ہو گا۔

رتھیں کی ایک رہائی ملاحظہ ہو۔

دلی میں سلامت تھی طوائف مشہور
معروف تھا اس پہ جان اور دل سے چور
یہ تو مرنے کا تھا اس پہ نہیں، رتھیں!
وہ کہتی تھی اس کو ”چل بے چل، دور ہو دور“

اس رہائی میں شاعر، معروف اور طوائف، تینوں کی نشان دہی کر دی گئی ہے۔ ایسی بات سر تپا جھوٹ نہیں ہو سکتی۔

۱۔ آزاد نے اپنی شہرہ آفاق تصنیف ”آب حیات“ میں دعویٰ کیا ہے کہ:
(الف) اگرچہ شیخ ابراہیم ذوق کو بڑی بڑی کاشیں اٹھانی پڑیں، مگر ان (معروف) کی غزل بنانے میں ذوق آپ بن گئے (یہ قول ذوق کے حوالے سے بیان ہوا ہے۔)

(ب) معروف کا مرحوم دوپہان، ذوق کا ہی اصلاح کیا ہوا ہے۔

آزاد کے اس دعوے پر بڑی لے دی ہوئی۔ اس سلسلے میں سب سے طاقت ور دلیل یہ دی گئی کہ معاصر مذکرے اس کے ذکر سے خالی ہیں۔ کوئی تذکرہ نہیں کہتا کہ معروف نے شہ نصیر کے علاوہ بھی کسی سے اصلاح لی ہے اور پھر یہ کہ معروف مشائخ شاعر تھے اور ان کا ایک دیوان ۱۸۰۶ء (مجموعہ فنون) تک مکمل ہو چکا تھا جب کہ ذوق اس وقت ۱۸۰۹ء سال سے زیادہ کی عمر کے نہ تھے^{۱۶}۔ نواب سعید احمد خاں طالب دہلوی نے آپ حیات کی اشاعت پر آزاد کو لکھا:

”خواجہ معروف کے خاندانی تذکروں اور مستند کاغذوں میں اس مسئلے پر تفصیل سے بحث کی گئی ہے اور آج بھی دہلی میں ایسے حضرات موجود ہیں جو اس غلط التزام (کہ معروف ذوق سے مشورہ کرتے تھے) کی تردید کا مواد اپنے پاس رکھتے ہیں۔۔۔۔“
 اور آزاد نے لکھا کہ:

”استاد (ذوق) کی صحبت میں بیٹے میں کئی دلدہ ان صحبتوں اور اصلاحوں کے ذکر ہو جاتے تھے اور (اصلاح شدہ) غزلوں کے اصل مسودے اب تک میرے پاس موجود ہیں۔۔۔۔“

نواب سعید احمد خاں طالب اس التزام کی تردید کا مواد مطلقاً فراہم نہ کر سکے مگر ”آزاد کے کاغذات اور ذوق کی تحریروں کے مطالعے کے دوران“ ایسا مواد جناب ڈاکٹر شوہر احمد طلوی صاحب کو مل گیا اور ایک نکتہ انہوں نے شائع بھی کر دیا^{۱۸}۔ اگرچہ یہ ذوق سے نہیں کہا جاسکتا کہ یہ خط ذوق ہی کا ہے تاہم معروف کے کلام پر اصلاح موجود ہے۔

اس کے علاوہ ایک ایسی مطلوبہ شہادت بھی مل گئی^{۱۹} جو اس وقت معرض تحریر میں لائی گئی تھی جب غالب اور ذوق دونوں زندہ تھے۔ اس ضخیم کتاب ”تاریخ جدیدہ“ کو منشی خادم علی سندیلوی نے جو اس وقت آگرے میں تھے، ۱۲۶۹ھ / ۱۸۵۳ء میں مکمل کیا اور مطبع مدرہ آگرہ سے ۱۲۷۰ھ / ۱۸۵۴ء میں شائع کیا۔ اس کے ص ۱۳۳ پر لکھتے ہیں:

”انہی بخش خاں معروف (پسر) کا سم^{۲۰} جان دہلوی۔ قلع نظر شاعری

کے فقیر بھی تھے۔ محاورہ بندی میں اچھے۔ کچھ مشورت ذوق سے بھی جتنی.....“

جب یہ کتاب بھیجی ہے غالب ۵۷ سال کے اور ذوق ۶۵ سال کے تھے۔

۱۸۷۲ء میں جب تذکرہ شمیم سخن تیار ہوا تو اس کے مولف نے تاریخِ جدولیہ کی تائید کی اور لکھا:

”سات شاعروں کی نظر سے ان (معروف) کا کلام گزرا تھا آخر میں حضرت خاکانی ہند شیخ محمد ابراہیم ذوقِ دہلوی سے اصلاح لینا شروع کی۔ دیکھ ان معروف جو رائج ہے اور تصحیحِ زمرہ جس میں ۱۰۱ مطلع ہے اور کوئی سبزی کے مضمون سے خالی نہیں۔ وہ استاد ذوق ہی کا اسلامی ہے۔“

تاہم تاریخِ جدولیہ ہی کی بات مستتر معلوم ہوتی ہے یعنی ”(دوسرے استاد یا اساتذہ کے علاوہ معروف کو) کچھ مشورت ذوق سے بھی تھی۔“ اس میں کبھی کبھار کی اصلاح اور کبھی کبھار اپنے اشعار کی مطاوعہ نوں شامل ہو سکتے ہیں۔ اس سے زیادہ کہنا مبالغہ ہے۔

آزاد نے آبِ حیات میں معروف کا ذوق سے اصلاح لینے کی کا ذکر تفصیل سے نہیں کیا ہے اور بھی کئی واقعات بیان کیے ہیں جو دلچسپی سے خالی نہیں۔ ان سے معروف کے متعلق بہت سی معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ ہو سکتا ہے ان میں کچھ انشاپردازی اور رنگ آمیزی آزاد کی طرف سے ہو لیکن بیشتر بیانات کی اساس پختہ معلوم ہوتی ہے کیوں کہ یہ سب انھوں نے اپنے استاد ذوق سے با تفصیل سنے تھے۔

آزاد معروف کے انتقال کے چار سال^۱ بعد پیدا ہوئے اور استاد ذوق کے انتقال کے وقت ان کی عمر ۲۴ سال کی تھی۔

اب تفصیل ملاحظہ فرمائیے۔ یہ سب بیانات ذوق کی زبان ہی ہیں:

۱۔ فرماتے تھے کہ ایسا کتنی میں نے آج تک نہیں دیکھا۔ جو آتا تھا۔ امیر،

فقیر، بچہ، بوڑھا سب بغیر دے نہ رہتے تھے اور دنیا بھی وہی کہ جو اس کے مناسب حال ہو۔ کوئی سودا گر نہ تھا کہ آئے اور خالی پھر جائے۔

انھیں اس بات کی بڑی خوشی تھی کہ ہماری غزل ہمارے پاس بیٹھ کر
 بناتے جاؤ سناتے جاؤ۔ میں نے اس باب میں پہلو پہلایا تھا مگر ان کی خوشی
 اسی میں دیکھی تو مجبور ہو اور یہی خوب ہوا۔ ایک دن میں ان کی غزل
 بنارہا تھا اس کا مطلع تھا۔

اک غزل پر دردی معروف لکھ اس طرح میں
 ذوق ہے دل کو نہایت درد کے اشعار سے
 کون روتا ہے یہ لگ کر ہار کی دیوار سے
 جانور مرنے لگے جلے شراشجار سے

سو اگر آپا اور اپنی چیزیں دکھانے لگا۔ ان میں ایک اسمبلی تھی اور بھی
 تھی۔ وہ پسند آئی۔ خم دم، آبداری اور جوہر دیکھ کر تعریف کی اور
 میری طرف دیکھ کر کہا۔ ر۔ اس ضیفی میں یہاں تک شوق ہے گوار
 سے میں نے ہی وقت دوسرا مصرع لگا کر داخل غزل کیا بہت خوش ہوئے۔

سر لگا دیں ابرو سے خوار کی قیمت میں آج
 اس ضیفی میں یہاں تک شوق ہے گوار سے

خیر اور چیزوں کے ساتھ وہ گوار بھی لے لی۔ میں حیران ہوا کہ یہ تو
 ان کے معاملات و حالات سے کچھ بھی تعلق نہیں رکھتی۔ اسے کیا
 کریں گے، خدا کی قدرت ۲۔ ۳ دن کے بعد بڑے صاحب (فریر)
 صاحب ریٹ پلانٹ (دلی) ایک اور صاحب کو اپنے ساتھ لے کر نواب
 احمد بخش خاں مرحوم کی ملاقات کو آئے۔ وہاں سے ان کے پاس آئے
 - بیٹھے۔ ہاتھیں چھتیں ہوئیں۔ جو صاحب ساتھ تھے ان سے ملاقات
 کروائی۔ جب چلنے لگے تو انھوں نے وہی گوار منگا کر صاحب امرامی
 کی کمر سے بندھوائی اور کہا۔

برگ سبز است تھنہ درویش
 چہ کند ہے نوا ہمیں درد

ان کے ساتھ ہم صاحب بھی تھیں۔ ایک ارگن باجا نہایت عمدہ کسی روپی سوداگر سے لیا تھا وہ انھیں دیا۔

۲۔..... استاد مرحوم فرماتے تھے کہ دالان میں ایک طرف جالہاز بھی رہتی تھی۔ جب میں رخصت ہوتا تو آٹھویں دوسویں دن فرماتے۔ بھئی میاں امیراجیم! ذرا بیماری جالہاز کے نیچے دیکھنا۔ پہلے دن تو میں دیکھ کر حیران ہوا کہ ایک چڑیا میں کچھ روپے دھرے تھے۔ آپ نے سامنے سے مسکرا کر فرمایا۔ رے خدا روپے تو بندہ کیوں نہ لےوے۔ اس میں لطیف یہ تھا کہ ہم کس قائل ہیں جو کچھ دیں۔ جس سے ہم مانگتے ہیں۔ یہ وہی تھیں دیتا ہے۔

۳۔..... ایک دفعہ استاد بیمار ہوئے اور کچھ عرصہ کے بعد گئے۔ ضعف تھا اور کچھ کچھ شکایتیں باقی تھیں۔ فرمایا کہ حق بچا کرو۔ عرض کی کہ بہت خوب۔ اب وہ حق چلا گئیں۔ تو خالی حق کیا چلا گئیں۔ ایک چاندی کی گز گڑی۔ چلم اور پنبل، مفرق نیچر، مرصع مہاتل تیار کروا کر سامنے رکھوا دیا۔

۴۔..... خلیفہ صاحب (میاں محمد اسطیقل) چھوٹے سے تھے۔ ایک دن استاد کے ساتھ چلے گئے۔ رخصت ہوئے تو ایک چھوٹا سا ناگن اسطیقل سے منگایا۔ زمین ذریں کسا ہوا اس پر سوار کر کے رخصت کیا کہ یہ بچہ ہے۔ کیا جانے گا کہ میں کس کے پاس گیا تھا۔

۵۔..... کسی کھانے کو بھی چاہتا تو آپ نہ کھاتے۔ بہت سا پکواتے۔ اور کہتے کہ دل سیر ہو گیا۔ یہ ساری سچائی اسی سعادت^{۲۲} مند بھائی کی بدولت تھیں جو دن بھر سرانجام مہام میں جان کھپاتا تھا۔ راتوں سوچ میں گھلتا تھا اور خاندان کے کام کو زبرد کرنا تھا اور ان سے فکرا دہائی اچھا رکھتا تھا۔

۶۔..... ایک دن نواب احمد بخش خاں آئے۔ لیکن انسرودہ اور برآشت۔

اُنکی بخش خان مرحوم کچھ جانتے تھے کہ کچھ نہ کچھ آج ہے، جو اس طرح آ رہے ہیں۔ پوچھا۔ آج کچھ خفا ہو؟ کہا کہ نہیں حضرت، فیروز پور جہر کے جاتا ہوں۔ پوچھا کیوں؟ کہا کہ بڑے صاحب (صاحب ریٹیریٹ) نے حکم دیا ہے کہ جس کو ملنا ہو بدھ کو ملاقات کرے۔ حضرت آپ جانتے ہیں مجھے ہفتہ میں دس دنہ کام پڑتے ہیں۔ جب جی چاہا گیا۔ جو ضرورت ہوئی کہہ سن آیا۔ مجھ سے یہ پابندیاں نہیں اٹھتیں۔ میں یہاں رہتا ہی نہیں۔ فرمایا کہ تم سے کہا ہے؟ کہا کہ مجھ سے تو نہیں کہا۔ سنا ہے۔ بعض زور سنا گئے بھی تھے۔ ان سے ملاقات نہ کی۔ یہی کہلا بھیجا کہ بدھ کو ملے۔ فرمایا کہ تھما دے واسطے نہیں۔ لوروں کے لیے ہو گا۔ احمد بخش خاں نے کہا کہ ہیں حضرت یہ ال فرہنگ ہیں ان کا قانون عام ہوتا ہے۔ جو سب کے لیے ہے وہی میرے لیے ہو گا۔ فرمایا کہ بھلا تو چاہو۔ تم ابھی ہلاؤ دیکھو تو کیا ہوتا ہے۔ انھوں نے کہا۔ بہت خوب جہاں گا۔ فرمایا کہ جہاں گا نہیں۔ اٹھیے بس ابھی جائے۔ نواب نے کہا کہ نہیں میں نے عرض کیا ضرور جہاں گا۔ بکرا کر بولے کہ عرض فرض نہیں بس شرط یہ ہے کہ اسی وقت جائے اور سیدھے وہیں جائے گا۔ احمد بخش خاں بھی انداز دیکھ کر خاموش ہوئے اور اٹھ کر چلے۔ انھوں نے پھر فرمایا کہ وہیں جانا اور مجھے پریشان تو کیا ہے ذرا پھرتے ہوئے اور عرضی کو آکر استاد کہتے تھے کہ وہ تو گئے مگر ان کو دیکھتا ہوں کہ چپ اور چہرہ پر اضطراب۔ کوئی دودھ گھڑی ہوئی تھی۔ ابھی میں بیٹھا غزل بنا رہا ہوں کہ دیکھتا ہوں۔ نواب سامنے سے چلے آتے ہیں۔ خوش خوش۔ لبوں پر عجم۔ آکر سلام کیا اور بیٹھ گئے۔ انھوں نے دیکھتے ہی کہا کیوں صاحب؟ نواب بولے کیا قحطہ اطلاع ہوتے ہی خود نکل آئے اور پوچھا ہیں نواب اس وقت خلاف عادت؟ میں نے کہا بھئی میں نے

سنا تم نے حکم دیا ہے کہ جو ہم سے ملے ہندہ کو ملے۔ ابھی میں نے تقریر تمام بھی نہ کی تھی کہ وہ بولے نہیں نہیں صاحب! آپ کے واسطے یہ حکم نہیں۔ آپ ان لوگوں میں نہیں ہیں۔ آپ جس وقت چاہیں چلے آئیں۔ میں نے کہا بھائی تم جانتے ہو۔ ریاست کے جھگڑے میں میں غفلتانی دیا ہوں۔ کوئی بات کہنی ہے۔ کوئی سنی ہے بس میرے کام تو بند ہوئے۔ بھائی میں رخصت کو آیا تھا کہ خیر و زچہ رچلا جاؤں گا۔ اب یہاں رہ کر کیا کروں۔ انھوں نے پھر وہی کلمات ادا کیے اور کہا۔ دن رات دن رات جب جی چاہے۔ میں نے کہا۔ خیر تو خاطر جمع ہو گئی۔ اب میں جاتا ہوں۔ الٹی بخش خاں مرحوم بھی شکستہ ہو گئے اور کہا۔ بس اب چاہئے آرام کچھ۔ (آزاد) جو خدا کے لیے دنیا کو چھوڑ بیٹھے ہیں خدا بھی انھیں نہیں چھوڑتا۔

۸۔ ساتھ ہی استاد مرحوم یہ بھی کہتے تھے اور یہ بات لکھنے کے قابل ہے کہ زبان سے الٹی بخش خاں مرحوم نے کبھی نہیں کہا۔ مگر میں جانتا ہوں۔ انھیں آرزو تھی کہ علی بخش (ایک ہی بیٹا تھا) بذات خود صاحب منصب اور صاحب امارت ہو چکا اور اس کی اولاد کا دست نگر نہ ہو۔ ساز و سامان کر کے ریاستوں میں بھی بھیجا۔ صاحب لوگوں کے ہاں بھی ہندوستان کیسے۔ ظاہری و باطنی ساری کوششیں کیں۔ یہی بات نصیب نہ ہوئی۔ مشیت اللہ مشیت اللہ اور وہ خود بھی اخیر میں سمجھ گئے تھے۔ ایک دن انھی باتوں میں استاد نے فرمایا کہ علی بخش خاں بھی خوب صورت اور شان دار امیر زادہ تھا۔ میں نے عرض کی کہ حضرت کئی دفعہ بعض مجلسوں میں، بعض درباروں میں میں نے دیکھا۔ ایسے تو نہیں۔ افسردہ ہو کر کہا۔ کیا کہتے ہو۔ ذکر جوانی و پیری اور ذکر امیری و فقیری۔ کس کو یقین آتا ہے؟

۸۔ استاد مرحوم نے فرمایا کہ ان دونوں مردانوں کو قاتل تھے۔ مرزا

قتیل کے شاگرد فارسی نگاری اور انشا پر دلازی کے ساتھ سخن منہی کے دعوے رکھتے تھے۔ منشی محمد حسن خاں میر غنشی تھے اور فی الحقیقت نہایت خوش صحبت، خوش اخلاق ہامروت لوگ تھے۔ ایک دن دونوں صاحب الہی بخش خاں مرحوم کی ملاقات کو آئے اور تعارف رہی کے بعد شعر کی فرمائش کی۔ انھیں اور لوگوں کی طرح یہ عادت نہ تھی کہ خواہ مخواہ جو آئے اسے اپنا شعر سناتے لگیں۔ اگر کوئی فرمائش کرتا تھا تو بات کو بال کر پہلے اس کا کلام سن لیتے۔ شاعر نہ ہوتا تو کہتے کسی اور استاد کے دو چار شعر پڑھیے جو آپ کو پسند ہوں۔ جب اس کی طبیعت مظلوم کر لیتے تو اسی رنگ کا شعر اپنے اشعار میں سے سناتے۔ اسی بنیاد پر ان سے کہا کہ آپ دونوں صاحب کچھ کچھ اشعار سنائیے۔ انھوں نے کچھ شعر پڑھے۔ بعد اس کے الہی بخش خاں مرحوم نے دو تین شعر وہ بھی ان کے اسرار سے پڑھے اور ادھر ادھر کی باتوں میں جاں بکے۔ جب وہ چلے گئے تو مجھ سے کہنے لگے۔ یہاں ابراہیم اتم نے دیکھا؟ اور ان کے شعر بھی سنے؟ مجھ بھول لکھنیت ہیں۔ کچھ حال ہی نہیں کہتا کہ ہیں کیا؟ یہی مرزا خاں اور غنشی صاحب ہیں جن کی سخن ہم دلازی اور نکلتے پانی کی اتنی دھوم ہے اور اس پر تماشتی کے بھی دعوے ہیں ارطی تو ان کے منہ پر دو جوتیاں بھی نہ مارتی ہو گی۔ بھلا یہ کیا کہیں گے اور کیا سمجھیں گے۔

۹۔ استاد مرحوم فرماتے تھے کہ ایک دن میں بیضا غزل بنا رہا ہوں کہ نواب احمد بخش خان آئے۔ آداب معمولی کے بعد باتوں باتوں میں کہنے لگے کہ فلاں انگریز کی خیانت کی انکار دہیے اس میں صرف ہوا۔ لٹائی گھڑ دوڑ میں ایک چائے پانی دیا تھا۔ یہ خرچ ہو گیا۔ وہ صاحب آئے تھے۔ اصلیل کی سیر دکھائی۔ کامیاد او کے گھوڑوں کی جوڑی کھڑی تھی۔ انھوں نے قریب کی میں نے آگے میں جڑوائے اور اسی پر

سوار کر کے انھیں رخصت کیا وغیرہ وغیرہ۔ کیا کروں خالی ملنا، خالی رخصت کرنا مجھ سے نہیں ہو سکتا۔ یہاں کے امیروں کو امدت کے بڑے بڑے دعوے ہیں۔ (جس طرح بچے بزرگوں سے بکڑ بکڑ کر باتیں کرتے ہیں۔ جہنم بہ جہنم ہوتے تھے اور کہتے تھے) ٹٹل خانہ میں گیا تھا وہاں یہ بندہ دست کر آیا ہوں، گھوڑیاں آج سب علاقہ سمجھ لو میں حضرت کیا کروں۔ شہر میں اس گلہ کا گزراہ نہیں۔ یہ لوگ اس خرچ کا پوجہ اٹھائیں تو چھاتی ترقی جائے۔ الٹی بخش خاں مرحوم بھی ادا شناسی میں کمال ہی رکھتے تھے۔ جڑ گئے چکے پیٹھے سنتے تھے اور مسکراتے تھے۔ جب ان کی زبان سے نکلا کہ چھاتی ترقی جائے۔ آپ مسکرا کر بولے۔ ہاں تو آپ کی چھاتی میں بھی آیا ہو گا۔ شرما کر آنکھیں میچی کر لیں۔ پھر انھوں نے فرمایا آخر امیر زلاے ہو۔ خانہ ان کا نام ہے۔ یہی کرتے ہیں مگر اس طرح نہیں کہا کرتے۔ نواب احمد بخش خاں نے کہا۔ حضرت پھر آپ سے بھی نہ کہوں؟ فرمایا خدا سے کہو۔ وہ بولے کہ مجھے آپ دکھائی دیتے ہیں آپ ہی سے کہتا ہوں آپ خدا سے کہیے۔ فرمایا کہ اچھا ہم تم مل کر کہیں۔ تمہیں بھی کہنا چاہیے۔ نواب احمد بخش خاں بھی جانتے تھے کہ جو سخاوت ادھر ہوتی ہے جہنم بجا ہے اور اسی کی ساری برکت ہے۔ ۲۳

۱۰۔ ان کے اشعار کا ایک سلسلہ ہے جس میں ردیف وار ۱۶ / مطلع ہے اور کوئی سبزی کے مضمون سے خالی نہیں۔ اسی رعایت سے اس کا نام تسبیح زمرہ رکھا تھا۔ یہ تسبیح بھی استاد مرحوم نے پروٹی تھی اور آخر میں ایک تاریخ فارسی زبان میں اپنے نام سے کہہ کر لکائی تھی۔ جن دونوں اس کے دانے پروتے تھے تو نواب صاحب کی سب پر فرمائش تھی کہ کوئی مثل، کوئی محاورہ سبزی کا بتاؤ۔ ان کے بذل و کرم اور حسن و اخلاق اور طور و تہ کے سبب سے اکثر شرفاً خصوصاً شعرا آکر جمع ہوتے تھے

اور اشعار سنتے سنا تے تھے۔ ان دنوں میں ان کے شوق سے اوروں پر سبز رنگ چھلایا ہوا تھا۔ بھورے خان آشفۃ ایک پرانے شاعر شاہ محمدی مائل کے شاگرد اور ان کے مرید تھے، وہ عقیدہ بھی پاتے تھے۔ ان کے شعر میں ہری چک کا لفظ آیا کہ ان کے ہاں ابھی تک نہ بندھا تھا۔ ان سے وہ شعر لے لیا اور اپنے انداز سے چھلایا۔

آج یہاں کل وہاں گزرے یو ہیں چک ہمیں
کہتے ہیں سب سبزہ رنگ اس سے ہری ^{۲۴}چک ہمیں

انھیں سو روپے ایک رو مال میں باندھ کر دیدے کہ تمھاری کاوش کیوں خالی جائے۔ افسوس کہ اخیر میں کھیت بھورے خان نے رو سیاہی کٹائی اور سب تعلقات پر خاک ڈال کر ان کی جھوکی لطف یہ کہ دریادل نواب۔ طبیعت پر اصلاً میل نہ لائے لیکن اس تاہل کو ان کا آکر وہ ہی کرنا منظور تھا۔ جب دیکھا کہ انھیں کچھ رنج نہیں تو نواب حسام الدین حیدر خان نامی کی جھوکی۔ نامی مرحوم سے انھیں ایسی محبت تھی کہ وہ خود بھی کہتے تھے اور لوگ بھی کہتے تھے کہ ان دونوں بزرگوں میں محبت نہیں عشق ہے (اگلے زمانے کے لوگوں کی دوستیاں ایسی ہی ہوتی تھیں) ان کی تعریف میں غزلیں کہہ کر داخل دیوان کی تھیں۔ ایک مطلع یاد ہے۔

جو تم آکر مرے مہاں حسام الدین حیدر خان
کروں دل نذر جاں قرباں حسام الدین حیدر ^{۲۵}خان

قطعہ در تاریخ تسبیح زمرہ "ذوق" نے بڑھان فارسی کہا تھا۔ دونوں ماہوں سے ۱۲۳۶ھ / ۱۸۲۰ء پر آمد ہوتا ہے۔ قطعہ یہ ہے۔

سبزہ رنگاں کہ یہ ہارے جسد تازہ چوں شاخ گل لالہ و درد
از کمر آ دہن شان موبوم چوں خط جوہری و جوہر قرد

چشم دارند بہ قتل عشیق
بجمال رخ آں ہا معروف
اندراں حال خجہای گفت
رفت صیت بخش از دلے
صدویک مطلع رتیں آخر
شد چو تسبیح زمرود تامل
مرد فیروزہ و خوں شد دل لعل
پیش آئینج گہر نیست چو خاک
ذوقی چوں خواست دو چہر بخش
لؤل از داند خوش رنگ شد

۱۲۳۶ھ

ہا خلدہ رتیں بہ نوشت
طرف تسبیح زمرود آورد

۱۲۳۶ھ

مشہور رتینی کو سعادت پید خلدہ رتیں (۷۰ھ / ۷۵۹ھ تا ۲۵۱ھ / ۱۸۳۵-۱۸۳۶ء)
معروف کے خاصہ دوستوں ہی میں نہ تھے بلکہ معلوم ہوتا ہے کہ معروف کی جوانی کی رنگ
ریوں میں شریک غالب بھی رہے تھے۔ معروف کے ترک دنیا کے بعد رتیں اور معروف
میں تعلق ہو گئی جس پر رتیں نے معروف کی جگہ میں ۱۰۱ھ یا ۱۰۲ھ میں جو ان کی تصنیف
”سبج سارہ رتیں“ (رتیں) کے تیسرے حصے ”سبج رتیں“ میں شامل ہیں۔ سبج کو ۱۰۱ھ
رہا محلوں کی تصبیح ہے ۲۶۔ رتیں نے شرط رکھی تھی کہ جب وہ جگہ میں پانچ سو رہا محلوں کہ لے
کاتب معروف کی خطا معاف کرے گا۔

لازم ہے رباعی کہنے کا نظم سے لوں
تقصیر معاف ہوئے معروف کی تب
مگر معلوم ہوتا ہے کہ معروف کو معافی نہیں ملی کیوں کہ رتیں صرف ایک سو ایک
نظم اور نہیں، اس میں رتیں! پ لوں
جب جگہ میں پانچ سو رہا محلوں کہ لوں
مگر معلوم ہوتا ہے کہ معروف کو معافی نہیں ملی کیوں کہ رتیں صرف ایک سو ایک

رباعیاں ہی کہہ سکے۔ یہ معافی کی شرط اس لیے تھی کہ جھڑے کی پہل معروف کی طرف سے ہوئی تھی۔

یارب ملے رنگیں کو تو نیکی کی جزا معروف کو ہوئے اس کے فطلوں کی سزا
جس نے یہ بنا فساد کی پہلے رکھی امید یہ ہے کہ چمکے وہ اس کا سزا
جھڑے کا سبب غالباً یہ تھا کہ معروف نے اپنے آپ کو رنگین سے بڑا شاعر منوانا چاہا
تھا۔ اسی لیے رنگین کو بھی یہ اشعار کہنے پڑے۔

معروف اسنے لیے ہی رنگیں سے لڑا تا خلق کہے کہ یہ شاعر ہے بڑا
جب پڑنے لگیں دوسرے^۲ سے صابن کے مول سونے کی طرح سے تب گیا خوب گھڑا

☆☆☆

رنگیں! معروف تلملاتا ہے عبت اشعار پہ ترے ہی جلاتا ہے عبت
یہ لطف خن خدا دلو ہے یار بیوردہ پو نہیں وہ رنگ کھاتا ہے عبت

☆☆☆

رنگیں! معروف نے بہت غم کھایا ہ عام نہ شاعری میں تھا پایا
جو لطف خن ہے، سو خدا دلو ہے وہ ہر ایک کے حصے میں نہیں وہ آیا

☆☆☆

معروف تو ہے شعر و خن کا محتاج پر جو کو خلق کی وہ موجود ہے آج
اس کی وہ شکل ہوئی بہ قول رنگیں پابند سلاسل میں اور پائے چھاج

☆☆☆

معروف اترے بول سوں میں کس طرح رنگیں ہوں، نہاں بندر ہوں میں کس طرح
جب تیری طرف سے ہو ہدی کا آواز پھر ایک کی سو سو نہگوں میں کس طرح

☆☆☆

معروف کے معلق ذکرہ شمیم خن اور آب حیات میں مرقوم ہے کہ انھوں نے کئی
(سات) لکھا تھو سے اصلاح لی۔ رنگین کی یہ رباعی بھی شاید اسی طرف اشارہ کرتی ہے۔

معروف کی مثنوی کو، کیا ہم نے جو غور ہر ایک غزل کا اس کی ہے طرز اور
رنگین! اس کا سبب یہ معلوم ہوا لوگوں سے کہا لیتا ہے اکا ہے یہ طور

☆☆☆

معلوم ہوتا ہے کہ ان استادوں یا شاعروں میں معروف کے گھر سے دوست مبارز الدولہ ممتاز الملک میر حسام الدین حیدر خاں بہادر حسام جنگ نامی بھی تھے۔ رنگین کا کہنا ہے کہ معروف میر اسعد مقابل نہیں وہ جو کچھ میر سے خلاف لکھتا ہے وہ نامی کا کہا ہوتا ہے۔

معروف اگر میر سے مقابل لڑتا تو زیور نظم میں بھی کچھ کچھ گھڑا روکش مرے ہو سکے وہ رنگیں! کیا دغل پر دے میں وہ نامی^{۲۸} کے ہے مجھ سے لڑتا مرزا سعید^{۲۹} الدین احمد خاں طالب (ضیاء الدین احمد خاں شیردرختاں کے چھوٹے بیٹے اور احمد بخش خاں کے چچے) لکھتے ہیں^{۳۰}۔

”معروف مرحوم کی تمام خانہ داری کا خرچ یعنی باہتاج خانہ، چارے گرمی کا کپڑا، زنار و مردانہ مکانات سکونت، ان سب باتوں کی کفالت فخر الدولہ (احمد بخش خاں) مرحوم کی طرف سے ہوتی تھی۔ علاوہ بریں ایک پاگلی، ایک ہو اور، آٹھ کھارہ دو گھوڑے خاصے اور گھوڑے رفیقوں کے لیے اور..... کل ملا زمین جو ایک سرکار کے لیے لازمی ہیں یہ سب اسی..... بڑے بھائی کی طرف سے تعینات تھے۔ تین سو روپے ماہوار صرف جیب خرچ کے لیے..... ہر سال دو تین ہزار روپے اور قرض بھی لو اکیا جاتا تھا، جو حضرت معروف کا دست نگی اپنے اوپر پار کر لیتا تھا.....“

کچھ اسی سے ملتا جلتا حال آڑو نے بیان کیا ہے۔ ملاحظہ کیجئے اوپر آپ حیات کے تحت بیان نمبر ۷ جس میں بتایا گیا ہے کہ باوجود تارک الدنیا ہونے کے معروف کی یہ آرزو تھی کہ کسی طرح ان کا بیٹا علی بخش خاں بھی صاحب منصب اور صاحب امارت ہو جائے اور چچا (احمد بخش خاں) کا دست نگر نہ ہو اور بیان نمبر ۹ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ جب احمد بخش خاں اپنے اخراجات کا ذکر کرتے تھے تو معروف کو تارک الدنیا ہونے کا حال مندرجہ بالا کے پیش نظر رنگین کی یہ رہامیاں پڑھیں۔

معروف میں باقی تو نہیں دم مطلق کہتا ہے کسی سے میں نہیں کم مطلق
غم احمد بخش خاں کی ثروت کا ہے بس رنگین! اس بن اسے نہیں غم مطلق

معروف ہوا ہے خشک جوں سوکھی خشک اور بہتے مدام اس کے ہیں آنکھ سے اشک
 رنگیں! نطفان نہیں ہے مطلق اس کو یہ احمد بخش خاں کی دولت کا ہے رشک

☆☆☆

ترکب دنیائے بعد معروف دیہاتی لوگوں کی طرح ایک رنگین و حار دیوار کپڑے سوئی کا
 پا جامہ اور اوننی طالع کدڑ کپڑے طوس کا کرنا پہنا کرتے تھے۔ رنگین کہتے ہیں کہ سب دکھاوا
 ہے اور اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ لوگ معروف کو درویش سمجھ کر قدم بوسی کریں:

معروف کا پا جامہ جو ہے سوئی کا اور کرت بھی ہے پارچہ طوسی کا
 مطلب ہے یہ رنگیں! تاکہ یہ دیکھ لہاس خلقت کو ارادہ ہو قدم بوسی کا
 معروف کو زرد رنگ کا لباس مرغوب تھا۔ اس پہناوے کی وجہ رنگین یہ بیان کرتے ہیں کہ
 معروف فقیروں میں اپنی نمائندگی فقیری کی وجہ سے ”زرد رو“ یعنی شرمندہ ہیں:

جو خاک رنگیں ہیں ان کا ہے گرد لباس فقر اپنا سمجھتے ہی نہیں مرد لباس
 رنگیں! فقرا میں زرد رو ہے معروف اس واسطے بھاتا ہے اسے زرد لباس

☆☆☆

اگر معروف زرد لباس کے بجائے سرخ یا سبز لباس پہنتے ہوتے تو رنگین ان پر سرخ رو یا
 سبز قدم وغیرہ مرکبات کا اطلاق بہ آسانی کر سکتے تھے۔

یہ تسلیم کرنے میں کوئی ہاک نہیں ہونا چاہیے کہ تاجپاتی کے بعد کبھی ہوئی ان رہا میوں
 میں حتیٰ الوسع رنگین نے معروف کو بد فطامت ہی بتایا ہے پھر بھی اگر انصاف سے دیکھا
 جائے تو معلوم ہو گا کہ ان رہا میوں میں معروف کی فحی زندگی کے متعلق دیئے ہوئے بیانات
 بے بنیاد نہیں۔ رنگین کے یہاں جو کوئی مستقل فن کی حیثیت نہیں رکھتی۔ اس لیے یہ
 رہا میاں محض وقتی جذبے کے تحت لکھ ہوئی ہیں۔ لیکن وجہ ہے کہ رنگین نے انھیں نظم
 کرتے ہوئے حقائق کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا، محض ان میں طبریہ رنگ بھر دیا ہے۔

معروف: اب ابھی فقیری کی طرف مائل نہیں ہوئے تھے، ان کی اور رنگین کی بہت
 کاڑھی چھٹی تھی۔ ایک بار رنگین دو ایک برس کے بعد دلی لوٹے اور ابھی مہینہ بھر ہی دلی میں
 رہے تھے کہ انھوں نے پور جانے کی ٹھانی۔ وجہ یہ تھی کہ معروف اس وقت دلی میں نہ تھے

اور گئے ہوئے تھے اور غالباً دئی کو جلد پہننے کے آجر بھی نہ تھے۔ رنکین اپنے ”شفیق و اشقی“ بھائی سے ملے بغیر کیوں کر رہ سکتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے الور کے لیے رخت سفر باندھ لیا۔ اس واقعے کو رنکین نے قطعہ بند کیا ہے۔ یہ قطعہ (مظلوم نامہ) ”دیوان اول رنکین“ کے ص ۲۰۲ پر درج ہے۔ یہ قلمی دیوان (مملوکہ ذاکر حسن آرزو) رنکین کا خود نوشتہ اور دستخطی ہے۔ جو شاہ جہان آباد میں ۱۲۲۱ھ میں لکھا گیا تھا ۳۱۔

قطعہ

از دیوان اول ”رنکین“

قلمی خود نوشتہ رنکین

مکتوبہ ۱۲۲۱ھ

شاہ جہان آباد

کہا اک صہریاں نے مجھ سے اگر
خدا کے واسطے ہم کو بتادے
برس دو بعد تو آیا ہے گھر میں
کبھی ہے سرگزشت اپنی نہ مجھ سے
نہیں ہے تجھ کو کچھ ہم سے محبت
نہیں چشم مروت تجھ میں رنکین
عجب موقع پہ یاد آیا ہے اس وقت
ترا دل ہی اگر ہم سے بھرا ہے
کہا میں نے الٹی بخش خاں وہاں
غش اس پر میں ہوں وہ مجھ پر ہے مفتوں
کہ میں آہن تو مٹا بیٹیں ہے وہ
اسے جی چاہتا ہے چاکے دیکھوں
یہ سن کر مجھ سے پھر ہنس کر وہ بولے
جہاں میں کس کو ہے الفت کسی سے

کہ تو الور کو جاتا ہے سنا ہے
کہ وہاں جانے سے مطلب تجھ کو کیا ہے
مہینہ بھر ہی دئی میں رہا ہے
نہ حیرا دکھ ہی کچھ ہم نے سنا ہے
ہمیں اس بات کا تجھ سے جگا ہے
کہیں کیا ہم غرض تو بے وفا ہے
کسی استاد نے مطلع کہا ہے
تو بھڑ ہے، ہمارا بھی خدا ہے
شفیق و اشقی اک بھائی مرا ہے
یہ میرا اور اس کا ماجرا ہے
جو میں ہوں کاہ تو وہ کہہ رہا ہے
برس تین اک سے وہ مجھ سے جدا ہے
کچھ جی میں ہوا اب تجھ کو کیا ہے
یہ رشتہ مدتوں سے کم ہوا ہے

یہ سب کہنے ہی کی باتیں ہیں اسے دوست
تری اک ششوی کے شعر یہ دو
جہاں ہوتی ہیں آنکھیں چار باہم
پھر اک آنکھیں ذرا جو ہو گئیں لوٹ
یہی معمول ہے اہل جہاں کا
کہا یہ سن کے میں نے ان کو حضرت
ولے میں نے بھی دنیا کو ہے دیکھا
کہاں ہوتے ہیں پیدا لوگ ایسے
بروں سے بھی وہ کرتا ہے بھلائی
دو دستی مہرباں بھتی ہے جلی
اسے ہے عشق مجھ سے مجھ کو اس سے

میں اس پر غش وہ مجھ پر جلا ہے

یہ تو سب جانتے ہیں کہ معروف نے دو دیوان ترتیب دیے تھے۔ دیوان اول شاہ
عبدالخالق قلاوی بدایونی نے ترتیب دے کر ۱۹۳۵ء میں نظامی پریس بدایوں سے طبع کرایا تھا۔
دیوان دوم تاحال غیر مطبوع ہے۔ دیوان لؤل کے شروع میں قلاوی صاحب کا ۱۳ صفحوں کا
مقدمہ ہے۔ یہ نسخہ قلاوی صاحب کو میرزا نصر اللہ خاں نمبرہ معروف سے ملا تھا۔ دیوان میں
معروف کی مشہور نظم ”سیح زمرہ“ شامل ہے جس کا قطعہ ”سارخ ذوقی نے کہا تھا۔ لؤل سے
۱۲۳۶ھ مستخرج ہوتا ہے۔ کیا اس کے معنی یہ لیے جائیں کہ دیوان میں ۱۲۳۶ھ تک کا کلام
شامل ہے؟ کیا معروف کا دوسرا دیوان معروف کی عمر کے بقیہ چھ سالوں میں فکر کیا گیا تھا؟
ایسی باتوں کا کوئی جواب نہیں۔ دیوان مطبوعہ کے اشعار کی تعداد چار ہزار کے قریب ہے۔

آخر میں نواب میرزا سعید الدین احمد خاں طالب کی چھ صفحوں کی تقریر ہے۔ بعد ازاں
احسن یار ہروی مرحوم کا تبصرہ ہے جو دس صفحوں پر پھیلا ہوا ہے۔ پھر دس صفحوں پر جن
میں ضیاء بدایونی کی تقریر، ساکھ دہلوی کا قطعہ ”سارخ طبع دیوان اور چند دیگر قطعات درج
ہیں۔ متن میں غلطیاں بہت ہیں۔ دیوان تدوین و تحقیق دونوں لحاظ سے نہایت کم درجے کا

کام ہے۔

میرے کتب خانے میں دیوان معروف کا ایک قلمی نسخہ ۳۲ ہے۔ یہ معروف کے انتقال کے صرف ۴ سال بعد لکھا گیا تھا۔ قلم اسکیپ کے کل صفحات ۱۰۹ ہیں۔ ہر صفحے پر ۵۶ اشعار ہیں لیکن بعض صفحوں پر اشعار غنسات اور عنوانات درج کرنے کی وجہ سے کم بھی ہو سکتے ہیں۔ اس طرح اگر فی صفحہ ۳۶ اشعار بھی شمار کر لیے جائیں تو اشعار دیوان کی مجموعی تعداد پانچ ہزار سے کم نہ ہوگی۔ دیوان پر کہیں دیوان الاول یا دیوان دوم تحریر نہیں ہے۔ تاہم مقابلہ کرنے پر معلوم ہوا کہ دیوان معروف مطبوعہ سے میرے قلمی نسخے میں کلام کہیں زیادہ ہے۔ مثلاً صرف الف کی ردیف میں میرے دیوان میں کم از کم ۲۵ غزلیں دیوان مطبوعہ سے زیادہ ہیں۔

مخطوطے کا آغاز اس طرح ہوتا ہے۔

”یا علی مدد“

رب یربم بسم اللہ الرحمن الرحیم نعم یا اللہ

اور خاتمہ اس طرح:

”ہمونا اللہ تعالیٰ دیوان معروف علی معروف، فرمائش فرد بعد چند

حاجی خان صاحب علی سرکار نواب مرحوم۔۔۔ با تمام رسید تاریخ

غزوہ جب المرجب ۱۲۴۴ ہجری، کتبہ مرزا ہاشم ملک المتکلم وصف۔“

اب سوال یہ پیدا ہوا کہ اگرچہ یہ دیوان الہی بخش خاں معروف ہی کا ہے مگر خاتمے میں ان کا نام معروف علی معروف کیوں لکھا گیا۔ اس بات نے عرصے تک بہتوں کو مضطرب کر رکھا۔ حقیقت یہ ہے کہ الہی بخش خاں کے چوتھے سید احمد خاں طالب اپنے علوی یعنی حضرت علی کی اولاد ہونے پر ناز کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں۔

الخصر کہ خادم شاہ نجف ہیں ہم

مشکل کشا ہیں جن کے سلف وہ خلف ہیں ہم

اسی طرح معروف بھی اپنے آپ کو بھی الہی بخش خاں اور بھی معروف علی کہتے

تھے ۳۳۔ ملاحظہ ہوں دیوان معروف مطبوعہ سے چند مقلعے جن میں شخص کی جگہ معروف

نے پورا کام استعمال کیا ہے۔

الہی بخش خاں:

(ص ۸۸) غزل ایک اور لکھیے اے الہی بخش خاں صاحب
قلم کو ہاتھ سے اپنے ابھی کیوں آپ دھرتے ہیں

☆☆☆

(ص ۱۰۳) ذکر چلا کہ یار بن جیتے ہیں یار کس طرح
بس یہ الہی بخش نے سنتے ہی رو دیا کہ یوں

☆☆☆

(ص ۱۱۰) خوش ہو الہی بخش تو آج رقیب مر گیا
آئے دو شالہ اوڑھ کر وہ جو سپاہ رو برد

معروف علی

(ص ۳۷) چشم تر، خاک جگر، سوختہ جاں، تار کھن
یہ نئی عشق میں معروف علی کی صورت

☆☆☆

(ص ۱۳۰) تھہ بن اب حال یہ اس کا ہے کہ مردہ جانے
دیکھے احوال جو معروف علی کا کوئی

استدراک

الف۔ معروف کے مورث اعلیٰ بخارا یا بلخ سے ۱۷۵۴ء کے لگ بھگ ہندوستان
آئے۔ یہ تین بھائی تھے قاسم، جان، عالم جان اور عارف جان۔ راستے میں چند سے قلعہ آنک
میں مرزا احمد بیگ صوبیدار کے مہمان ہوئے۔ صوبیدار نے عارف جان کو اپنی دختر بیگ اختر
جہالہ عقد میں دے کر اپنی فرزندگی میں لے لیا۔ یہ بھائی شہ عالم کے عہد (۱۷۵۹ء۔
۱۸۰۶ء) میں دکن میں آگئے۔ عارف جان کے چار بیٹے ہوئے۔ نبی بخش خاں، احمد بخش خاں،

الٰہی بخش خاں اور محمد علی خاں۔ ان میں سے احمد بخش خاں نے نظم و نعت ریاست میں اور الٰہی بخش خاں نے شعر و ادب اور تصوف و فقر میں خاصی شہرت حاصل کی۔ یہی وہ الٰہی بخش خاں ہیں جنھیں اس مقالے میں بیشتر معروف کہہ کر پکارا گیا ہے اور آگے بھی پکارا جائے گا۔ معروف کا ایک بیٹا اور دو بیٹیاں تھیں۔ بیٹا علی بخش خاں اور بیٹیاں بنیادی بیگم (زوجہ غلام حسین خاں مسرور) اور امر لا بیگم (زوجہ مرزا غالب)۔ نواب سعید احمد خاں طالب (معیار پٹنہ ماہ مئی ۱۹۳۶ء) بتاتے ہیں کہ معروف کا ایک اور بیٹا حرم سے تھا۔ اس سے آگے انھوں نے بہت طوالت کوئی تفصیل دینے سے گریز کیا۔ تاہم ”اصہار الغالب“ (مطبوعہ فروری ۱۹۶۹ء) میں صاحبزادہ ناصر الدین احمد خاں عرف خسرو مرزا نے ص ۵۷ پر جو شجرہء نواب الٰہی بخش خاں معروف دیا ہے اس میں معروف کے دونوں بیٹوں کا نام آگیا ہے۔ دوسرے بیٹے کا نام علی نواز خاں تھا۔ چوں کہ علی بخش خاں، بنیادی بیگم اور امر لا بیگم کے اخلاف وغیرہ کے بارے میں سب جانتے ہیں اس لیے یہاں صرف علی نواز خاں کے شجرے کی تفصیل دی جاتی ہے جو ”اصہار الغالب“ میں دیے ہوئے شجرے کی ہو بہو نقل ہے۔



گویا جو بیٹا حرم سے تھا اس کا نام علی نواز خاں تھا اور اس کی اولاد میں ایک لڑکا علی حسین خاں اور ایک لڑکی بیگم جہاں تھی۔

سب۔ جناب حمید احمد خاں نے اپنے بعض ۳۳ مضامین میں کلی قاسم جان اور ان مکانات

کا نقشہ کھینچا ہے جو کبھی معروف اور ان کے خاندان کا مسکن تھے۔ یہ تحریر اگرچہ جولا کی ۱۹۳۸ء کی ہے پھر بھی اتنی دلآویز ہے کہ اسے درج کیے بغیر چارہ نہیں۔ اب بھی تہذیبیوں کے باوجود بعض مکانات اپنی اصلی حالت میں موجود ہیں۔

۱۔ ”چاندنی چوک سے مڑ کر نئی ماروں کے اندر کچھ دور تک چلے جائیے تو شخصی دواخانہ کی عمارت اور حکیم محمد شریف خاں کی مسجد کے درمیان ایک کشادہ گلی نظر آتی ہے، کچھ مچی کچھ پرانی عمارتیں، کچھ سنور تے، کچھ بگڑتے ہوئے مکان ہماری نگاہوں کے سامنے ہیں۔ گلی میں ذرا فاصلے پر داپنے ہاتھ کو کوڑے کا ڈھیر ایک خاک انداز کے پاس پڑا ہے اور ہمیشہ پڑا رہتا ہے۔ گلی کے دونوں طرف کی عمارتیں زیادہ تر چھوٹی اونٹنی اور گھوڑوں کی کھڑکیوں پر ہیں لیکن جس خاص بات کو آپ ایک سرسری نظر میں محسوس کیے بغیر نہیں رہتے، وہ ان نیم منہدم عمارتوں میں اونٹنی اور گھوڑوں کی کھڑکیوں پر ہے۔ ان بلند محرابوں سے پتا چلتا ہے کہ اس گلی کے گزشتہ کھینوں کی زندگی عظمت و شان سے خالی نہ تھی۔ یہ گلی قاسم جان کی گلی کہلاتی ہے اور اٹھارویں صدی کے دوسرے نصف سے لے کر آج کے دن تک اسی نام سے مشہور ہے۔ گلی کے اس نام کے پیچھے ایک کہانی ہے جو شاہ عالم بادشاہ کے عہد سے شروع ہوتی ہے اس زمانے کے قریب تین شریف زادے جو آپس میں بھائی بھائی تھے قسمت آزمائی کے لیے بغداد سے روانہ ہوئے، منزل بہ منزل انک اور ہنگام سے گزرتے ہوئے، مٹی ہوئی مغلیہ سلطنت کی راجدھانی میں پہنچے۔ شہر میں پہنچ کر وہ بالآخر اسی گلی میں آباد ہوئے، جس کے کھڑے کھڑے ہم آپ باتیں کر رہے ہیں، شہرت اور دولت ان تین بھائیوں

میں کم از کم دو کے حصے میں ضرور آئی پہلے قاسم جان کے اقبال کا ستارہ چمکا۔ خود گلی کا نام اس کا شاہد ہے کہ جاوید ثروت کے لحاظ سے قاسم جان اپنے بھائیوں کے سر تاج تھے۔ لیکن انیسویں صدی کے شروع میں عقد پر ایک ہار پھر مسکرائی اور اس مرتبہ عارف جان کا بیٹا کوہار و اور فیروز پور جھمر کہ کی ریاست پر متسکن نظر آیا۔ قاسم جان اور عارف جان کی اولاد اب بھی اس گلی کی حویلیوں اور محل سراں میں موجود ہے۔ اسی گلی میں شاید غالب کی پیدائش سے بھی پہلے، غالب کے چچا کا عقد عارف جان کی بیٹی (ہمشیرہ معروف) سے ہوا تھا۔

سانس کے سرے پر جہاں گلی ختم ہونے سے پہلے بائیں ہاتھ کو گھومتی ہے ایک بڑی خراب نظر آرہی ہے اگر اس خراب سے گزر کر اندر چلے جائیں تو چند پرانی عمارتیں ملتی ہیں جن میں سے ایک عارف جان کے بیٹے نواب احمد بخش خاں دلی کوہار کی حویلی ہے روایت کہتی ہے کہ یہی حویلی غالب کے خسر مرزا الٰہی بخش خاں معروف کا بھی مسکن تھی.....“

۲۔ ”مرزا الٰہی بخش خاں کو شہزادوں کا ساجش و آرام میسر تھا جو انی میں مرزا الٰہی بخش خاں کی زندگی کا لاٹک ایسا تھا کہ وہ شہزادہ گل غلام کے عرف سے مشہور تھے۔“

رج۔ ”ذوق اور محمد حسین آزاد“ مطبوعہ ۱۹۸۷ء کے صفحہ ۱۷۱-۱۸۱ پر آب حیات کے اس بیان کا اقتباس دیا گیا ہے جو آزاد نے ذوق کی زبان سے سن کر لکھا ہے۔ ضروری مہارت ملاحظہ کیجئے :-

”سو اگر آیا اور اپنی چیزیں دکھانے لگا۔ ان میں ایک امشبانی تلوار بھی تھی۔ وہ (معروف کو) پسند آئی۔ اور چیزوں کے ساتھ وہ تلوار بھی لے لی۔ خدا کی قدرت وہ تین دن کے بعد بڑے صاحب (فریاد صاحب ریٹائرڈ دہلی) ایک اور صاحب کو اپنے ساتھ لے

کر لو اب احمد بخش خاں مرحوم کی ملاقات کو آئے۔۔۔ جب چلنے لگے تو انھوں (معروف) نے وہی کھوار منگا کر صاحب کے ہمراہی کی کمر سے بندھوائی۔۔۔

اس پر جناب عابد پشاوری تنقید کرتے ہیں:

”اس عبارت کا ایک ایک فقرہ غلط ہے۔۔۔ اس سلسلے میں ایک لطیف سن لگجے۔ جس سال آزاد پیدا ہوئے (۱۸۳۰ء) بڑے صاحب یعنی فریزر صاحب دہلی کے ریڈیٹنٹ ہو کر آئے۔ ظاہر ہے کہ ریڈیٹنٹ ہونے کے بعد ہی نواب احمد بخش خاں کی ملاقات کو گئے ہوں گے (ورنہ آزاد قوسین میں ریڈیٹنٹ دہلی کی تصریح کیوں کرتے؟) لیکن یاد رہے کہ نواب احمد بخش خاں کا انتقال اس ملاقات سے تین سال پہلے (اکتوبر ۱۸۲۷ء) ہو چکا تھا۔ ظاہر ہے ملاقات عالم بالا میں نہیں ہوئی ہو گی۔ لطیف در لطیف یہ کہ کھوار خرید کر صاحب کے ہمراہی کی کمر سے بندھوانے والا اس سے بھی ایک سال پہلے (۱۸۲۶ء) راہی ملک بھا ہو چکا تھا۔ کہتے ہیں دروغ کو فروغ نہیں لیکن اس دروغ نے کامل ایک صدی فروغ پایا۔“

جناب عابد پشاوری کی یہ پوری عبارت ان کی کم آگاہی پر دلالت کرتی ہے۔ انھیں یہ معلوم ہی نہیں کہ جب فریزر کا قتل (۲۲ مارچ ۱۸۳۵ء) ہوا تو اس وقت تک کم از کم بیس سال کا عرصہ دہلی اور نواح دہلی میں اعلیٰ انگریزی افسر کی حیثیت سے گزار چکا تھا۔ بقول مالک رام صاحب (نمائندہ غالب ص ۷۹) احمد بخش خاں کی زندگی میں فریزر کے اور ان کے آپس میں نہایت قریبی اور دوستانہ تعلقات رہے تھے۔ حتیٰ کہ احمد بخش خاں کی اولاد فریزر کو اپنا بزرگ سمجھتی تھی اور بچا کہہ کے خطاب کرتی تھی۔

اب Twilight of the mughals (انگریزی۔ سپیر) سے چند اقتباسات ملاحظہ فرمائیں۔ (انگریزی سے ترجمہ):

”ص ۱۰۱-۱۸۲۶ء میں اس (مکلف) نے اپنے نائب اول ولیم فریزر

سے احتجاج کیا..... یعنی احمد بخش خاں اور الٹی بخش خاں معروف
دونوں کے انتقال سے پہلے ولیم فریزر دہلی میں سر چارلس مکنکاف کا
تاجب اول تھا۔

۱۸۰۸ء دہلی کے علاقے میں..... تیس سال تک جب اول رہنے والا
شخص مشہور سخت گیر ولیم فریزر تھا جس کے ذمہ مال گزاری وصول
کرتا تھا..... (اس تختی کی وجہ سے) سوئی پت میں ۱۸۴۱ء میں ۹ لاکھ نووں
کی مال گزاری ۱۶۱۳۱ روپے سے بھی کم تھی....

۱۸۴۱ء فریزر شمس الدین (احمد خاں) کے باپ (نواب احمد بخش خاں)
کا دوست تھا اور وہ لڑکے (شمس الدین احمد خاں) سے اپنے بیٹے کی طرح
سلوک کرتا تھا اس نے اسے اپنے بچے کی طرح پرورش کیا تھا بچہ
(شمس الدین احمد خاں) کا زیادہ وقت فریزر کے ساتھ ہی گزارتا تھا۔

۱۹۲ء فریزر کمشنر بننے سے پہلے بہت زمانہ انگریزی افسر کی حیثیت
سے اس (دہلی کے) علاقے میں گزار چکا تھا۔ وہ ۱۸۴۹ء میں قائم مقام
ریزیڈنٹ بنا تھا مگر جلد ہی معطل کر دیا گیا تھا۔ (مستقل طور پر دہلی کا
ریزیڈنٹ وہ ہاکنس کی تبدیلی (۱۸۴۴ء) پر ہوا)۔

آزاد کا بیان کیا ہوا واقعہ تاریخی لحاظ سے درست ہے۔ ان کی فریزر کو تو سین میں
ریزیڈنٹ دہلی ٹکھنے سے مراد یہی بتانا ہے کہ یہ فریزر وہی ہے جو بعد میں ریزیڈنٹ دہلی مشہور
ہوا۔ اب اس میں تو شبہ کی گنجائش ہی نہیں کہ نواب احمد بخش خاں اور نواب الٹی بخش خاں
معروف کی وفات سے برسوں پہلے سے فریزر اس خانہ دانا سے گہرے روابط رکھتا تھا۔ یہ بھی یاد
رکھنا چاہیے کہ ولیم فریزر عمر میں بھی احمد بخش خاں اور الٹی بخش خاں کے لگ بھگ برابر ہی تھا۔

د۔ (بحوالہ غالب نامہ جنوری / اپریل ۱۹۷۶ء ص ۱۳۱)

”رنگین نے اپنی تالیف ”افہار رنگین“ (۱۲۳۵-۳۸ھ) میں معروف کے بارگاہ دنیا ہونے
کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔

خبر گزری کہ شاہجہاں آباد میں الٹی بخش خاں نے جب کام کیا کہ کسی یار دوست سے

مشورہ نہ لیا اور اپنی اتنی بڑی ثروت سے ہاتھ اٹھا کر ترک لباس کیا اور بے پیر میں جا کر حضرت مولوی ضیاء الدین صاحب قدس سرہ کی خدمت میں بیعت کر کے گوشہ نشینی کر لی مجاہدہ کے ساتھ اعتیاد کی۔ حق تو یہ ہے کہ اس پر اللہ کی بڑی مہربانی ہے بلکہ ذیبت ہے کہ اسے سمجھے کہ یہ موسم ثانی ہے..... ظاہر ہے کہ رنگین نے یہ خبر ۱۲۱۵ھ اور ۱۲۲۱ھ کے مابین کبھی لکھی ہو گی کیوں کہ معروف نے اسی عہد میں ترک دنیا کیا تھا۔

۱۔ مشہور شاعر "جگت استاد" حافظ عبدالرحمن خاں احسان (ولادت تقریباً ۱۱۸۲ھ / ۶۸-۷۹ء و وفات ۱۲۶۷ھ / ۵۱-۱۸۵۰ء) نہ صرف معروف کے معروف ہم عصر تھے بلکہ ان کے خاص احباب میں سے بھی تھے۔ احسان نے جن کا مرتبہ شاعری میں معروف سے کئی مرتبہ بلند ہے معروف کی ایک غزل کی تفسیر کی ہے اور معروف کے دیوان میں احسان کی کم از کم دو غزلوں پر تفسیریں موجود ہیں۔ کلیات احسان (مطبوعہ ۱۹۶۸ء) ۳۵ میں معروف کے تعلق سے دو قطفے ہیں۔

(۱) قطعہ النبی بخش خاں التکلیف بہ معروف

تکون، ذوق، رفیق، بد مزاجی یہ جو ہماری مجھے احسان نہ بھائی
نہ ہوتا عمر الفت کا شمار جو تیرا تو (تو) ڈوبی آشنائی
جہاں میں وہ (ہے، ہوگا) تو بھی معروف جہاں جاوے گا پائیں بے وفائی
کہے گی غلط یہ دیکھو وہ آیا النبی بخش خاں صاحب کا بھائی
النبی بخش مجھ کو کہ غیبت وہاں پر میری نادانی سے آئی
النبی بخش سے ہے کس کو نسبت نام فخر، چتر بادشاہی
آخری شعر میں نام فخر سے مراد غالباً مولانا نصیر الدین عرف مہاں کالے کے دوا
مولانا فخر الدین ہیں جو نواب احمد بخش خاں برادر معروف کے چچ تھے اور جن سے ان کے
خاندان کو خاص نسبت ہے۔

(۲) درج ذیل قطفے کے عنوان ہی سے معلوم ہو جاتا ہے کہ جب مفیدوں نے (جن میں غالباً رنگین بھی شامل تھے) ان کے کلام کو اعتراضات کا نشانہ بنایا تو معروف ترک شعر گوئی پر آمادہ ہو گئے۔ ملاحظہ کیجئے:

قطعہ

دریا میکہ الٰہی بخش خاں معروف از اعتراضات
 مفسداں عزم ترک شعر گفتن کردہ
 مہا تو کیجیو آہنگِ خدمتِ معروف
 یہ اس سے کہیو کہ اے عنایتِ خوش آہنگ
 تو رنجِ شورشِ زانان سے گلستاں میں
 نہ کیجیو ترکِ ترم کا ایک شب آہنگ
 وہ شہسوار ہے تو عرصہ فصاحت کا
 مقرر ہیں اہل صفاہانِ دروم و ہند و فرہنگ
 عتاپِ اہلبِ معنی ہے ترے کف میں سوا
 صدائے ملک سے نہ ہونا تو زمہوارِ چنگ
 ہر آں کہ خاطر تو بے سبب بہ انہاد
 ز قصر تختِ زمیں تاجِ اوجِ ہفت اورنگ
 ز ترکِ درخانہ حاصل او
 گلستاں باد بہ (گوپالیہ کذا) قاضی نیرنگ
 فی الحال یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ قطعہ کس سال کا فکر کر رہا ہے۔

و۔ سعادت یار خاں و گلستاں کے مجموعہ ہائے کلام میں یہ کہ احوالِ معروف کا اور بھی ملتا ہے۔ مگر می ڈاکٹر حسن آردو سہراوی (جن کی عنایت سے یہ کلام مجھے ملا ہے) فرماتے ہیں "گلستاں کے نوشتہ دیباچوں سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے یہ دونوں دوادوین (جن سے یہ کلام اخذ کیا گیا ہے) ۱۲۱۲ھ / ۱۷۹۷ء تک مکمل ہو چکے تھے۔ ویسے یہ مکتوب ۱۲۲۱ھ / ۱۸۰۶ء شاجہاں آباد کے ہیں۔ چنانچہ مندرجہ کلام کے زمانے کا تقنین یا اس کی آخری حد ۱۲۱۲ھ / ۱۷۹۷ء ہی سمجھنا زیادہ قرین قیاس ہو گا۔"

اس طرح اس کلام سے نہ صرف یہ کہ معروف اور گلستاں کی ر تکمیل زندہ گی پر روشنی پڑتی ہے، یہ بھی ثابت ہو جاتا ہے کہ کم از کم ۳۲ سال کی عمر تک معروف نے ترک لباس نہ کیا تھیں

کیا تھا۔ کلام ملاحظہ فرمائیے۔

مشوئی سیویم بطور خط لکھوئے شاہجہاں آباد ہمام پرورد صاحب مشفق مہربان الہی بخش غاں
معروفہ واعبدالعاشق شدن بر شمعے واحوال بے قراری و بیان قول و قسم آں ویر کشش آں
از اقرار و حالت اضطرار دل و شکوہ ملک بکبر قرار۔ الاشعر

صبا چلوے اگر ہندوستان کو
کہ مجھ کو یہ نہ تھی امید بھائی
دیکھن خوب جو میں نے کیا غور
جہاں ہوتی ہیں آنکھیں چار باہم
ذرا پھر اک جو آنکھیں ہو گئیں اوٹ
غضب یہ ہے کہ بعد از سال ما ہے
دیا ہرگز نہ پرزہ بھی غضب ہے
بکی ہوتی ہے شرط دوستی دلو
یہ لازم ہے، مجھے تم اپنے حالات
لکھوں کیا حال اپنا تم کو میں اب
ہوا ہوں بندہ بے دام اس کا
لکھا جاتا نہیں نام اس پری کا
بھید میں ہوں مفتوں اس طرح سے
نظر اب نکلی آتی نہیں ہے
نہ جاسکتا ہوں دواں دوری کے باعث
قسم مجھ کو تھما دے سر کی بھائی
کہا میں نے کہ میں مرنے ہوں تھہ بن
خدا کے واسطے کر وصل سے شاد
یہ سن کر پولی کیوں کرتا ہے بک بک
دلے دل سے خیال وصل کر دور

تو یہ کہو الہی بخش غاں کو
جو تم مجھ سے کرو گے بے وقائی
تو دیکھا بس زمانے کا بکی طور
تو ہو جاتا وہیں ہے پیار باہم
تو آجاتا ہے بس دل میں وہیں کھوٹ
کیا خط سے نہ تم نے یاد گاہے
..... ہائی سے جب ہے
توقع (ایسی تھی) تم سے نہ باہد سے
رہو لکھتے ہی جب تک ہو ملاقات
نہیں ہے یجن مجھ کو روز اور شب
کہ لے سکتا نہیں میں نام اس کا
کہوں حال اس کی کیا جلوہ گری کا
ہوا تھا قیس مجھوں جس طرح سے
مجھے یہ زندگی بھائی نہیں ہے
نہ رہ سکتا ہوں مجبوری کے باعث
ہوتی ہے بے جگہ یہ آشنائی
یہ دن سختی کے میں بھرتا ہوں تھہ بن
روامت رکھ یہ مجھ پر ظلم و بے دلو
(مجھے تسلیم) تو چاہے ہے بے شک
(کہ میں) بے بس ہوں اور ہے تو بھی مجبور

مرا آنا تو ہے دشوار تجھ تک ترا بھی پہنچنا مشکل ہے مجھ تک
 پڑے ہرگز نہ کام اس سے کسی کا کہوں کیا حال آگے بے بسی کا
 کہ اس عالم فلک نے کیا کیا ہے نیا دلغ اک سرے دل کو دیا ہے
 کچھ ایسا اس کا دل پھیرا ہے اک بار کہ اب صورت سے میری ہے وہ ہزار
 کسی کو بھیج سکتا ہوں نہ میں داں نہ کوئی اس کا آسکتا ہے اب یاں

حقیقت جس سے ہو معلوم مجھ کو
 بس آگے کیا لکھوں بھائی میں تجھ کو

قطعہ

مطلوب ہے وصل حیرا معروف جب تک رہتیں کے دم میں دم ہے
 ہو سکتا نہیں وہ آہِ تحریر جو تیری مفارقت کا غم ہے
 غمیں..... از غزل برادر مہربان الہی بخش خاں معروف

(نوٹ۔ صرف مطلع کی تفسیریں درج کی جاتی ہیں مقطعات کی تفسیریں دستیاب نہیں۔)

میں کھڑا ہوں مجھ کو ہر صورت سے تاکو دیکھ لو اپنی خلوت میں کبھی مجھ کو بلا کر دیکھ لو
 پاکہاڑی کو مری تم کد کد کر دیکھ لو "عاشق صادق ہوں میں تھا بیٹھا کر دیکھ لو
 گر نہیں ہادر تو مجھ کو آنا کر دیکھ لو"

غمیں سویم از غزل برادر مہربان الہی بخش خاں معروف۔

(نوٹ۔ صرف مطلع و مقطع کی تفسیریں درج کی جاتی ہیں۔)

چھرتا ہے عاشقوں کو سر پر آرا کھینچ کر اس لیے بیٹھے ہیں غیر اس سے کھنڈا کھینچ کر
 گوشہ ابرو تلک غمزہ سے سارا کھینچ کر جس کے اس ابرو دکھاں نے تیرا کھینچ کر
 مر گیا ایک آہ دل سے وہ بچا کھینچ کر

☆☆☆

تم غمیں دوسرا رہتیں لکھا چاہو ہو جو تو میاں معروف کو یہ مشورہ اب جا کے دو
 یعنی کر کر جمع تم اپنے حواس اور ہوش کو اب غزل ایسی کہو معروف تا حیران ہو
 بزم میں دلست ہر ایک دشمن تمہارا کھینچ کر

حواشی

(۱) دیوان معروف۔ نکلی پر بیس بدایوں، ۱۹۳۵ء، مقدمہ ص ۱

(۲) جناب مالک رام نے ”مکاتھۃ غالب“ بار دوم ص ۵۳۳ پر اور نواب امین الدین احمد خاں ثانی آخری دہائی لوہارو نے اپنی مثنوی ”انہیساۃ و انتکار“ مطبوعہ ۱۹۷۳ء، ص ۱۹ پر لکھا ہے کہ نواب احمد بخش خاں کی ولادت ۱۷۶۵ء میں بمقام انک ہوئی۔ ”سہار الغالب“ لڑخسرو مرزا مطبوعہ ۱۹۶۹ء کے شجرہ خاندان لوہارو میں بھی ۱۷۶۵ء ہی ہے۔ یہ ۱۹۱۰ء کے گزٹ سے نقل کیا گیا ہے۔

(۳) تذکرہ ہندی کا آغاز ۱۲۰۱ء سے قبل ہو چکا تھا۔ ۱۲۰۹ء سال اختتام ہے۔ چوں کہ مصحفی تذکرہ مکمل ہو جانے پر معروف سے لکھنؤ میں ملے تھے اس لیے یہاں ۱۲۰۹ء درج کیا گیا ہے۔

(۴) سرور، معروف کے دوست تھے۔ اس لیے قیاس ہے کہ معروف کا ترجمہ پہلی ہی روایت میں درج تذکرہ کر لیا گیا ہو گا اگرچہ ان کے کلام میں بعد میں بھی اضافے ہوتے رہے جیسے کہ ”مثنوی تسبیح زمرہ“ جو معروف نے ۱۲۳۶ء میں کہی تھی ملاحظہ ہو۔ ذوق کا قطعہ تاریخ بحوالہ دیوان معروف۔ مادہ = طرف تسبیح زمرہ آورد
۱۲۳۶ء

(۵) ۱۲۲۱ء مجموعہ نغمہ کا سال اختتام ہے۔

(۶) تذکرہ طبقات خن از جہانگیر شہی (نام سے ۱۲۲۲ء نکلتے ہیں) میں بھی معروف کا کچھ حال درج ہے مگر وہ چند اہم نہیں۔

(۷) اس دیوان میں سے ۳۱ شعر درج کیے ہیں۔ ایک مطلع یہ ہے۔

عزیزدا جب کوئی آگے آتا رہے دیکھ گاتا ہے
تو ہم پر دیکھوں کو پڑ اپنا دیکھ آتا ہے

لکھا ہے کہ معروف نے یہ مطلع راجپوتانہ کی کسی غزل و قصیدہ میں دیکھا۔ راجہ سن کر فی البدیہہ کہا تھا۔

(۸) تذکرہ عیار الشعراء خوب چند ذکا میری نظر سے نہیں گزر رہا ہے کہ اس میں معروف کے تارک الدنیا ہونے کا ذکر ہے۔ یہ تذکرہ ۱۲۱۳ھ / ۱۷۹۹ء - ۱۷۹۸ء / ۱۲۴۸ھ / ۱۸۳۲ء لکھا جاتا رہا۔ اس لیے نہیں کہا جاسکتا کہ معروف کا خیال اس میں کب لکھا گیا۔ بہر حال اگر ترجمہ معروف پہلے ہی سال میں درج تذکرہ ہو گیا تھا تب بھی معروف ترک دنیا کے وقت ۳۲ سال سے کم عمر کے نہ تھے۔

(۹) ان میں بہار بے غزاں، گلشن بے خار، گلستانہ ناز غیاں، گلستان بے غزاں، خوش سحر کہ دنیا، طبقات شعراء ہند، سراپا سخن یادگار شعراء، گلشن ہمیشہ بہار، گلستان سخن، سخن شعراء، در مغان گوگل پر شاہ، طور کلیم، بزم سخن وغیرہ شامل ہیں۔ یہ سب تذکرے ۱۸۴۵ء اور ۱۸۸۰ء کے مابین تالیف ہوئے اس لیے بیشتر ایک دوسرے کی نقل محض ہیں۔ اپنی طرف سے جتنی ترقی ہونے کے برابر ہے۔ البتہ کچھ تاریخ مس ۸۳ پر نشانج کا لکھا ہوا قطعہ تاریخ موجود ہے جس سے ۱۲۱۳ھ مستخرج ہوتا ہے۔

دلت چوں زریں جہان بے بنیاد
تابع شرع و اہل دیں معروف
گفت تاریخ فوت او ہاتف
ساکن جنت بریں معروف

(۱۰) معروف کے ترک دنیا سے متعلق دیکھے مضمون کے آخر میں "استدراک" (۱)
(۱۱) مطلع کا پہلا مصرع یہ ہے: "چین پڑتا نہیں اس بن مجھے اک ان کہیں۔" وچ ان معروف مطبوعہ میں اس غزل کے کل ۸ شعر ہیں (ص ۸۹)

(۱۲) جناب غور شید الاسلام نے غالب، تقلید اور اجتہاد (اشاعت سوم ۱۹۷۹ء، ص ۲۹) میں اس خط کے پیش نظر لکھا ہے کہ "یہ خط ۱۸۳۳ء کا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ یہ غزل ۱۸۱۲ء میں لکھی گئی تھی اور اس وقت غالب کی عمر محض ۱۵ سال یا اس سے بھی کم تھی۔۔۔۔۔" حقیقت یہ ہے کہ یہ غزل پہلے اپریل ۱۸۲۱ء کے خطوط کے حاشیے میں ملتی

ہے۔ گویا غزل لکھنے کا عہد یہ (۱۸۲۱ء) اور نثر شیریانی (۱۸۲۶ء) کے درمیان کسی وقت
 کئی مہینے تھے۔ ۱۸۱۲ء میں نہیں۔ اس وقت غالب کی عمر ۲۳ سال سے زیادہ تھی۔ غالب
 کو ”پچاس برس“ نہیں ”چالیس برس“ کی بات کہنا چاہیے تھا۔
 (۱۳) دیوان معروف مطبوعہ کے م ۱۳۰ پر اس زمین میں ۱۱ شعر کی غزل موجود ہے۔ مطلع
 ہے۔

جواب خط نہیں دیتا دے، جواب تو دے
 کہ قاصد آ کے جو کچھ دے خبر، شتاب تو دے

(۱۳) احوال غالب، مختصر الدین احمد، دوسرا ایڈیشن، م ۲۵۰

(۱۵) سعادت یار خاں رکنی، ڈاکٹر صابر علی خاں مطبوعہ ۱۹۵۶ء کراچی م ۳۳

(۱۶) ذوق، ولادت ۱۲۰۳ھ / ۸۸۸-۸۹ء، وفات ۲۳ صفر ۱۲ھ / ۱۵ نومبر ۱۸۵۳ء

(۱۷) طالب دہلوی، ولادت ۱۸۵۲ء، وفات یکم ستمبر ۱۹۳۰ء

(۱۸) ذوق، مولف اور اشعار، ڈاکٹر خواجہ احمد علوی، مطبوعہ دسمبر ۱۹۶۳ء، لاہور، م ۶

(۱۹) تاریخ جدید دہلی۔ اس کا ذکر قاضی عبدالودود مرحوم کے حوالے سے علوی صاحب نے کیا
 ہے مگر یہ راہ مولانا نے نہیں لائے تھے۔

(۲۰) حقیقت میں عارف جان چاہیے جو قائم جان کے چھوٹے بھائی تھے۔ مولف سے سہو ہوا
 ہے۔

(۲۱) سال ولادت ”ظہور اقبال“ سے نکلا ہے۔ ۱۸ ذی الحجہ ۱۲۳۵ھ / ۱۰ جون ۱۸۳۰ء
 (محمد حسین آزاد از جہاں ہانو نقوی م ۱۳)

(۲۲) نواب احمد بخش خاں

(۲۳) چھوٹے بھائی بڑے بھائی سے ایسی باتیں کرے تو کچھ عجیب سا لگتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ

معروف کے صوفیانہ مقام کی وجہ سے برداشت کرتے ہوں۔ تاہم نواب احمد بخش خاں
 کی سخاوت کی ایک معاصرانہ شہادت موجود ہے۔ سعادت یار خاں رکنی (۱۱۷۰ھ تا

۱۲۵۱ھ) جو نواب موصوف کے ہم عصر تھے اپنی تصنیف ”غبارِ گلشن“ (بنوالہ
 سعادت یار خاں رکنی از: ڈاکٹر صابر علی خاں م ۳۳۳) میں لکھتے ہیں۔ ”غیر وزیر

جمہر کے میں نواب احمد بخش خاں کو بخیر اور خلیق جان کر ہزاروں محتاج آتے ہیں اور ہر ایک کچھ نہ کچھ پاتا ہے۔ باوجود ہجوم کے کبھی ترش رو نہیں ہوتا۔ لوگ کہتے ہیں کہ اتنا خرچ نہ کرو لیکن اس کا رواداس سے بھی صد چند کا ہے۔ بادشاہ دلی نے اس کو فرمایا۔

دام حق میں ملے کو گریاں لئے

جتنا پیاں دے اس سے وہ صد چند پائے

(۲۳) ”ہری چک“ تہ فابر چائی کو کہتے ہیں۔ گویا وہ ایک جانور ہے کہ جہاں ہری گھاس پاتا ہے جرتا ہے۔ جب وہ نہ رہے تو جہاں اور ہری گھاس دیکھتا ہے وہاں موجود ہوتا ہے۔

(۲۵) یہ غزل دایم معروف مطبوعہ میں ص ۱۰۳ پر درج ہے۔ کل شعر ۹ ہیں۔

(۲۶) بحوالہ سعادت یار خاں از ڈاکٹر صابر علی خاں مطبوعہ کراچی ۱۹۵۶ء ص ۲۶۳ تا

ص ۲۶۸

(۲۷) ”صاحب کے مول پڑتا“ دلی کا محاورہ ہے۔ یعنی بہت جو جیاں پڑتا۔

(۲۸) حسام الدین حیدر خاں تائی (شاگرد میر مستحسن خلیق و میر تقی میر) مرزا محمد غیاث کے بیٹے اور ذوالفقار الدولہ نجف خاں (۱۱۹۶ھ / ۶ / اپریل ۱۸۲۷ء) کے داماد تھے۔ حالی نے انھیں کے متعلق لکھا ہے کہ لکھنؤ کے قیام کے زمانے میں انھوں نے غالب کی غزل میر کو سنائی تھی اور میر نے سن کر کہا تھا کہ اگر کوئی استول کیا تو لا جواب شاعر بن جائے گا ورنہ مہمل کہنے لگے گا۔ یہ بھی قیاس ہے کہ انھیں ہندگ کی صحبت میں غالب نے مذہب لایا یہ اختیار کیا ہوگا۔ لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ بیشتر دلی میں ملی مدائن میں اپنی ہی تعمیر کرائی ہوئی شان دار حویلی میں رہتے تھے۔ ۱۸۳۶ء میں انتقال کیا۔ معروف کے ہم مرتھے۔

(۲۹) ولادت ۱۸۵۲ء وفات یکم ستمبر ۱۹۳۰ء

(۳۰) بیان محررہ ۶ / جنوری ۱۹۱۳ء مطبوعہ معیار ممبئی ۱۹۳۶ء

(۳۱) مجھے یہ کھل قطعہ جناب ڈاکٹر حسن آرزو سہرانی کی عنایت سے حاصل ہوا۔

(۳۲) یہ نسخہ مجھے میرے دوست جناب عبدالصمد خاں نے عنایت فرمایا تھا۔ اس پر کبھی ہنگ

سے مضمون لکھا جائے گا۔

(۳۳) یہ غالب اسی طرح ہے جس طرح غالب نے ایک جگہ خط میں اپنے آپ کو غالب علی شاہ لکھا ہے۔

(۳۴) احوال غالب، مختار الدین احمد (بار دوم) ص ۸۰/۷۰ ص ۲۵۰

(۳۵) اس کتاب (خاص کر اشعار احسان) میں اتنی غلطیاں ہیں کہ بیشتر مقامات پر متن غیر معتبر ہو کر رہ گیا ہے۔ اس لیے کئی جگہ قیاس سے تصحیح کرنی پڑی۔

فخر الدولہ دلاور الملک نواب احمد بخش خاں بہلور رستم جنگ

پچھلی صدی ہجری میں سادات طوی میں سے ایک بزرگ خواجہ احمد یوسفی (ف: ۷۵۳ھ) باب ارسلان (ترکستان) کے مشہور ولی اللہ گزرے ہیں، (یہ حضرت علی کے چھوٹے صاحبزادے محمد بن الحنفیہ کی نسل میں سے تھے) انھوں نے سلسلہ نقشبندیہ کے مشہور شیخ حضرت خواجہ یوسف ہمدانی سے آکساب فیض کیا اور انھیں سے سند خلافت لی۔ ترک انھیں اوب اور عقیدت سے "آئیوی" سے خطاب کرتے تھے۔ ان کی ولادت میں دین و دنیا کے مشاہیر پیدا ہوئے۔ انھیں میں سے ایک خواجہ محمد امین حکومت بخارا میں سلطان بیگی کے عہدہ بعلیلہ پر فائز تھے۔ خواجہ محمد امین کے صاحبزادے خواجہ عبدالرحمن خاں خاتمہ دیہات اور مہتمم دارالطرب شاہی رہے۔ اگرچہ یہ خاندان نسب کے لحاظ سے طبقہ سادات میں سے تھا مگر شاہی منصب دار ہونے کے باعث مورخوں اور تذکرہ نگاروں نے ان کا ذکر مرزا اور جان کے القاب سے کیا ہے۔

خواجہ عبدالرحمن کے تین صاحبزادے تھے۔ قاسم جان، عالم جان، عارف جان، مرزا عارف جان سب سے چھوٹے تھے۔ یہ تینوں بھائی احمد شاہ (۷۴۸ھ اور ۷۵۳ھ) کے عہد میں ترکوں کا ایک مسلح دستہ ساتھ لے بخارا سے ۷۵۳ھ کے قریب ہندوستان آئے۔ اس زمانے میں وسطی ایشیا (ماوراءالنہر) کی سکونت انتہائی سیاسی افرا تفری کے باعث ناممکن ہو گئی تھی۔ اسی سے یہ خاندان ترک وطن پر مجبور ہوئے انہوں نے حکومت دہلی کی طرف سے مرزا محمد بیگ

انک کے صوبہ دار تھے۔ یہ قافلہ چند دن ان کے پاس ٹھہرا۔ اسی اثنا میں صوبہ دار موسوی نے مرزا عارف جان کو اپنی فرزند بی بی میں لے لی اور اپنی دختر باندہ اختران کے خیال عقد میں دے دی۔ اس کے بعد ایک عرصے تک مرزا عارف جان یہاں رہ کر علاقے کے نظم و نسق میں مرزا محمد بیگ کی مدد کرتے رہے۔ آخر ان کی شجاعت اور قابلیت کی شہرت اس دور دست علاقے سے نکل کر پایہ تخت دہلی تک جا پہنچی اور یہ حسب طلب شاہ عالم کے عہد میں (۱۷۵۹ء-۱۸۰۶ء) دارالخلافت میں حاضر ہوئے۔ (مرزا عارف جان کے چار بیٹے ہوئے۔) بی بی بخش خان، احمد بخش خان، الٰہی بخش خان اور محمد علی خان ان میں سے احمد بخش خان اور الٰہی بخش خان نے شہرت و دام کے غلبہ حاصل کیے۔ یہی وہ الٰہی بخش خان ہیں جو اردو زبان میں معروف کے شخص سے مشہور ہیں، وہ حضرت مولانا فخر الدین چشتی (ف: ۱۱۹۹ھ) کے مرید خاص اور خلیفہ تھے۔ معروف نے اگر علم و فضل اور تصوف و سلوک کے میدان میں شہرت حاصل کی، تو ان کے بڑے بھائی احمد بخش خان نے ریاست و جہاد بانی کی دنیا میں اپنا سکہ چا دی کیا۔

احمد بخش خان انک میں ۱۷۶۵ء میں پیدا ہوئے۔ جب خاندان دلی منتقل ہوا تو یہ بھی یہاں آگئے۔ جوانی کا زمانہ یہیں گزرا۔ پہلے گوالیار میں بزمہ سواراں ملازم ہوئے۔ مقتول ہر اوقات تھی، لیکن کسی سبب سے یہ روزگار ہاتھ سے جاتا رہا اس کے بعد گھوڑوں کی تجارت کرنے لگے۔

ایک مرتبہ اسی سلسلے میں ایک گھوڑا لے کر اجیر گئے۔ خیال تھا کہ عرس کے موقع پر گھوڑا اچھے داموں بک جائے گا۔ لیکن کوشش کے باوجود گھوڑا فروخت نہ ہوا۔ اس وقت ان کا ہاتھ بہت تنگ تھا اور روپے کی سخت ضرورت تھی۔ خدا کی شان کہ ایک دن درگاہ میں پہنچ کے تضرع سے دعا کی، اس کے بعد گھوڑا منہ مانگی قیمت پر بک گیا۔ اپنے مقصد میں کامیابی کے بعد یہ شادان و فرحان واپس دلی آ رہے تھے کہ راستے میں مہاراجا راجا بخاور سنگھ دلی اور سے ملاقات ہو گئی۔ انھوں نے احمد بخش خان کو اپنے ہاں ملازمت پیش کی۔ یہ بے کار تو تھے ہی، اس پیش کش کو بے خوشی قبول کر کے مہاراجا کے ساتھ اور چلے گئے۔^۲

جب انگریزوں اور ریاست اور میں مجاہدہ و ملاقات ہو، تو مہاراجا نے انگریزوں کے ہاں

اپنے مفاد کی نگہداشت کے لیے احمد بخش خان کو اپنا وکیل مقرر کر دیا۔ اس عہدے کی حیثیت تقریباً وہی تھی جو آج کل سفیروں کی ہوتی ہے۔ یہاں احمد بخش خان نے اپنے فرائض منصبی اس خوش اسلوبی سے سر انجام کیے کہ جہاں ایک طرف مہاراجا ان سے ہر طرح خوش اور مطمئن تھے، وہیں انگریز کو بھی ان کی معاملہ فہمی اور حزم و تدبیر پر دلچسپی تھی۔ اسی زمانے میں انگریزوں کی ریاست بھرت پور سے چمڑگنی اور انھوں نے ڈایک کے قلعے پر چڑھائی کر دی۔ احمد بخش خان نے زور لگایا کہ مہاراجا اور اس موقع پر انگریزوں کا ساتھ دیں اور وہ اس میں کامیاب ہو گئے۔ چنانچہ ریاست الود نے سواروں کا ایک دست خود احمد بخش خان ہی کی کمان میں بہلور تک بھیج دیا اور سالانہ رسد، خوراک وغیرہ سے بھی پوری مدد دی۔ بسواڑی کی جنگ میں انگریز سپہ سالار (فریزر) کے گولی لگی۔ قریب تھا کہ وہ گھوڑے سے گر جائے کہ احمد بخش خان نے ٹپک کے اسے سنبھال لیا اور اچھل کر اس کے پیچھے گھوڑے پر سوار ہو گئے اور لڑتے بھڑتے اسے دشمنوں کے زرخے سے نکال لائے۔ لیکن فریزر کا زخم ایسا گہرا تھا کہ وہ جاتہرہ ہو گیا۔ البتہ مرنے سے پہلے اس نے اس حادثے کی مختصر روداد اور احمد بخش خان کی جان بڑی کا حال ایک کاغذ پر لکھ کے ان کے حوالے کیا، جس میں انگریزی حکومت سے سفارش کی کہ ان کی خدمات کا مناسب اعتراف کیا جائے۔ یہ سند خانداناب بھی ریاست لوہارو کے کاغذات میں موجود ہے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ جب فتح گارہ پار منعقد ہوا تو کمانڈر ان چیف، لارڈ ایک نے انھیں مفتوحہ علاقے میں سے جاگیر استمراری کے طور پر فیروز پور، جھڑکا، پونا پتا، پنچور، سانگرس، جھینڈ وغیرہ کے اضلاع عطا کیے اور سند میں ان کا نام لکھوایا۔ فخر الدولہ، دلاور الملک، نواب احمد بخش خان، بہادر، ستم جنگ، مہاراجہ بختاؤر سنگھ بھی دربار میں موجود تھے، اسی موقع پر لارڈ ایک نے انھیں بھی ۱۳۰۰ محال جاگیر میں عطا کیے تھے۔ مہاراجا نے خاموش رہنے میں اپنی اتنی خیالی کی اور پرگنہ لوہارو (جو ریاست الود کا حصہ تھا) اپنی طرف سے احمد بخش خان کو مرحمت فرمایا اور اس طرح اس کے بعد احمد بخش خان، نواب احمد بخش خان والی فیروز پور جھڑکا لوہارو ہو گئے۔

الود کے قیام کے زمانے میں نواب احمد بخش خان کے پاس ایک مقامی عورت سندھی نام رہی تھی۔ اس کے بطن سے ان کے چار بیٹے ہوئے، دو لڑکے شمس الدین خان اور ابراہیم علی

خان اور دو لڑکیاں نواب بیگم اور جہانگیرہ بیگم۔ بعد کو اسی نواب بیگم کا نکاح زین العابدین خان عارف سے ہوا تھا۔ جہانگیرہ بیگم ایک ایسی لڑکی تھی جس نے اپنے والدین میں بیابانی مچائی تھی۔ ان کے شوہر کا نام محمد اعظم خان تھا۔ یہ لوگ انگریزوں میں رہتے تھے اور ممکن ہے کہ اس خاندان کے نام نواب بھی موجود ہوں۔

اب نواب احمد بخش خاں نے ایک ہم کفو بیگم سے شادی کر لی۔ ان کا نام بیگم جان تھا اور یہ ایک برلاس مغل نیاز محمد بیگ کی بیٹی تھیں۔ بعد کو لوہارو میں یہ خاندان ”پشتان فیملی“ کے نام سے مشہور ہوا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ بیگم جان کے ایک بھائی نذر محمد بیگ لوہارو کی فوج میں کپتان مقرر ہو گئے تھے۔ بیگم جان کا شمار ۱۸۶۶ء کو انتقال ہوا۔

بیگم جان کے بطن سے نواب احمد بخش خاں کے ساتھ بیٹے ہوئے۔ امین الدین احمد خاں اور ضیاء الدین احمد خاں دو بیٹے اور منور جہان بیگم، یارخ بیگم، بادشاہ بیگم، حاجی بیگم وغیرہ وہ پانچ بیٹیاں۔

اظہار محسوس الدین خان کے وارث ریاست ہونے کا کوئی امکان نہیں تھا کیوں کہ ان کی والدہ نواب احمد بخش خاں کی بیٹی تھیں تھیں۔ اسی وجہ سے خاندان کے چھوٹے بڑے، ایک سرے سے دوسرے سرے تک سب کے سب ان کے خلاف تھے اور انھیں اپنے برابر کا نہیں سمجھتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود نواب احمد بخش خاں نے انھیں مددگار کا وارث قرار دے دیا۔ اس کا ایک سبب تھا۔

مہاراجا بختاور سنگھ کے پاس ایک طوائف موسیٰ نام تھی اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ عورت اس عہد کی بہن یا کم از کم قریبی رشتہ دار ضرور تھی، جو نواب احمد بخش خاں کے گھر میں تھی۔ موسیٰ سے مہاراجا کے دو بیٹے ہوئے۔ ایک لڑکی چاند بانی اور ایک لڑکا بلونت سنگھ۔ مقامی رواج کے مطابق ایسی اولاد حق نہایت نہیں رکھتی اور خواہ اس مال کہلاتی تھی۔ اس لیے بلونت سنگھ کے والد کی گدی پر بیٹھنے کی کوئی توقع نہیں تھی۔ عہد ہی کے اثر کے تحت یا کسی اور سبب سے نواب احمد بخش خاں، بلونت سنگھ کے حامی تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مہاراجا کے بیٹے بنے سنگھ کے بیٹے کے لوگ ان کے مخالف ہو گئے اور انھوں نے انعام و اکرام کے وعدے پر ایک سید کو تیار کیا کہ وہ ان کا کام تمام کر دے۔ چنانچہ ایک رات جب نواب دلی میں اپنی ملکیت

نور پاش (واقع آزاد پور) میں اسکیے مقیم تھے، اس قسطن نے ان پر سوتے میں حملہ کر دیا۔ ہارے، وار لو چھاپڑا۔ جان تو بچ گئی، لیکن زخم بہت شدید آئے اور بائیں ہاتھ کی ایک انگلی کٹ گئی۔ ۵۔

نواب احمد بخش خان نے مہاراجا بنجارہ سنگھ کو متاثر کرنے کے لیے ایک اور اقدام کیا۔ اولاً مدنی کو بہو خاتم کا لقب دے کر اپنی ہاتھ دے دیو تسلیم کر لیا اور پھر شمس الدین خاں کو فیروز جہر کا کی گدی پر بٹھانے کا فیصلہ کیا۔ یہ اس لیے تاکہ کسی طرح الور کے لیے ایک مثال قائم ہو جائے اور وہاں بلونت سنگھ کا حق تسلیم ہو سکے۔ لیکن انھیں اپنے مقصد میں کامیابی نہیں ہوئی، مہاراجا بنجارہ سنگھ کے بعد ان کا بھتیجا بنے سنگھ ہی الور کا حکمران بنا اور بلونت سنگھ نظر انداز کر دیا گیا۔

شمس الدین خان سے اپنے خاندان کی مخالفت، نواب احمد بخش خان سے غلطی نہیں تھی۔ چھوٹا بیٹا ابراہیم علی خان صفر سنی ہی میں فوت ہو گیا تھا۔ اب انھیں تشویش تھی تو امین الدین خان اور ضیاء الدین خان کی۔ کیوں کہ گمان غالب تھا کہ خاندان کی مخالفت نہ روش کا ضیاء نہ ان دونوں کو بھگتتا پڑے گا اور شمس الدین خان صاحب جاہ و مال ہو جانے کے بعد ان کی خبر تک نہیں پوچھے گا۔ اس لیے احمد بخش خان نے پیش بندی کے طور پر تقسیم وراثت کا انتظام اپنی زندگی میں مکمل کر دیا، حالانکہ اس سے پہلے ۲۳ / اگست ۱۸۸۷ء کی وصیت کے مطابق انھوں نے تین بیٹوں (نواب فیض اللہ بیگ خان، میر دلالی بخش معروف اور لالہ گوردھن داس) کو یہ اختیار دیا تھا کہ وہ ان کی موت کے بعد جسے چاہیں گدی پر بٹھادیں۔ ۶۔ لیکن اب انھوں

نے اسے منسوخ کر کے ۱۸۴۲ء میں حکومت انگریزی اور دربار الور کی منظوری سے یہ فیصلہ کیا کہ میرے بعد فیروز پور جہر کا کی گدی پر شمس الدین خاں بیٹھے اور لوہارو دوسری بیگم کے دونوں بیٹوں کے جسے میں آئے۔ اس فیصلے کو پختہ کرنے کے لیے انھوں نے فروری ۱۸۴۵ء میں شمس الدین خاں سے بھی ایک دستاویز لکھوائی کہ میں بطیب خاطر لوہارو کا پرگنہ اپنے دونوں بھائیوں کو دینا منظور کرتا ہوں بشرطے کہ وہ ہمیشہ میری اطاعت کرتے رہیں اور اس دستاویز پر جرنیل اختر لونوی اور سر چارلس مکاف کے دستخط بطور گواہ کرا لیے۔ مقدمہ لڈکرانہ ایام میں دہلی میں انگریزی ریڈیٹنٹ تھے۔ لیکن اس کے باوجود انھیں اس کا پورا طریقہ ان نہیں

تھا کہ شمس الدین خان اپنے دونوں بھائیوں کے حق میں انصاف کرے گا۔ پھر سونچ بچاؤ کے بعد اس انڈینٹ کاسد باب انھوں نے یوں کیا کہ اکتوبر ۱۸۴۶ء میں وہ ریاست کے کاروبار سے خود بخود دست بردار ہو گئے اور اس تقسیم پر ان کی صحت حیات ہی میں عمل درآمد شروع ہو گیا۔

نواب احمد بخش خاں لمبے عرصے تک لارڈ ایک کے ساتھ رہے اور اسی زمانے میں مرزا نصر اللہ بیگ علم نواب سے ملاقات ہو گئی کیوں کہ مرزا نصر اللہ بیگ کا ایک رسالہ بوقت ضرورت لارڈ ایک کے ساتھ رہ کر لڑائی میں حصہ لیا کرتا تھا۔ نواب احمد بخش خاں صاحب کے ان تعلقات کے باعث ان کی اپنی ہمشیرہ کا نکاح مرزا نصر اللہ بیگ سے ہو گیا۔ ان کے بطن سے فتح اللہ بیگ عرف رجب بیگ پیدا ہوئے تھے^۸۔ معلوم ہوتا ہے کہ بیگم نصر اللہ بیگ خاں علم نواب، ہمشیرہ نواب احمد بخش خاں زیادہ دنوں زندہ رہیں اور بیٹے کو جنم دے کر جنت کو سدھار گئیں۔ ہو سکتا ہے کہ ان کی موت بچے کی ولادت کے سبب ہی ہوئی ہو۔ واللہ اعلم بالصواب۔

نواب احمد بخش خاں مولانا فخر^۹ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مرید تھے اور عروج نوابی سے پہلے سے ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ ایک مرتبہ وضو کرانے لگے تو انھوں نے فرمایا کہ ”اکو والی میوات“ اور اسی وجہ سے جب وہ والی میوات ہو گئے تو انھوں نے اپنا خطاب فخر الدولہ منتخب کر کے گورنمنٹ سے تسلیم کر لیا۔ یہ خطاب ۱۹۳۷ء تک فرمانروایان لوہارو^{۱۰} کا رہا۔

نواب احمد بخش خاں لارڈ ایک کے ساتھ دوش بدوش ششیر ذنی میں حصہ لیتے رہے۔ ۱۸۰۱ء میں جب کہ وہ خود مختار رئیس قرار دیے گئے، فیروز پور جہلم میں اپنی ریاست کے انتظام میں مصروف رہے اور ایک مرتبہ لوہارو بھی گئے اور تعمیر نظام کا حکم دے کر واپس آ گئے۔ نواب خسرو مرزا، معظم زمانی بیگم عرف بیگم صاحبہ کی زبانی بیان کرتے ہیں کہ ان کے متھ اور ہاتھوں پر زخموں کے نشانات تھے اور دایاں ہاتھ باوجود مندرج ہونے کے چھپے سے کھاتے تھے۔ اکتوبر ۱۸۴۷ء میں بہ عمر ۶۳ سال وفات پائی۔ جب ان کی وفات ہوئی اس

وقت نواب شمس الدین احمد خاں پسر اکبر جو ۱۸۰۹ء میں پیدا ہوئے تھے، کی عمر ۱۸ سال کی تھی۔ نواب امین الدین احمد خاں جو ۱۸۱۳ء میں پیدا ہوئے تھے ان کی عمر ۱۳ سال کی تھی اور نواب فیاض الدین احمد خاں نیز درختیہ ۱۸۲۱ء میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کی عمر چھ سال کی تھی یہ دونوں بھائی برادران طائی تھے اور شمس الدین احمد خاں کے چھوٹے بھائی جو ان کے حقیقی بھائی تھے۔ ان کا نام ابراہیم علی خاں تھا۔ ان کی تاریخ ولادت معلوم نہ ہو سکی۔

تاریخ و قات ۱۸۳۳ء^{۱۱} ہے۔ جب نواب احمد بخش خاں کا جنازہ حضرت بخشیار کاکی رحمت اللہ علیہ کی درگاہ میں پہنچا تو ان کا سردار جو تیار ہو گیا تھا اس کے معاوضہ کی طلبی پر جو وہاں کے خدام نے کی تھی اس کو رد چوں سے بھرو دیا گیا تھا گویا یہ اس کا معاوضہ تھا۔ جب خدام روپیہ لے چکے تو انھوں نے اس پر آکھانہ کرتے ہوئے جنازہ رکھنے کے لیے مزاحمت کی اور کہا کہ یہ روپیہ ناکافی ہے۔ ایک شور و غل مچا ہو گیا تو بلونت سنگھ لاہور کی تخت نشینی میں نواب احمد بخش خاں نے جس کی طرف داری کی تھی وہاں موجود تھے۔ انھوں نے دریافت کیا کہ کیا باپ کو رکھتے نہیں دیتے؟ یہ کہہ کر اس نے اپنی زبان میں رسالہ کے نو جوانوں سے مخاطب ہو کر کہا کہ ”فخار اب کائیں دیکھو جیسے“ میں اس کا کہنا تھا کہ فخر کروں نے فخر میں نکال لیں اور خدام بھاگ گئے۔

ایک بہادر جنگجو نواب کی زندگی جس طرح تلواروں اور جنگ آزمائی کے ساتھ گزری اسی طرح وہ تلواروں کی آب و تاب میں دفن ہوئے۔ ان کے سر ہانے ایک سنگ مرمر کا ستون کھڑا کیا اور اس پر مینو مقام فخر الدولہ ۱۲۴۳ھ تاریخ وفات کندہ کرائی اور اس خاص ستون کا چاروں طرف ان کا لحد ہزارہ تاریخ نکال کر کندہ کر لیا۔

ذیل میں تاریخ راجگان ہندو قانع راجستھان (ابولکیم محمد ٹھما لکنی خان مطبوعہ دوم برقی پریس لکھنؤ ۱۹۴۷ء) سے چند حوالے دیے جاتے ہیں جو نواب احمد بخش خاں کی حیات پر وضاحت سے روشنی ڈالتے ہیں۔

۱۔ لاہور کے راجہ راجہ پر تپ سنگھ نے ۶ ستمبر ۱۷۹۱ء کو پچاس سال کی عمر

میں انتقال کیا۔ ”اس کے بعد..... بنگال اور سنگھ جو قریب رشتہ داری

کے سبب گوندیا گیا تھا مالک بن۔“ (ص ۳۶۳)

۳۔ بخاور سنگھ نے ۱۷۹۳ء میں کپاون علاقہ مارواڑ میں شادی کی۔ وہ اس وقت تک ”خطاب راجگی سے..... سر فراز نہ تھا۔“ سرگرم کوشش کے بعد ”خطاب مہار اور راجہ مع ماہی مراتب سرکار شاہی سے حاصل کر کے ریمیسوں میں شہر پانے لگا۔“ (ص ۳۶۵)

(تاریخ جدویہ) (انٹشی خام علی مطبوعہ ۱۲۷۰ھ / ۱۸۵۳ء) کے ص ۸۳ پر درج ہے کہ تھارا کا علاقہ انگریزوں نے راجہ بخاور سنگھ سے اگست ۱۷۹۹ء میں فتح کیا۔ ظاہر ہے کہ احمد بخش خاں اس وقت تک راجہ بخاور سنگھ سے نہیں ملا تھا ورنہ انگریزوں کے صلے کی نوبت ہی نہ آتی۔)

۴۔ (۱۹ ستمبر ۱۸۰۳ء اور اکتوبر ۱۸۰۳ء کے مابین کسی وقت) ”نواب احمد بخش خاں خلیفہ و کاتب ریاست (الور) سے سر فراز ہوا۔ چوں کہ اس وقت (۱۹ ستمبر ۱۸۰۳ء) سرکار انگلیشہ کا دہلی پر قبضہ و تصرف ہو گیا تھا۔ نواب احمد بخش خاں نے اطاعت سے حکام انگریزی میں رسوخ حاصل کر کے باہم راجہ (بخاور سنگھ) اور سرکار انگریزی میں طریقہ اتحاد جاری کیا۔

(”سواڑی کی لڑائی میں) لارڈ ایک نے ان (مرہٹوں) کے لشکر کو تہ و بالا کر دیا اور بھاگے ہوئے مرہٹوں کا نواب احمد بخش خاں..... نے پیچھا کر کے بہت نقصان پہنچایا۔ اس خیر خواہی کے صلے میں راجہ بخاور سنگھ کو کئی پرگنے..... دیے گئے اور خاص کارگزاری کے سبب نواب احمد بخش کو سرکار انگریزی کی طرف سے پرگنہ فیروز پور انعام میں ملا اور راجہ (بخاور سنگھ) نے اپنی طرف سے حسن خدمات کے جلدو میں نواب احمد بخش خاں کو سنے علاقے میں سے پرگنہ لوہارو جاگیر میں عطا کر کے۔“ (ص ۳۶۵)

۵۔ ”۱۵ ستمبر ۱۲۳۰ھ (۲۷ جنوری ۱۸۱۵ء) کو چوہی میں برس راج کرنے کے

بعد راجہ راجہ (بختاور سنگھ) نے چالیس سال کی عمر میں دہر تپا نندہ سے انتقال کیا۔ ان کے مرنے کے بعد موسیٰ نام طوانف سے جو اس کے ساتھ سنی ہو گئی ایک جٹا بلونت سنگھ اور ایک لڑکی چاند کنور (جس کا بیواہ کان سنگھ تھا کر خاں پور سے ہوا تھا) باقی رہی اور بھتیجا بنے سنگھ راجہ داندے کے قاعدے سے مستطی سمجھا گیا جس سے کچھ مدت تک راجہ کے دو حصے ہو گئے۔“ (ص ۳۶۸)

۵۔ ”بختاور سنگھ کے انتقال کے بعد خاں کروں نے بلونت سنگھ کی مسند نشینی تاجپائز قرار دے کر بنے سنگھ پر اور ذوالا بختاور سنگھ کو مسند نشین کرنا چاہا لیکن مسلمان اور چیلے اس بارے میں ان سے متفق نہ ہوئے اور بلونت سنگھ کے جانب دار ہو گئے۔ اسی لیے رفع فساد ضرور ہوا اور دونوں کی مسند نشینی پر اتفاق کیا گیا چنانچہ ماہ سعدی تیج سبت ۱۱۷۸ھ کو دونوں مسند نشین ہوئے، نواب احمد بخش خان نے سب سے اقرار نامہ تحریر کر لیا کہ بعد بلوغ نصف نصف مل و ملک ان کو تقسیم کیا جائے اس سے تین برس کے بعد پر گنہ اوچو گڑھ کا نواب احمد بخش خان نے غمیکہ لیا، تاریخ ۱۲ ربيع الاول ۱۲۳۲ ہجری کو نواب کا دخل پر گنہ حجاز لوچو گڑھ میں ہو گیا، کالے خان مختلم مقرر ہوا، جس جگہ ریاست کا محل ہے وہاں سابق میں مسجد تھی جس کو پنڈالوں نے اپنے عہد میں بنوایا تھا اسی جگہ کالے خان نے اپنے رہنے کو بنگلہ بنوایا۔ جب دونوں راجے سن بلونت کو پہنچے، آپس میں اختلاف کرنے لگے، اب ریاست کے اہلکاروں کے دو فریق ہو گئے۔ نواب احمد بخش خان کو ابتدا سے بلونت سنگھ کی جانب داری ملحوظ تھی اس وجہ سے بنے سنگھ کی جانب دار نواب کے دشمن ہو گئے اور ملاوٹو شمال و جہاز چیلوں اور تندرام دیوان لے ایک سید سے کہا کہ اگر تو نواب کو مار ڈالے تو چھ ہزار روپیہ نقد اور ایک گاؤں تجھ کو دیا جائے گا اس نے اس کام پر آمادگی ظاہر کی۔

آٹھ ماہ تک واکوں گھات میں رہا مگر موقع نہ ملا آخر کار ۲۰ شعبان ۱۲۳۸ ہجری کو دہلی میں قابو پا کر رات کو خواب گاہ میں جاگسا اور سوتے میں نواب پر سکوار کے تین وار کیے۔ تیسری ضرب میں سکوار ٹوٹ گئی تب وہاں سے نکل کر بھاگا اپنی دانست میں وہ کام تمام کر چکا تھا لیکن نواب کی زندگی باقی تھی کوئی زخم کاری نہ لگا اور مجھ قصا سے نجات پائی جراحت خفیفہ کا ڈاکٹری علاج ہونے لگا تھوڑے عرصہ میں شفا پائی مگر چھل سحت کیا۔ یہ مجرم فرار ہو کر الور پہنچا اور انعام مقررہ کا خواست گار ہو اتر غیب و ہند سے اوائے انعام میں حیلہ و حوالہ کرنے لگے اس لیے باہم نزاع پیدا ہو کر راز آشکار ہو گیا یہ بلونت سنگھ نے گرفتار کر لیا اور اب اس نے مفصل ماجرا بیان کیا اس کے بیان پر ملاد خوشحال دجہاڑ چیلے اور خندرام دیوان قید کیے گئے رامون خواص فرار ہو کر دہلی کو چلا آیا اور اول نواب احمد بخش خان کی فرد گاہ پر حاضر ہوا نواب نے اس پر توجہ نہ کی اس نے ٹٹنی کرم احمد سرشتہ وار جنرل اکثر لونی ریڈیڈنٹ کو کئی لاکھ روپیہ دینا کر کے اپنا سہو معاون بنایا اور جنرل صاحب سے درستی معاملہ کی شکل نکالی اور وہ اس پر توجہ کرنے لگا یہاں تک کہ ایک دن ملاقات کے وقت نواب احمد بخش خان کو الور کے معاملے اور بلونت کے کام میں سفارش کرنے سے منع کر دیا جب رامون خواص نے اپنے تہہ تدبیر کو نشانے کے سر پر پلایا تو جنرل صاحب سے کہا کہ بعض مفسدوں نے بلونت سنگھ کو اغوا کر کے الور میں فساد کا نقشہ بنانا چاہا ہے اگر حکم ہو تو اس کا انداد عمل میں آئے انھوں نے اس کو اجازت دے دی رامون خواص نے اتنا سہا رہا ہے ہی جتنے سنگھ کو لکھ بھیجا کہ بجز بلونت سنگھ کے اس کے دوسرے مددگاروں کا جملہ کام تمام کر دیں۔ یہ شہ پاکر بنے سنگھ کے طرف دار راج پوتوں نے جمع ہو کر شہر کے دروازوں کا بندہ دست کر لیا اور محل

پرورش کی، بنے سنگھ کو تو اسکے سنگھ کی حویلی میں پہنچادیا اور نصف شب سے جنگ وجدال شروع کر دی پھر دن چڑھے بلونت سنگھ نے مکان میں چلا گیا اس کے چاہب داروں میں سے دس آدمی مارے گئے اور باقی نے ہتھیار ڈال کر لمان چاہی خود تو صحیح و سالم چھوڑ دیئے گئے مگر اسباب سارا جین لیا گیا تھا کرلی جی، کپتان فاسٹ اور نامی صاحب قید ہوئے اور بلونت سنگھ نظر بند رہا یہ لڑائی اور میں محل راسر کے نام سے مشہور ہے کہ مین محل کے اندر واقع ہوئی تھی یہ خبر من کر جنرل اکٹر لونی نے بنے سنگھ کی طرف داری کی اور اس کی حق داری مان کر صدر کو رپورٹ کی اور نواب احمد بخش خان نے اس کے برخلاف بلونت سنگھ کی چاہب داری میں گورنر جنرل کی خدمت میں تحریر بھیجی جہاں سے ریٹرنڈ کو الور کے معاملات میں نواب کی رائے کے ساتھ کام کرنے کی ہدایت ہوئی اس پر مجبور آرینڈنٹ کو نواب سے اتفاق کرنا پڑا چونکہ اس زمانے میں نکلنے کی طرف کچھ خرچہ تھا، فوج اس چاہب جاتی تھی اس سبب سے الور کے فیصلے میں تعویق ہوئی نواب احمد بخش خان نے فیروز پور آکر اجارہ تھار اور پنڈکڑ سے دست کشی اختیار کی۔ ۲۰ محرم ۱۳۳۹ ہجری کو بھوانی بخش عالی تھار پر راسون خواص کی طرف سے مقرر ہو کر گیا اور تھارے کے انتظام نے راج سے پھر تعلق پکڑا تھوڑے دنوں کے بعد جنرل اکٹر لونی بے پور (الور) کی طرف چلا راسون خواص اور نواب احمد بخش خان ہمرہ تھے۔“ (۳۶۸/۳۶۹)

۶۔ ”نواب احمد بخش خان سائی تھا کہ نصف ملک بلونت سنگھ کو دیا جائے لیکن بہت سی بحث و گفتگو کے بعد علاقہ الور میں سے چار لاکھ روپیہ سالانہ کی جاگیر جو اس وقت الور کی تھائی آمدنی تھی بلونت سنگھ کو مدد معاش کے لیے دی جانی تجویز ہوئی اس لیے دو لاکھ آمدنی کا پرگنہ تھارا

دبھو گڑھ مانڈنہ کرنے کوٹ ومنڈا در دیا گیا اور دو لاکھ روپے سالانہ
نقد بھوض کشن گڑھ و کشور مقرر ہو کر اقرار نامے میں یہ شرط لکھی
گئی کہ اس کے بعد خاص اولاد جاگیر کی حق دار رہے گی اور اولاد ہونے
کی صورت میں جاگیر واپس راجہ پور کے شافی ہو جائے گی۔

بہت سے دوسرے ماخذوں کی چھان بین کے بعد اور درج بالا اقتباسات سے جو سلاحدہ
عالب (دوسرا ایڈیشن) نمبر ۱۷۱ غالب، امہار الغالب، جلوہ محیطہ، کڑویں، تاریخ راجگان ہندو
قاری راجستان، تاریخ ہدیہ، مشنری انجیساہ و انتشار اور فال آف دی مغل ایمپائر جلد ۳ سے
اخذ کیے گئے ہیں درج ذیل کوائف مستخرج ہوتے ہیں۔

۱۷۵۲ء کے لگ بھگ قاسم جان، عالم جان اور عارف جان تین بھائی
ہندوستان آئے اور انک میں حکومت دہلی کی طرف
سے مرزا محمد بیگ صوبیدار انک کے یہاں عارضی
طور پر ٹھہرے۔

عالم جان قاسم جان اور عالم جان چند دنوں کے بعد دہلی کی
طرف روانہ ہو گئے مگر عارف جان کئی برس
مرزا محمد بیگ کے یہیں ٹھہرے رہے اور کام میں ان
کی مدد کرتے رہے۔

۱۷۶۰ء کے لگ بھگ مرزا محمد بیگ کی بیٹی سے عارف جان کی شادی۔

۱۷۶۳ء کے لگ بھگ عارف جان کا پہلا بیٹا نبی بخش خاں پیدا ہوا۔

۱۷۶۵ء کے لگ بھگ عارف جان کا دوسرا بیٹا احمد بخش خاں پیدا ہوا۔

۱۷۶۶ء (شروع سال؟) عارف جان، شاہ عالم (۱۷۵۹ء - ۱۸۰۶ء) کی طبی پر

دہلی (مع عیال و اخلا) چلے آئے قیاس ہے کہ

احمد بخش خاں تین برس کی عمر تک یعنی مولانا

نضر الدین چشتی کی وفات تک دہلی ہی میں رہے۔

دہلی میں انکی بخش خاں، عارف جان کا تیسرا بیٹا پیدا

ہوا۔

۱۷۶۶ء (آخر سال؟)

۱۷۸۵ء / ۲۰ نومبر

مولانا فخر الدین چشتی کی وفات۔ احمد بخش خاں ان سے بیعت تھے۔ ایک دن جب احمد بخش خاں انھیں وضو کرا رہے تھے تو مولانا صاحب نے احمد بخش خاں کو دالی میوات کہہ کے پکارا جو بلا خرچ ثابت ہوا۔

۱۷۸۶ء (ستمبر؟) ۱۷۹۹ء

اس بارہ تیرہ سال کے عرصے میں احمد بخش خاں پہلے گوالیار میں پڑمرا سواراں ملازم ہوئے۔ مگر کسی سبب سے یہ روزگار ہاتھ سے جاتا رہا۔ پھر گھوڑوں کی تہمت کرنے لگے۔ انھیں ایام میں (اگست ۱۷۹۹ء کے بعد) اجیر سے واپس آتے ہوئے راجا بختاؤر سنگھ دلی پور سے ملاقات ہو گئی پور ان کی ملازمت میں پور چلے گئے۔

۱۸۰۱ء / ۳۱ جنوری

جنرل لیک کی ہندوستان (نکلت) میں آمد۔ جنرل لیک نے کانپور کو اپنا مسکن بنایا اور موسم سرما وہیں گزارا۔

۱۸۰۲ء

دلی پر انگریزی قبضہ و تصرف۔

۱۸۰۳ء / ۱۶ ستمبر

راجا پور کا انگریزوں کے ساتھ معاہدہ رفاقت۔ احمد بخش خاں پور کی طرف سے انگریزوں کے پاس وکیل ریاست مقرر۔

۱۸۰۳ء (اکتوبر؟)

اپنی بہن کی جانب کے بچپن حضرت اللہ بیک خاں سے شادی۔

۱۸۰۳ء کے لگ بھگ

سوڑی کی لڑائی میں احمد بخش خاں کے ایما پور کا فوجی دستہ بھی انگریزوں کی مدد کے لیے شامل۔ احمد بخش خاں بہت بہادری سے لڑے اور ایک انگریز سپاہ فریر کی جان چلی۔ اس نے انھیں انگریزی حکومت

۱۸۰۳ء یکم نومبر

کے نام سفارشی چٹھی دی کہ وہ احمد بخش خاں کی خدمات کا مناسب اعتراف کرے۔ انگریزوں کی فتح۔ جب فتح کا دور پار منعقد ہوا تو لارڈ کلیک نے راجا بختاؤر سنگھ کو ۱۳۰۰ سال جاگیر میں عطا کیے۔ احمد بخش خاں کا نام سند میں ”فخر الدولہ، ولادور الملک، نواب احمد بخش خاں بہادر، رستم جنگ“ لکھوایا اور جاگیر کے طور پر فیروز پور جمرکا، پوتا پانا، پچھورہ، ساگرس، گھینہ وغیرہ اضلاع عنایت فرمائے۔ پرگنہ لوہارو راجا بختاؤر سنگھ نے اپنی طرف سے اضافہ کیا۔ اس طرح سے احمد بخش خاں، نواب احمد بخش خاں والی فیروز پور جمرکا و لوہارو ہو گئے۔

۱۸۰۳ء/۲۲ دسمبر ۱۳

بہن یعنی زوجہ نصیر اللہ بیگ خان کی وفات۔

۱۸۰۵ء کے لگ بھگ

نصیر اللہ بیگ خان کا انتقال۔

۱۸۰۶ء (اپریل)

احمد بخش خاں کی سفارش پر انگریزوں کی طرف سے نصیر اللہ بیگ خاں کے پس ماندگان کا وغینہ مقرر۔ دس ہزار روپیہ (پہلا شق) پانچ ہزار (دوسرا شق) (جون)

۱۸۰۶ء۔ ۳ مئی

ایک مقامی عورت مدنی سے تعلق

۱۸۰۷ء کے لگ بھگ

گھانا جس آباد گورگانوں کے خدام ہائی میڈ ۱۵ کی دو بیٹیاں تھیں ایک کا نام موسی تھا اور دوسری کا مدنی۔ موسی راجا بختاؤر سنگھ نے اپنے ہاں رکھ لی اور مدنی نواب احمد بخش خاں نے (باقی حالت آگے آئے گا)

۱۸۰۹ء

بچے خمس الدین احمد خاں کی ولادت مدنی کے ہاں

سے (معدی کے بلن سے ایک بیٹا براہیم علی خاں بھی تھا جو صغر سنی ہی میں فوت ہو گیا تھا۔ شمس الدین خاں کو ۸ / اکتوبر ۱۸۳۵ء کو ولیم فریر کے قتل کے جرم میں پھانسی دی گئی تھی۔)

برلاس مغل نیاز محمد بیگ کی بیٹی بیگم جان سے شادی۔
(بیگم جان کا انتقال ۳ نومبر ۱۸۶۶ء کو ہوا۔)

بیٹے امین الدین احمد خاں کی ولادت، بیگم جان کے بلن سے (لگ بھگ اسی زمانے میں راجا بختاؤر سنگھ کو حاکم کرنے کے لیے معدی، بہو بیگم کے لقب کے ساتھ ہاتھ بندھ بیوی تسلیم۔ اس طرح شمس الدین خاں کو بھی چاشینی کا حق ہو گیا۔

مہاراجا راجا بختاؤر سنگھ کی وفات

(۲۳ سال راج کر کے ۴۰ سال کی عمر میں انتقال کیا۔ ہم کھورانی سے کوئی اولاد نہیں چھوڑی تھی۔ موسیٰ میوا حق سے الہتہ ایک بیٹا بلونت سنگھ اور ایک لڑکی چاند کھور چھوڑے۔ موسیٰ نے راجا کے ساتھ سنی ہو کر حق رفاقت ہوا کیا۔ اس علاقے میں یہ میواتی دوہے منسوب یہ موسیٰ رانی بھی مشہور ہیں۔

موسیٰ خسا راف کی بھلی بھابھ

راجا بختاؤر کے کارن، ہوم دی سب دیہ

چندن کا باسل چنہ گھالا کو تر گھاؤ

جزا مول لے جائے گا مایچیری کا راف

مایچیری کا راف سے مراد راف راجا بختاؤر سنگھ والی انور

(ہیں۔)

۱۸۱۲ء کے لگ بھگ

۱۸۱۳ء

۱۸۱۵ء ۲۷ جنوری

۱۸۱۵ء مارچ

موسیٰ کے بیٹے بلونت سنگھ اور راجا بختاؤر سنگھ کے
بچے بنے سنگھ میں جانشینی کا جھگڑا۔ نواب احمد بخش
خاں نے بلونت سنگھ کا ساتھ دیا۔ دونوں دیاست کے
دارت حلیم۔

۱۸۱۷ء ۳۱/ جنوری

انور کے دو پرگنوں تھارا اور پنڈ گڑھ کا ضیکہ نواب
احمد بخش نے لے لیا۔

۱۸۱۷ء/ ۱۸

جامع مسجد فیروز پور جھڑک کی تعمیر
مسر امدادیں خریدی گئیں کہ خوشامبر لطیف عجیب^{۲۱}

۱۲۳۳ھ - ۱۲۳۳ھ

۱۸۱۷ء ۲۳/ اگست

تقسیم وراثت کے انتظام کے لیے وصیت۔ نواب
فیض اللہ بیگ خاں، میر زاد الہی بخش خاں (معروف)
اور لالہ گوردھن داس بٹار مقرر۔

۱۸۲۱ء اکتوبر

دوسری جنگم کے بلن سے دوسرے بیٹے ضیاء الدین
احمد خاں کی ولادت

۱۸۲۲ء نومبر

پہلی وصیت منسوخ۔ اب یہ فیصلہ ہوا (حکومت
انگریزی اور دربار انور کی منظوری سے) کہ نواب
احمد بخش خاں کے بعد فیروز پور جھڑک کی گدی پر
شمس الدین خاں بیٹھے اور لوہارو دوسری جنگم کے
دونوں بیٹوں امین الدین احمد خاں اور ضیاء الدین
احمد خاں کے حصے میں آئے۔

۱۸۲۳ء ۳/ مئی

احمد بخش خاں پر قاتلانہ حملہ (مفصل حال اوپر بیان
ہو چکا ہے)

۱۸۲۵ء فروری

بیٹے شمس الدین خاں سے ایک دستاویز لکھوائی کہ وہ
بلیقہ خاطر لوہارو کا پرگنہ اپنے دونوں بھائیوں کو دینا

منکرو کرتا ہے۔ بشرطے کہ وہ ہمیشہ اس کی اطاعت کرتے رہیں۔

۱۸۲۵ء۔ نومبر/دسمبر ہجرت پورہ کی لڑائی میں نواب احمد بخش خاں اپنے فوجی دستے کے ساتھ انگریزوں کی طرف سے شامل۔ اس مہم میں غالب اور ان کے سالے علی بخش خاں بھی ساتھ ہو لیے تھے۔

۱۸۲۵ء ۱۸/دسمبر ہجرت پورہ پر انگریزوں کی فتح ریاست کے کاروبار سے قطعی دست بردار تاکہ تقسیم وراثت پر اپنی ملکیا حیات ہی عمل درآمد ہوتا دیکھ سکیں۔

۱۸۲۷ء اکتوبر انتقال۔ غالب کو یہ خبر سنر نکلتے کے دوران میں مرشد آباد میں ملی۔

نواب احمد بخش خاں کے انتقال، غالب اور ان کے سنر نکلتے کا ذکر آیا ہے تو ہاں جو دیکھ غالب کی بخش کے قصبے اور بلاآخر مقدمے کی تفصیلات سے سب واقف ہیں۔ ایک اور زاویے سے غالب اور نواب احمد بخش خاں کے تعلقات کو پرکھا جائے۔

۱۔ نواب احمد بخش خاں کو غالب اپنا بزرگ سمانتے تھے اور دونوں ہم قوم تھے۔

۲۔ ان کی آبائیں میں دوہری عزیز داری تھی۔ غالب کے چچا مرزا نصر اللہ بیگ خاں نواب احمد بخش خاں کے بھتیجے تھے اور خود غالب، نواب کے بھائی مرزا الٰہی بخش خاں معروف کے والد تھے۔

۳۔ جب غالب کے چچا اور نواب کے بھتیجے، مرزا نصر اللہ بیگ مرے ہیں، (غالب کے والد پہلے ہی مر چکے تھے) تو غالب ۹ برس کے تھے اور ان کے چھوٹے بھائی میرزا یوسف ۷ برس کے۔

۴۔ سداوت پادشاہی رنگین (معروف کے دوست اور نواب کے ہم عصر) لکھتے ہیں کہ نواب احمد بخش خاں نہایت سخی اور فیاض تھے اور کوئی حاجت مند ان کے در سے خالی نہیں پھر جاتا تھا۔

۵۔ تقریباً یہی تاثر آزاد کے ان قصوں سے قائم ہوتا ہے جو انھوں نے آب حیات میں مصروف اور ذوق کے حوالے سے بیان کیے ہیں^{۱۸}۔

اگر نواب احمد بخش خاں ایسے ہی تخی برآمد اور فیاض تھے تو اس کا جواز محفوظ مہیا ہے کہ انھوں نے مرزا نصر اللہ بیگ خاں کے چہ داروں میں، جن میں چار عورتیں (ایک ۷۰ برس کی بوڑھی ماں، تین بیٹیاں، دو مرد) (غالب اپنی عمر کے نویں سال میں اور مرزا جو سف سا تویں سال میں) تھے، خواجہ حاجی کو چالیس فی صد کا حصہ دار بنا کر اصل داروں کی حق تلفی کیوں کی؟ اگر وہ چاہتے تو ۳۰ فی صد یعنی دو ہزار روپیہ^{۱۹} سالانہ جو انھوں نے اصل داروں کے ۵ ہزار سالانہ میں سے خواجہ حاجی کے نام کر لیا۔ اپنی تین لاکھ سالانہ کی جاگیر میں سے بہ آسانی ادا کر سکتے تھے^{۲۰}۔

استدراک

(الف) ۱۵ / نومبر ۱۸۰۵ء کی ایک عرض داشت میں دہلی کے ریذیڈنٹ نے انگریزی گورنمنٹ کے سکرٹری کو ایک مکتوب میں لکھا ہے^{۲۱}۔

”ان آخر الذکر اضلاع (ہانسی وغیرہ) سے جنھیں ہریانہ کہتے ہیں، مال گزاری کی وصولی کے لیے ایک سرگرم سردار احمد بخش خاں کو بے ضابطہ گمز سواروں کے رسالے کے ساتھ بھیجا جا رہا ہے۔“ خط سے مزید معلوم ہوا کہ ان گمز سواروں کی کوئی تنخواہ مقرر نہ تھی، کیوں کہ یہ باقاعدہ سپاہی نہیں تھے بلکہ انھیں پورے کام کا تیس روپیہ فی گمز سوار الاؤنس جو عروج شرح سے کم تھا، دیا جاتا تھا اور اس طرح مال گزاری وصول کرنے کا مطلب یہ تھا کہ گورنمنٹ پر سے بوجھ کم کیا جاسکے اور سپاہیوں اور سرداروں کو مقامی آمدنی میں سے اخراجات کی ادائیگی کی جاسکے۔

خط میں احمد بخش خاں کو ”An active chief“ لکھا ہے۔ یعنی ایک

”فعال سردار“۔ اس سے بہ آسانی صحیح بنا کیا جاسکتا ہے کہ احمد بخش خاں ہر وقت انگریزوں کے لیے ایسی مجلسیں سر کرنے پر آمادہ رہتے تھے۔ گویا یہ ایک طرح سے ان کا پیشہ تھا۔

(ب)۔ ”..... علاوہ ازیں تین سردار اور تھے جنہیں چارلس سٹکف لٹیروں سے قبیضہ کرتا ہے۔ کچھ سرداروں جیسے فیروز پور جھرکا کے احمد بخش خاں نے (انگریزوں کی) ہر طرح سے مدد کی۔“

”..... سٹکف کے ایک دوست نے ۱۸۴۱ء میں انہیں لکھا کہ فیروز پور کے نواب احمد بخش (خاں) نے کم از کم دس دفعہ مجھ سے درخواست کی ہوگی کہ میں اس خاص، مطلب کے لیے آپ کو لکھوں کہ وہ (احمد بخش خاں) آپ کو کتنی احسان مند کی اور احترام سے یاد کرتا ہے اور کہ وہ مرتے دم تک اسی طرح یاد کرتا رہے گا۔ جب وہ (احمد بخش خاں) آپ کی بات کرتا ہے تو اس کا ذوق و شوق دیدنی ہوتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ جوان مرد (چارلس سٹکف) جو ایک بوڑھے دانش مند کی سی عقل رکھتا ہے جتنا لگن، جذبہ، انصاف اور ایمان داری کے لیے ہم میں مشہور، معروف اور محترم ہے اتنا ہی ان صفات کی موجودگی کی وجہ سے تحریب کاروں کے لیے باعث خوف و ہراس ہے۔.....“

”... احمد بخش خاں اپنی فتوحات سے لطف اندوز ہونے کے لیے بیس سال زندہ رہا اور بہت معزز رہا۔ وہ سٹکف کا بیٹا اور تھا جس کی ایک چھوٹے سائز کی تصویر (Portrait) کو وہ اپنی آنکھ کی پتلی سمجھتا تھا۔ اسی لیے جب سٹکف کا دہلی میں دوبارہ تقرر ہوا تو احمد بخش خاں سے زیادہ اسے کسی نے خوش آمدید ^{۲۲} نہیں کہا۔.....“

انہیں طور طریقوں کی وجہ سے نواب احمد بخش خاں عمر بھر انگریزوں کے منظور نظر بنے

حواشی

- (۱) خلافتِ غالب، دوسرا ایڈیشن۔ ص ۵۴۳-۵۴۴
- (۲) مرقع اور لافٹھی محمد مخدوم تھانوی بحوالہ فسانہ غالب ص ۹۳-۹۴
- (۳) فسانہ غالب ص ۹۳
- (۴) اردو نے معنی: ۲۸۹ (ہمام نواب امین الدین احمد خان)، نیز فائس (بی) مارچ ۱۸۶۶ء۔
- (۵) مرقع اور: ۱۳۲-۱۳۸ (بحوالہ فسانہ غالب، ص ۹۵) اس واقع کو مصنف اسہار الغالب نواب خسرو مرزا نے اس طرح بیان کیا ہے (ص ۲۶/۲۷) ”بہ مقام نور باغ آزادپور میں جہاں وہ شب کو باہر گرمی کے موسم کی وجہ سے سو رہے تھے۔ قاتل نے ان پر کٹوار سے وار کیا۔ ان کے فوری بیدار ہونے کے باعث صرف ان کا سر زخمی ہوا اور کٹوار معروف ظفر بھگت (جو بھگت کے بیٹے کٹوار رکھی جاتی ہے) سے نواب صاحب نے وار کیا، جو اوچھا پڑا اسی وقت پہریلا بھی آگئے، لیکن وہ قاتل اپنے ہمراہیوں کی کثیر تعداد کے ساتھ کیلوں کے درختوں میں چوچائے وقوعہ کے قریب تھے ان کی آڑ میں ہو کر ایسے فرار ہوئے کہ گرفتار نہ ہو سکے۔ یہ وہی نور باغ آزادپور ہے جو میرے پاس معہ کوٹھی کے تھا۔ کیوں کہ باغ و دو مداخلات حدود (آزادپور ریلوے بھڑولہ میں تھا اور تقسیم میں سالم آزادپور کا رقبہ اور چوتھائی حصہ بھڑولے کا میرے حصہ میں تھا اور تین چوتھائی حصہ احتشام الدین علی احمد نور ٹکس الدین علی احمد میرے دونوں خالہ زاد بھائیوں کا تھا۔ اب یہ تمام باغ معہ کوٹھی کے گورنمنٹ نے حاصل کر لیا تمام اشجار کا نام بھی نہیں رہا اور کوٹھی کا کچھ حصہ مسمار کر دیا اور کچھ ابھی باقی ہے مسجد معہ اپنے چاہ کے جو اللہ تعالیٰ نے مجھ سے ۱۹۳۵ء میں تقبیر کرادی تھی یہ ڈیڑھ سو گز مربع جہاں یہ مسجد اور کنواں واقع ہے میرے وقت کرنے کی درخواست پر چھوڑ دیا گیا جو اب تک موجود ہے۔۔۔“

(۶) فسادِ غالب ص ۹۶

(۷) فسادِ غالب ص ۹۶

(۸) اسماء الغالب ص ۲۴ (ظاہر ہے فتح اللہ بیک عرف رجب بیک فرزند نصیر اللہ بیک خان کا انتقال صفر سنی ہی میں ہو گیا ہو گا کیوں کہ نصیر اللہ بیک خاں یقیناً لا ولد (۱۸۰۶ء) مرے۔ فتح اللہ بیک عرف رجب بیک کا ذکر بہت کم شے میں آیا ہے۔

(۹) حضرت مولانا فخر الدین چشتی ۷ مرتبہ الاول ۱۱۳۶ھ (۲۲ مارچ ۱۷۱۳ء کو پیدا ہوئے۔ وہ مولانا نظام الدین اورنگ آبادی کے چھوٹے بیٹے تھے جو نگرام کے رہنے والے اور حضرت مخدوم شیخ سعدی کا کوردی کی اولاد میں سے تھے اور اپنے مرشد سرگرد چشتی نظامیہ شاہ کلیم اللہ جہاں آبادی کے حکم سے اورنگ آباد میں مقیم ہو گئے تھے۔ مولانا فخر الدین نے خرقہ خلافت اپنے والد ماجد سے پایا اور انھیں کے ارشاد کے مطابق ۱۱۶۰ھ / ۱۷۴۷ء میں پہلے اجمیر اور پھر دہلی آئے۔ یہ محمد شاہ کا زمانہ تھا، سب ان کے چشمہ فیض سے سیراب ہوئے خود بادشاہ اور وزیر و امراء کمال عقیدت و نیاز سے ان کی مجلس میں حاضر ہوتے۔ ۱۱۹۹ھ / ۱۷۸۵ء میں بروز شنبہ بوقت عشاء اصل حق ہوئے۔ "حق پسند فخر الدین" اور "خورشید دو جہانی" تاریخ ہوئی۔ مہرولی میں حضرت خواجہ بختیار کاکی کے حجر کے باہر جو خواب ہیں۔ حزار مرتبہ تمام ہے۔ ان کے صاحبزادے حضرت مولانا قطب الدین بھی بلند پایہ بزرگ تھے۔ وہ بھی ان سے تھوڑی مدت بعد ۱۷۸۰ھ / ۲۰ نومبر ۱۷۸۵ء کو خدا کو پیارے ہو گئے۔ غالب کے دوست (اور خضر کے چچ) مولانا نصیر الدین عرف میاں کالے، انھیں قطب الدین کے بیٹے تھے۔ ان کی وفات منگل کے دن ۱۵ صفر ۱۲۶۸ھ / ۱۰ دسمبر ۱۸۵۱ء کو ہوئی۔ (تاریخ "کالے صاحب کو سرخ و پایا" از مومن حضرت میاں کالے کے بیٹے میاں نظام الدین کا ذکر غالب کے خطوں میں آیا ہے، ان کا انتقال ۱۲۹۶ھ / ۱۸۷۹ء میں ہوا ("خدا جو ہے و خدا ان آہ" تاریخ ہے۔) (ذکر اہل دہلی، ۲۶-۲۷ بحوالہ خلافتِ غالب، ص ۳۸۶)

(۱۰) اسماء الغالب، ص ۲۵

(۱۱) اسبہر الغلاب شجرہ نمبر ۲ میں ابراہیم علی خاں کا سال وفات ۱۸۳۳ء لکھا ہے۔ قیاس ہے کہ ولادت ۱۸۱۱ء ۱۸۱۵ء کسی سال میں ہوئی ہوگی۔ شادی نواب بیگم سے ہوئی تھی۔ شوہر کی وفات کے بعد نواب بیگم نے احمد علی خاں سے عقد کر لیا تھا۔

(۱۲) ”چرخِ دہان لہ“ سے ۱۳۰۱ھ مرآۃ ہو تا ہے جو ۸۲ / ۱۸۸۳ عیسوی کے مطابق ہے۔ معلوم ہوتا ہے یہ سنگ مرمر کا ستون بعد میں نصب کیا گیا ہوگا۔

بعد میں ضیاء الدین احمد خاں شیر درخشاں نے بھی ایک قطعہ ”تاریخ“ کہا تھا۔ (جلوہ صحیفہ رزمیں ص ۱۳۸)

شد بفر دوس بریں ہر گاہ آرا مش گزریں فخر دولت عزیزین نواب احمد بخش خاں
خوش بجا سود از بر حسن کمال اعتقاد زہد پائی مرشد خود فخر دین قطب زمان
نیر رخشاں ضیاء الدین احمد پور او بہت سال انقال واپہ جنت مکان
گفت دل اندر خم و بے سرو پا گشتہ اند
فخر و دولت ملک و ملت جود و حشمت ارج و شان

۱۲۳۳ھ

(۱۳) بزمِ دہان ص ۹۰۹ اپنی کتاب کی زبانی درج ہے کہ :

”عارف جان اور قاسم جان نے شہزادہ علی گوہر کو بنگال کی مہم میں مدد دی تھی جس کے سلسلے میں قاسم جان کو مشرف الدولہ کا خطاب عطا ہوا تھا۔ اے ۷۷ء میں پادشاہ (شاہ عالم خانی) دہلی میں آیا تو قاسم جان بھی ساتھ آیا۔“

(۱۴) مشکوٰی انبساط و انتکیر ص ۱۹، ”دورِ عکرفانی ۲۲ ستمبر ۱۸۰۳ء تا نومبر ۱۸۲۲ء“۔ کیا فتح کا دربار سالِ ہجر کے بعد منعقد ہوا تھا؟ ہو سکتا ہے کہ سند یا فرمان کا نقل ۲۲ ستمبر ۱۸۰۳ء سے ہوا ہو۔

(۱۵) مشکوٰی انبساط و انتکیر ص ۲۱

(۱۶) مشکوٰی انبساط و انتکیر ص ۲۰

(۱۷) اصل عبارت مرزا لئی بخش خاں معروف کے حال میں ملاحظہ فرمائیں۔

(۱۸) جاگیر غالب، از: پر قہوی چندر، ص ۲۵۳

(۱۹) جاگیر غالب، از: پر قہوی چندر، ص ۲۵۳

(۲۰) غالب کے بعض خطوں میں نواب احمد بخش خاں کا ذکر ملتا ہے مگر وہ بیشتر بخش کی حق تلفی کے بارے ہی میں ہیں، جس سے نواب صاحب کے بارے میں کوئی اچھا تاثر قائم نہیں ہوتا اور نہ ہی وہ ترجمہ نواب احمد بخش خاں میں کوئی اضافہ کرتے ہیں۔ اس لیے انہیں نظر انداز کر دیا گیا ہے۔

(۲۱) Raja Ram Mohan Roy and the last moghals (۲۱)

ماہر مدر، مطبوعہ ۱۹۳۹ء، ص ۴۳

(22) Twilight of the moghals by P. spear p. 92- 157- 182- 183.

مرزا افضل بیگ

مرزا افضل بیگ، غالب کے بہنوئی مرزا اکبر بیگ کے چھوٹے بھائی تھے۔ اپریل / مئی ۱۸۳۱ء کی کسی تاریخ کو (تفصیل سے آگے آئے گی) دہلی میں فوت ہوئے۔ صاحب شہزادہ سرور دی "نے لکھا ہے کہ ضعیف ہو گئے تھے اور انتقال کیا۔ مگر یہ ضعیفی کوئی ستر اسی سال بوڑھے کی سی نہ ہو گی کیوں کہ دوسرے دم تک اکبر شاہ دہلی کی طرف سے انگریزی دربار انگلٹنڈ میں سفیر رہے۔ اس لیے قیاس ہے کہ بوقت مرگ ان کی عمر ساٹھ سال یا اس سے کچھ زیادہ ہو گی۔ اس طرح ولادت کا سال ۱۷۷۷ء کے آس پاس متعین کیا جاسکتا ہے۔

انگریزی دربار انگلٹنڈ میں سفیر مقرر ہونے کے وقت تک ان کے والد اور دوسرے اہل خاندان دہلی میں نہیں رہتے تھے۔ تقرر کے بعد دہلی میں سکونت اختیار کی۔ مرزا مقرب الدولہ، معزز الملک، دلاور جنگ کے خطابات سے سرفراز ہوئے اور ۱۸۲۷ء میں انگلٹنڈ بھیج دیے گئے تاکہ وہاں انگریزوں سے تصفیہ امور سلطنت کا عمل نکال سکیں۔ سفیر مظاہر بننے سے پہلے مرزا افضل بیگ کی زندگی کا حال بہت کم کھلتا ہے۔ صرف ایک خط سے جلدی عہد سلطنت مظاہر نے ۶ / اپریل ۱۸۳۰ء سے کچھ کسی تاریخ کو بنام کورنیزل لکھا تھا کچھ روشنی پڑتی ہے۔

اکبر شاہ دہلی کے گیارہ بیٹے تھے۔ ان میں بہادر شاہ ظفر سب سے بڑے ۳ تھے۔ دہلی عہد

نہیں کو ہونا چاہیے تھا اور انگریز بھی یہی چاہتے تھے مگر اکبر شاہ دہلی ان کے بجائے اپنے تیسرے بیٹے مرزا جہانگیر کو دہلی عہد بنانے کے خواہاں تھے۔ جب مرزا جہانگیر کا ۳۱ سنی کی

عمر میں ۱۸۳۱ء میں انتقال ہو گیا تو بادشاہ نے پھر ظفر کو ظفر اعلاؤ کر کے چوتھے بیٹے مرزا سلیم کو ولی عہد بنانے کے خواب دیکھنے شروع کر دیے۔ ولی عہد وقت (ظفر) کو قوی گمان تھا کہ اس سازش میں مرزا افضل بیگ، راجا سوہن لال، مرزا سلیم تینوں ملوث ہیں۔ لہذا ولی عہد نے اس خط کے ذریعے باقی امور کے علاوہ راجا سوہن لال اور مرزا افضل بیگ کے خاندان اور ملازمت کا کچا پتھا بھی بیان کیا ہے۔ خط کے ضروری حصوں کا ترجمہ ذیل میں درج ہے۔

”..... اس شای گھرانے کی تاریخ اور حالات زمانہ تیمور سے..... تا دم

تخیر آپ کو اچھی طرح معلوم ہیں۔ اب کچھ ایسے حالات درپیش ہیں کہ جن کی وجہ سے صبر و قناعت کا دامن چھوٹ چھوٹ گیا ہے۔ مختصر تفصیل آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں کیوں کہ جناب دلا کے سوا چار رنگ عالم میں اب میرا کوئی دوست اور محافظ نہیں ہے۔

بادشاہ سلامت سہل انگاری، کو بیلا نظری اور عمر مرید ہونے کی وجہ سے اپنے ماتحت عہدیداروں، دفتری نظام اور دیگر امور کی طرف توجہ نہیں دیتے ہیں۔ انھیں حالات کے زیر اثر سوہن لال جو محض ایک حدودی تھا اور جس کا باپ بھی مدت تک باورچی خانے میں ملازم رہا تھا اور جس کی خاندانی روزالت ہر کہ دم پر اعظم من الخس ہے اب بادشاہ کا مختار بن بیٹھا ہے اور یہ افضل بیگ نامی ایک شخص کے ساتھ ملا ہوا ہے جو دلی دربار میں میرے خلاف سازش میں شریک ہے (سوہن لال نے) مرزا سلیم کی وساطت سے بادشاہ کو راضی کر کے افضل بیگ کو پرینڈ پرنسی (کلکتہ) میں سرکار انگلیشیہ کا کیل مقرر کروا دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ افضل بیگ کسی بھی طرح اس مرتبے پر آدمی نہیں کہ وہ ایسے اہم عہدے پر مقرر کیا جاسکے کیوں کہ اس کے آپاؤ اور ایک روز مل خاندان سے تھے اور ان کا شہ شای خاندان کے تک خواہوں میں کبھی نہیں رہا ہے۔ افضل بیگ خود کالت کا عہدہ پانے سے پہلے بطور داروغہ عمارات اشرف بیگ خاں کا تیس روپے

مابو اور کا ملازم تھا۔ مزید برآں اسے اشرف بیگ خاں کی ملازمت سے منکاری اور ریٹھ دہانی کے متعدد الزامات کی بنا پر ہر طرف کر دیا گیا تھا۔ گورنر جنرل کے دربار میں ایسے انسان کی بطور وکیل اپنا تک سر بلندی شاہی دربار کے قواعد کے قطعاً خلاف ہے۔ اس کے علاوہ ایسے رذیل شخص کو عہدیدار بنانا اور اسے کلکتہ میں انگریزی سرکار کے افسروں کی سطح پر لائٹھانا خود انگریزی دربار کی شان کم کرنے کے مترادف ہے اور میری سمجھ بوجھ کے مطابق قطعاً مناسب ہے۔

کلکتہ پہنچنے ہی افضل بیگ نے اپنی ضرور سہا فطرت کا اظہار ایک بچگالی رام موہن رائے سے تعلق بڑھا کر کیا اور دیر الدولہ خواجہ فرید خاں کا دوست ثابت کر کے باوشاہ سلامت کے رو برو پیش کیا۔۔۔۔۔ دراصل دیر الدولہ اور رام موہن رائے کی دوستی ایک جنم ہے۔۔۔۔۔ افضل بیگ نے وکالت کے عہدے پر مستقل حیثیت سے قائم رہنے کی توقع میں مرزا سلیم کے دماغ میں دلی عہدی کی امیدیں روشن کر رکھی ہیں اور میرے متعلق ایسے کلمات استعمال کیے ہیں جو کوئی استعمال کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ یہ جہ چالوئی و اعلیٰ سب کی زبان پر ہے۔۔۔۔۔ مجھے یقین ہے کہ افضل بیگ جو میرے خلاف ایسی جھگ آئیز اور ضرور سہا بائیں پھیلا رہا ہے اور ہر طرح سے میری ذلت و رسوائی پر اوجھار کھائے بیٹھا ہے۔ آپ کے دربار سے مناسب سزا پائے گا۔

دہلی کے ریڈیوٹ کے خط ۶ بنام گورنر جنرل مورخہ ۲۳ / اگست ۱۸۸۲ء سے ثابت ہوتا ہے کہ مذکورہ تاریخ سے پہلے مرزا افضل بیگ کا تقرر بطور وکیل سلطنت مغلیہ عمل میں آچکا تھا اور وہ کلکتہ میں اپنا عہدہ سنبھال چکے تھے۔ اسی خط کے ہر لہ ایک خطہ باوشاہ کی طرف سے تھا۔ ایک اقتباس ملاحظہ کیجئے:

”ہمارا فرماں برادر خادم افضل بیگ جو چناب والا کی حاضری بجا لاتا

ہے۔ ہمارے دلی مقاصد اور اہتاجوں کو آپ کے گوش گزار کرے گا۔
 ہمیں یقین ہے کہ معاملات اس کی نمائندگی میں قاعدے سے طے
 ہو جائیں گے۔ یہ امر ہمارے لیے مسرت کا باعث ہو گا اور انگریزی
 سرکار کے لیے باعث فخر۔“

آگے چل کر بہادر شاہ نے پھر (شہزادہ ابو ظفر یعنی بہادر شاہ کی حق تلفی کر کے) سردار سلیم
 کے حقوق منوانے کی کوشش کی ہے:

”ہماری خواہش ہے کہ ”بخشنی کل“ یا کماطران چیف کا عہدہ جو ہم
 نے اپنے لائق فرزند مرزا محمد سلیم بہادر کے تفویض کر رکھا ہے اب
 مستقل طور پر انھیں (شہزادہ سلیم کو) دے دیا جائے۔ اس سلسلے میں
 ہمارے فرزند نے جناب والا کی خدمت میں پہلے ہی تحریر کر دیا
 ہے۔۔۔۔۔“

جب غالب بخش کی بحالی کے سلسلے میں کلکتہ میں مقیم تھے (فروری ۱۸۲۸ء سے اکتوبر
 ۱۸۲۹ء تک) تو بھی مرزا بہادر وقت وہیں تھے۔ پھر وہیں کلکتہ میں رہ کر انھوں نے مشہور
 دانش ور رام موہن رائے کو دئی دربار سے راجا کا خطاب دلوا کر غیر تصدیق شدہ امور کی پیروی
 کے لیے انگلینڈ بھیجا۔ راجہ موہن رائے ۱۵/ نومبر ۱۸۳۰ء کو الیبین (Albion) کی جہاز
 سے عازم انگلستان ہوئے^۸۔ مرزا افضل بیگ دئی واپس آگئے۔

مرزا افضل بیگ کی شادی حکیم مومن خان مومن کی بیٹھی سے ہوئی تھی^۹۔ تاہم کلکتہ
 سے واپسی پر وہ اپنے ساتھ ایک خوب صورت بنگالن کو بھی لے آئے تھے (ہو سکتا ہے کہ
 پہلی بیوی کا انتقال ہو چکا ہو) یہ دئی عورت ہے جسے مرزا افضل بیگ کی وفات کے بعد
 مرزا عباس بیگ (مرزا افضل بیگ کے بھتیجے) بھاگا کر پنجاب کی طرف لے گئے تھے اور
 گمراہیوں سے دائمی ناراضی مول لے لی تھی۔

معلوم ہوتا ہے کہ یہ بنگالن کوئی بازاری عورت یا طوائف نہ تھی بلکہ افضل بیگ کی
 باقاعدہ بیوی تھی۔ کیوں کہ صاحب ”مکارتامہ سروری“ اس عورت کو مرزا عباس بیگ کی بیٹی

کہتا ہے۔ فرحت اللہ بیگ نے لکھا ہے کہ اس زمانے میں ہر گھر کے ساتھ ایک نہ ایک طوائف کا نام چلا رہتا تھا مگر یہ گھر (مرزا عبد اللہ بیگ پر مرزا فضل بیگ کا) ایسا تھا جس میں طوائف کا نام نہیں آیا تھا^{۱۰}۔

مرزا فضل بیگ کا ایک ہی بیٹا تھا جس کا نام مرزا عبد اللہ بیگ عرف مرزا دولا تھا۔ ان کا مکان محلہ چوڑی والاں کی میگزین والی گلی میں تھا۔ ممکن ہے یہ مکان مرزا فضل بیگ نے خریدا ہو یا جو لیا ہو اور اپنی عمر کی آخری سانسیں یہیں لی ہوں۔

مرزا عبد اللہ بیگ کی آٹھ اولادیں تھیں۔ چھ بیٹے^{۱۱} اور دو بیٹیاں۔ جب مرزا فضل بیگ کے انتقال کے بعد آمدنی کے سب راستے بند ہو گئے تو مرزا عبد اللہ بیگ سخت پریشان ہوئے کہ اب اتنے بڑے کنبے کی پرورش کیسے ہوگی۔ آخر ایک روز وہ اپنے والد کے سر فیکٹ لے کر انھیں داحسرائے نے دیے تھے دتی کے ریڈیوٹ کے پاس ملازمت مانگتے کے لیے گئے۔ ریڈیوٹ نے دروہ مہربانی اقبال سے کانپور تک کی ڈاک گاڑی کا انتظام ان کو دے دیا۔ جاہا سینکڑوں چوکیاں قائم کی گئیں۔ مرزا عبد اللہ بیگ اکثر ان چوکیوں کی دیکھ بھال کے لیے جایا کرتے تھے۔ اس طرح خاندان کی حالت سنبھل گئی^{۱۲}۔

آج تک مرزا فضل بیگ کے نام غالب کا کوئی خط نہیں ملا۔ تاہم ان کا ذکر دوسروں کے خطوں میں کثرت سے ملتا ہے۔ ایسے ہی خطوں سے مرزا فضل بیگ کے انتقال کی خبر بھی ملتی ہے۔ مرزا احمد بیگ خان (طہان) کو لکھتے ہیں:

”فلاں^{۱۳} بیگ زندہ بچست ورنہ خونہا خوروی۔۔۔“

”حضرت اکبر شاہ لاہور د خلعت فلاں بیگ پہ انواع و عوارض جلا بود۔“

”پرورد کہ چہار شنبہ آخری سفر بود غسل صحت کردہ اندہ لمانا توانند و

دام غھیدان ملتقات ندادند“^{۱۵}

(منظر قات غالب طبع دوم ص ۹۳-۹۴۔ خط ۲۲)

دن اور مہینہ نہ سہی مگر اس خط سے مرزا فضل بیگ کا سال وفات متعین ہو جاتا ہے۔

میں یہ معلوم ہے کہ راجہ رام موہن رائے کے ۱۵ / نومبر ۱۸۳۰ء کے عازم انگلستان ہونے تک نہ صرف مرزا زندہ تھے بلکہ اس کے بعد وہ بئی واپس آئے اور اپنے ساتھ ایک حسین بنگالی بیوی بھی لائے تھے۔ ماہ صفر چوں کہ ۱۸۳۰ء میں جولائی، اگست میں پڑتا ہے اس لیے جولائی۔ اگست ۱۸۳۰ء یا اس سے پہلے کے کسی انگریزی مہینے میں مرزا کا وفات پانادوست نہیں ہو سکتا۔ مرزا کو بیک خاں ملتان کا انتقال ۵ / مارچ (شوال) ۱۸۳۴ء سے کچھ روز قبل ہو تا ہے^{۱۶}۔ اس لیے مرزا کا انتقال ۱۸۳۴ء کے جولائی (صفر) میں بھی ممکن نہیں کیوں کہ لوہر کے خط سے ظاہر ہے کہ ملتان کی زندگی ہی میں مرزا کا انتقال کر چکے تھے۔ اب وہ مئی ۱۸۳۱ء / ۱۸۳۲ء اور ۱۸۳۳ء تو انھی سالوں کے صفر کے آخری چار شیعے سے پہلے ان کا انتقال ہوا۔ تاریخیں جن سے پہلے مرزا کا انتقال ہو۔ یہ ہو سکتی ہیں ۲۳ صفر ۱۲۴۷ھ مطابق ۱۳ / اگست ۱۸۳۱ء، ۲۹ صفر ۱۲۴۸ھ مطابق ۲۵ / جولائی ۱۸۳۲ء اور ۲۸ صفر ۱۲۴۹ھ مطابق ۱ / جولائی ۱۸۳۳ء۔

بادشاہ (اکبر شاہ ثانی) کو مرزا کے انتقال کا سخت رنج ہوا اور وہ طرح طرح کے عارضوں میں مبتلا رہنے لگے۔ خدا خدا کر کے شفا پائی اور ۳ / اگست ۱۸۳۱ء کو غسل صحت فرمایا۔ مگر بیماری اس قدر شدید اور لمبی تھی کہ عرصے تک ناقابلِ رہی۔ مرزا کا انتقال بادشاہ کے غسل صحت سے چند ماہ پہلے ہوا ہو گا۔ کیوں کہ بیماری لمبی تھی۔ سال وفات ۱۸۳۱ء، ۱۸۳۲ء اور ۱۸۳۳ء میں سے کوئی ایک ہو سکتا ہے۔ میں نے اکبر شاہ ثانی اور انگریزوں کے مابین ۱۸۳۰ء ۱۸۳۴ء تمام منتخب خط و کتابت دیکھی ہے^{۱۷}۔ اس میں ۱۸۳۱ء کے سوائے بادشاہ کے تیار پڑنے کا ذکر اور کسی سال میں نہیں۔ ۵ / جولائی ۱۸۳۱ء کو دبی کارینڈینٹ انگریزی گورنمنٹ کے سکرٹری کو لکھتا ہے کہ کل دربار میں بادشاہ کے بخار نے مجھے ایک خفہ منجاب بادشاہ (یہ خفہ پہلے سے دفتر میں آیا رکھا تھا) پڑ کر سنایا۔ اس سے مراد یہ ہے کہ اس بیماری کے علاوہ جس میں بادشاہ مستعد ہے وہ ذہنی کوفت میں بھی گرفتار ہے وغیرہ وغیرہ۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ بادشاہ ۱۰ / جون ۱۸۳۱ء سے پہلے کے بیمار تھے کیوں کہ یہ خفہ ریڈینٹ کے دفتر میں ۱۰ جون کو موصول ہوا تھا۔ مرزا کا انتقال بیک کی موت بادشاہ کی بیماری سے پہلے ہوئی تھی.....

اس لیے یہ کہنا جائز ہے کہ مرزا فضل بیگ کا انتقال اپریل / مئی ۱۸۳۱ء میں بھی ہوا ہو گا۔ غالب کو شبہ ہی نہیں بلکہ یقین تھا کہ مرزا فضل بیگ پٹنن کے مقدمے میں مدد کے بجائے ان کی مخالفت کر رہے ہیں اور اپنے خواہر زلہدوں (یعنی اپنے بہنوئی خواجہ حاجی کی اولاد) کی مدد کر رہے ہیں۔ غالب ٹکٹے کے قیام کے دوران مرزا فضل بیگ کے (شاید مصلحت) شاکی نہیں ہوئے تھے۔ لیکن واپسی کے بعد انھیں اپنا شدید مخالف سمجھنے لگے تھے۔ اس سلسلے میں غالب کے مندرجہ ذیل خطوط ملاحظہ کیے جاسکتے ہیں۔

مترقات غالب طبع دوم خط نمبر ۱۳ ایام مولوی سراج الدین احمد

مترقات غالب طبع دوم خط نمبر ۲۲ ایام مرزا احمد بیگ خان

مترقات غالب طبع دوم خط نمبر ۳۶ ایام مرزا ابوالقاسم خان

نیم فروری ۱۸۲۸ء کے ایک خط^{۱۸} میں جوائینٹنگ چیف سکریٹری نے دہلی کے ریڈیٹنٹ

کو لکھا تھا تحریر ہے۔

”..... دی راءت آرمیٹل گورنر جنرل^{۱۹} ان کو نسل نے ارادہ ظاہر کیا

ہے کہ وہ ان تمام مطالبات کا جواب دے جو شاہ دہلی نے گورنر جنرل کو

اس وقت پیش کیے تھے جب کہ وہ شہر دہلی کے دورے پر تھے.....“

جس خط کے ذریعے یہ مطالبات پیش کیے گئے تھے وہ شاہ دہلی کی طرف سے مرزا فضل

بیگ نے لکھا تھا۔ اس خط پر وصولی کی تاریخ ۱۳ / اگست ۱۸۲۷ء^{۲۰} درج ہے۔ مگر اصل خط

اس تاریخ سے بہت پہلے یعنی ۱۵ / جون ۱۸۲۷ء کو معرض تحریر میں آیا تھا۔ اس سے یہ بات

صاف طور پر مستخرج ہوتی ہے کہ اس وقت تک مرزا فضل بیگ وکیل مقرر نہیں ہوئے تھے

کیوں کہ اس خط میں دوسرے امور کے ساتھ بادشاہ کے ٹکٹے میں اپنا وکیل مقرر نہ کر سکنے کی

طرف بھی اشارہ ہے۔ ظاہر ہے کہ مرزا فضل بیگ کا مقررہ بلور وکیل ۱۵ جون ۱۸۲۷ء اور

۲۳ / اگست ۱۸۲۷ء کے مابین کسی بھی طرح کو ہوا۔

چوں کہ خط (عرضداشت) نامی ہے اور مرزا فضل بیگ سے منسوب ہے اس لیے

پورا متنبہ درج کیا جاتا ہے۔

حیثیت پر قرار ہے کیوں کہ اس میں یہ شرط رکھی گئی تھی کہ اگر بادشاہ کے حاضر علاقوں سے زائد لگان وصول ہو گا تو اسے بادشاہ کی پنشن میں ملا دیا جائے گا۔ اگر حکومت اعلیٰ نے اس اضافے سے حلقہ بادشاہ سے کسی قسم کی دست برداری حاصل کی ہوتی تو بے شک سابقہ اقرار نامے منسوخ سمجھے جاتے۔ چوں کہ ایسا نہیں ہوا اس لیے جہاں تک زائد لگان کا تعلق ہے بادشاہ سلامت بھی ”پیش کش“ کے اس اضافے سے دست بردار نہ ہوں گے۔ چہاں یہ کہ ضابطہ نمبر ۱۸۰۵ء (صفحہ ۲ اور ۳) میں یہ تحریر ہے کہ آخر حل کمپنی کے ضابطوں کا جو دو آب میں نافذ ہیں دہلی نیز اس کی نواعلیٰ بستیوں پر اطلاق نہیں ہو گا کیوں کہ یہ علاقے شاہی خاندان کے ذاتی معارف کے لیے وقف ہیں۔ یہ ضابطہ اب بھی چمپا ہوا سو جو داؤر نافذ ہے جب تک حکومت اعلیٰ اپنے ان وعدوں اور اقرار ناموں کو منسوخ نہیں کرتی۔ بادشاہ کے ساتھ یہ قول و قرار پوری قوت کے ساتھ قائم سمجھے جائیں گے۔

یہ سوال کہ بادشاہ نے ۱۸۰۹ء سے آج تک اس پر زور کیوں نہیں دیا تو بادشاہ نے ہمیشہ یہ امید کی ہے کہ ریڈیلینٹ بہ ذات خود حکومت اعلیٰ کے سامنے ان امور کو پیش کرے گا یا وہ بادشاہ سلامت کو ان مطالبات کے پیش کرنے کے لیے مزید مقرر کرنے کی اجازت دے گا۔ اس سلسلے میں ۱۸۲۳ء میں مسٹر راس نے دو خط سرکار کو تحریر کیے لیکن چوں کہ یہ صاحب دہلی میں بہت تھوڑا عرصہ مقیم رہے اس لیے یہ مسئلہ پایہ تکمیل تک نہیں پہنچ پایا۔ بعداً بادشاہ سلامت اس سلسلے میں ایک بیان تیار کر رہے تھے کہ انھوں نے گورنر جنرل بہادر کے ہالائی صوبوں کے دورے کی خبر سنی اور جب بادشاہ کو یہ تحقیق ہو گیا تو انھوں نے فوراً ایک خصوصی ملاقات کی

خواہش ظاہر کی جو طریقہ کے لیے باعث اطمینان ہو اور اس میں گورنر جنرل سے دریافت کیا جائے کہ کن وجوہات کی بنا پر اقرار ناموں پر ابھی تک عمل نہیں کیا گیا اور پھر جب یہ میٹنگ منعقد ہوئی اور بے حد تحقیقی بخش رہی تو بعد میں کس کے دخل در معقولات سے یہ بے نتیجہ ثابت ہوئی؟ بادشاہ سلامت نے کاغذات کو خود اپنے شاہی ہاتھوں سے حوالے کیا تھا تا کہ آپ کوئی موافق جواب دیں۔ آخر میں اب انگریزی سرکار کے لیے یہ نہ کہنے دیجیے کہ اسے علاقوں اور غزائوں کو اتنی جنگوں اور قرضوں کے بعد حاصل کر کے اب وہ انتہائی معمولی رسالہ درود تک کو تو لاکھوں روپے بطور عوضانہ لوا کر سکتی ہے مگر اپنے قول و قرار پر قائم نہیں رہ سکتی جو اس نے تمام رعایا کے درود و شہنشاہ ہندوستان سے کیے تھے اور بادشاہ کو معمولی لگان لوا کر نے میں پس بددیش کرتی ہے جو ان مقالات سے حاصل ہوتا ہے جو بادشاہی شہر (دہلی) سے متعلق ہیں۔“

(۱) شہزادہ ابو ظفر جو بعد میں بہادر شاہ ظفر کے نام سے موسوم ہوئے۔

(۲) Raja Ram Ray Mohan Roy & The last moghals. لا:

ڈاکٹر چندر کمار راجوہار (مطبوعہ ۱۹۳۹ء۔ خط نمبر ۱۱۔ ص ۲۰۷)

(۳) بہادر شاہ ظفر ۲۸ شعبان ۱۱۸۹ھ (۱۷۷۵ء) کو منگل کے دن ایک ہندو خزانہ عورت مساف

لال پانی کے پلن سے پیدا ہوئے۔ (بہادر شاہ ظفر از امیر احمد علوی۔ ص ۸)

(۴) بہادر شاہ ظفر پر دو تہمتوں کا اندراج ملتا ہے۔ امیر احمد علوی نے (بہادر شاہ ظفر ص ۲۱)

لکھا ہے کہ ”اکبر شاہ جانی کہتے تھے کہ ابو ظفر میرا بیٹا ہی نہیں ہے۔“ Twilight of

the moghals. P. Spear. Page 7. لکھتے ہیں کہ اکبر شاہ جانی نے بہادر

شاہ ظفر پر یہ الزام لگایا کہ اس نے شاہ عالم کے عہد میں ایک بیگم کی آمد دلوئی تھی۔ لہذا

وہ دلی عہدی کے لائق نہیں۔

(۵) اس خط کا اصل مقصد صرف یہ تھا کہ شہزادہ (بہادر شاہ) ظفر کو انگریز باقاعدہ دلی عہد

سلطنت مقبلہ تسلیم کیے رہیں۔ چنانچہ ۱۶ جولائی ۱۸۳۰ء کے خط میں گورنر جنرل نے نہ

صرف یہ کہ شہزادہ ابو ظفر (بہادر شاہ ظفر) کو بدستور دلی عہد کے لقب سے مخاطب کیا

ہے بلکہ یقین دلایا ہے کہ شہزادے کے حقوق کی حفاظت کی جائے گی اور کہ اسے قطعاً

کوئی اندیشہ دل میں نہ لانا چاہیے۔ بعض لوگوں کا یہ خیال کہ ”۱۸۳۳ء یا اس کے بعد

انگریزوں نے بہادر شاہ کو دلی عہد مقرر کیا“ درست نہیں۔

(۶) Raja Ram Mohan Roy & The last moghals ص ۱۷۱، خط ۹۳

اس کے علاوہ ریڈینٹ دہلی، اکبر شاہ جانی اور مرزا سلیم کے چند خطوں میں بھی مرزا

افضل بیگ کا ذکر موجود ہے مگر وہ چند اہم نہیں اس لیے ان خطوں کو اس مضمون کے

لیے نظر انداز کیا گیا ہے۔

(۷) غالب ۲۱/۲۱۹ / فروری ۱۸۲۸ء (۲۷ شعبان ۱۲۴۳ھ) کو کلکتہ پہنچے اور

۲۹ / نومبر ۱۸۲۹ء (یکم جمادی الثانی ۱۲۴۵ھ) کو دہلی واپس آگئے۔ اکتوبر ۱۸۲۹ء میں کلکتہ

سے دہلی کے لیے روانہ ہوئے ہوں گے۔

(۸) گریٹ بین آف انڈیا۔ ص ۵۰۰

(۹) "اردو" اپریل ۱۹۳۱ء۔ خواجہ لمان مرحوم، از فرحت اللہ بیگ، ص ۲۵۵

(۱۰) "اردو" اپریل ۱۹۳۱ء۔ خواجہ لمان مرحوم، از فرحت اللہ بیگ، ص ۲۵۹

(۱۱) "اردو" اپریل ۱۹۳۱ء۔ خواجہ لمان مرحوم، از فرحت اللہ بیگ، ص ۲۵۵

(۱۲) ان میں سے مرزا حشمت اللہ بیگ مرزا فرحت اللہ بیگ کے والد تھے گویا مرزا افضل بیگ مرزا فرحت اللہ بیگ کے دواڑھے۔

(۱۳) "اردو" اپریل ۱۹۳۱ء۔ ص ۲۹۰

(۱۴) یعنی مرزا افضل بیگ۔

(۱۵) اس خط سے معلوم ہوتا ہے کہ مرزا احمد بیگ خان لطیف خان چاہتے تھے کہ مرزا افضل بیگ کے انتقال کے بعد انھیں کلکتہ میں دہلی کی طرف سے سفیر مقرر کر دیا جائے۔

(۱۶) غالب مولوی سراج الدین احمد کو ۵/۶ مارچ ۱۸۳۲ء (پانزدہ مارچ غالب کا سہو ہے) ۱۸۳۳ء کے دن لکھتے ہیں کہ اچانک ۱۱ شوال (۱۰ شوال چاہیے ۱۱ شوال کی صبح کو آپ کے خط سے مرزا احمد بیگ خان لطیف خان کے انتقال کی خبر ملی۔ نسخہ نے مرزا احمد بیگ کا سال وفات ۱۸۳۳ء صحیح لکھا ہے۔ بتقرقات غالب طبع دوم ص ۲۰ پر مسعود حسن رضوی لایب مرحوم فرماتے ہیں "غالب یکم جمادی الثانی روز یکشنبہ کو کلکتہ سے دہلی پہنچے تھے۔ تقریباً ساڑھے تین مہینے کے بعد مولوی سراج الدین احمد کے خط سے مرزا احمد بیگ خان کے انتقال کی خبر ملی۔" ظاہر ہے یہاں جناب لایب مرحوم سے سہو ہوا ہے مرزا احمد بیگ خان ۱۸۳۰ء میں نہیں بلکہ ۱۸۳۳ء میں مرے۔

(۱۷) Raja Ram Mohan Roy and last moghals از چندر کمار

ماجورہ مطبوعہ ۱۹۳۹ء۔ ص ۲۰۷ ۲۳۳

(۱۸) راجا رام موہن رائے اور آخری مغل، ص ۱۸۳ خط نمبر ۹۹

(۱۹) یہاں لارڈ امھرست (Amherst) مراد ہیں کیوں کہ ۱۸۴۳ء سے ۱۸۴۸ء تک وہی گورنر جنرل تھے۔

(۲۰) راجا رام موہن رائے اور آخری مغل، ص ۱۹۱

آب حیات میں ترجمہ غالب (مع حواشی)

ڈاکٹر صدر آہ مرحوم لکھتے ہیں:

”آب حیات میں جو مولو تحقیق پیش کیا گیا ہے، مگر اسے ہٹالیا جائے تو مظلوم ہو گا جیسے سورج ڈوب گیا اور اردو تحقیق کی دنیا میں ایک تاریکی پھیل گئی ہے۔“

یہ بات اس حد تک یقیناً صحیح ہے کہ جو مولو بلحاظ مقدمہ تفصیل ”آب حیات“ میں پیش کیا گیا ہے، اس سے پہلے وہ کسی ذکر کے میں نہیں ملا، مگر اس سے یہ مراد لینا کہ یہ مولو تمام دو کمال تحقیق شدہ ہے، درست نہیں اور یہ مان لینا بھی غلط ہے کہ آؤلو نے ہر شاعر کے بیان میں اس طبع جانب داری سے کام لیا ہے جو ایک محقق کے لیے اشد ضروری ہے۔

آب حیات میں شامل ترجمہ غالب کو شروع سے آخر تک پڑھ جائیے، آؤلو کا مسودہ منظر نگارش اور بے پناہ قوت انکشاف دہانی قاری کو باور کروا دیتے ہیں کہ آؤلو، غالب کے بے حد مداح ہیں، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ بہت سے ان کے بیان ایسے ہیں جن میں ایک نہ ایک جھکی بھی لی گئی ہے جو تعریف کے بجائے غالب کی حقیر فی کا باعث بنتی ہے۔

آؤلو نے غالب کے سوانح پشتر غالب کے غلطوں کی بنیاد پر لکھے ہیں اور کچھ بیان اپنے استاد ذوق کے حوالے سے بھی دیے ہیں۔ مگر تحقیقی لحاظ سے جو نتائج اخذ کیے ہیں وہ خاصوں سے پر ہیں ایسی غلطیوں کی نشان دہی میں نے حواشی میں کر دی ہے۔

مولانا آؤلو کے اس مضمون سے میں نے دو مقامات حذف کر دیے ہیں کیوں کہ ان کا

ہر قرار رکھنا محض کتاب کی ضخامت پر مبنی تھا۔ تاہم اس حذف سے نفس مضمون پر قطعی کوئی اثر نہیں پڑا۔

۱۔ انتخاب غزلیات غالب جو آزاد نے مضمون کے آخر میں دیا ہے اور

۲۔ مرزا عبداللہ خان اویج کے حاشیے کا وہ حصہ جس کا تعلق غالب سے نہیں۔

چوں کہ شخص العلماء مولانا محمد حسین آزاد مرحوم (ولادت ۱۰ / جون ۱۸۳۰ء) ایک طرح سے غالب کے اولیٰ سوانح نگار ہیں اس لیے امید کرتا ہوں کہ ان کی تحریر کی دل کشی اور اہمیت میں یہ حواشی مزید اضافے کا باعث ہوں گے۔ (کالی واس مگتار ضابطہ)

نجم الدولہ و میر^۲ الملک مرزا اسد اللہ^۳ خاں غالب

مرزا صاحب کو اصلی شوق فارسی کی نظم و نثر^۴ کا تھا اور اسی کمال کو اپنا فخر سمجھتے تھے لیکن چوں کہ تصانیف ان کی اردو میں بھی چھپی ہیں اور جس طرح امراء و سردار و سادہ کبیر آباد میں ملو خانہ ان سے نامی اور میرزا سے فارسی ہیں، اسی طرح اردو کے معنی کے مالک ہیں اس لیے واجب ہوا کہ ان کا ذکر اس تذکرہ میں ضرور کیا جاوے۔ نام اسد اللہ تھا۔ پہلے اسد تخلص کرتے تھے۔ ہجرت میں کوئی فردایہ سا شخص اسد تخلص کر چکا تھا۔ ایک دن اس کا مقطع کسی نے پڑھا۔

اسد تم نے بھائی یہ غزل خوب

اسے او شیر رحمت ہے خدا کی^۵

سننے ہی اس تخلص سے جی ہزار ہو گیا۔ کیوں کہ ان کا ایک یہ بھی قاعدہ تھا کہ عوام الناس کے ساتھ مشترک حال ہونے کو نہایت مکروہ سمجھتے تھے۔ چنانچہ ۱۳۲۵ھ و ۱۸۲۸ء میں اسد اللہ غالب کی رعایت سے غالب تخلص اختیار کیا۔ لیکن جن غزلوں میں اسد تخلص تھا انھیں اسی طرح کہتے ہیں۔

خانہ ان کا سلسلہ افراسیاب بادشاہ توراں سے ملتا ہے۔ جب توراںیوں کا چراج کیا تو ان کی ہوائے اقبال سے گل ہوا تو غریب خانہ بردار، جنگلوں، پہاڑوں میں چلے گئے۔ مگر جوہر کی

کشش نے تلواریں ہاتھ سے نہ چھوڑی۔ سپاہ گری ہمت کی بدولت روٹی پیدا کرنے لگی۔ سینکڑوں برس کے بعد پھر اقبال اور جھکا اور تلواریں سے تاج نصیب ہوا۔ چنانچہ سلطنتی خاندان کی بنیاد انہی میں سے قائم ہو گئی۔ مگر اقبال کا جھکا جھکا ہوا ہے۔ کئی پشتوں کے بعد اس نے پھر رنخ پٹا اور سرقتہ میں جس طرح اور شرفا تھے اس طرح سلطنتی شہزادوں کو بھی گھروں میں بٹھال دیا۔

مرزا صاحب کے دوا گھر چھوڑ کر نکلے۔ شاہ عالم کا زمانہ تھا کہ دہلی میں آئے یہاں بھی سلطنت میں کچھ نہ رہا تھا۔ صرف پیاس گھوڑے اور ٹھکانہ فغان سے شاہی دربار میں عزت پائی اور اپنی لیاقت اور خاندان کے نام سے یہاں سوا کا ایک پرگنہ سیر حاصل ڈالت اور در سالے کی تحفہ میں لیا۔ شاہ عالم کے بعد طوائف الملوکی کا ہنگامہ گرم ہوا۔ وہ علاقہ بھی نہ رہا۔ ان کے والد عبداللہ بیگ خاں لکھنؤ جا کر نواب آصف اللہ دربار مرحوم کے دربار میں پہنچے۔ چند روز بعد حیدر آباد میں جا کر نواب نظام علی خان بہادر کے سرکار میں تین سو سوار کی جمعیت سے رہے^۸۔ کئی برس کے بعد ایک خانہ جنگی کے کھینڑے میں یہ صورت بھی بگڑی۔ وہاں سے گھر آئے اور اور میں راجہ بختاور سنگھ کی ملازمت اختیار کی۔ یہاں کسی لڑائی میں مارے گئے۔

اس وقت مرزا کی ۵ برس کی عمر تھی۔ نصر اللہ بیگ خاں حقیقی پچاس برسوں کی طرف سے اکبر آباد کے صوبہ دار تھے۔ انھوں نے ڈوئیہیم کو داسن میں لے لیا۔ ۱۸۰۶ء میں جرنیل ایک صاحب کا عمل ہوا تو صوبہ داری کشتری ہو گئی۔ ان کے چچا کو سواروں کی بھرتی کا حکم ہوا اور ۴۳ سو سوار کے افسر مقرر ہوئے، ۷۱ سو روپیہ عہدہ ذات کا اور لاکھ ڈیڑھ لاکھ روپیہ سال کی جاگیر۔ سوئگ سوئسہ کے پرگنہ پر صحن حیات مقرر ہو گئی۔

مرزا پچا کے سایہ میں پرورش پاتے تھے۔ مگر اتفاق یہ کہ مرگ ناگہانی میں وہ مر گئے^۹۔

رسالہ بر طرف ہو گیا۔ جاگیر ختم ہو گئی۔ بزرگوں نے لاکھوں روپیہ کی جائیداد چھوڑی تھی۔ قسمت سے کسی کا زور چل سکا ہے۔ وہاں میر زادہ جو شاہانہ دل و دماغ لے کر آیا تھا اسے ملک خن کی حکومت اور مضامین کی دولت پر قناعت کر کے غریبانہ حال سے زندگی بسر کرنی پڑی۔ بہت تدبیریں اور وسیلے درمیان آئے مگر سب کھیل بن بن کر بکھو گئے۔ چنانچہ اخیر

میں کسی دوست نے انھیں لکھا تھا کہ نظام دکن کے لیے قصیدہ کہہ کر قلاں ذریعہ سے بھیجی جاوے گی جو اب میں آپ فرماتے ہیں۔ ۵۰ برس کا تھا کہ میرا باپ مراد ۹۰ برس کا تھا کہ چچا مراد اس کی جاگیر کے عوض میں میرے اور میرے شرکائے حقیقی کے واسطے شامل جاگیر نواب احمد بخش خاں ۱۰ ہزار روپیہ سال مقرر ہوئے۔ انھوں نے نہ دیے مگر تین ہزار روپیہ سال۔ ان میں سے خاص میری ذات کا حصہ ساڑھے سات سو روپیہ سال فقط۔ میں نے سرکار انگریزی میں زمین ظاہر کیا۔ کو لبرک صاحب بہادر ریڈیٹنٹ دہلی اور اسٹرنک صاحب بہادر سکریٹری گورنمنٹ کلکتہ حقیق ہوئے۔ میرا حق دلانے پر ریڈیٹنٹ معزول ہو گئے۔ سکریٹری گورنمنٹ برک ناگاہ مر گئے بعد ایک دن کے باد شاہ دہلی نے پچاس روپیہ مہینہ مقرر کیا۔ ان کے دلی عہد اس مقرر کے دو برس بعد مر گئے۔ واجد علی شاہ بادشاہ اودھ کی سرکار پر سے پہلے مدد گسٹری ۵۰۰ روپیہ سال مقرر ہوئے۔ وہ بھی دو برس سے زیادہ نہ رہے۔ یعنی اگرچہ اب تک جیتے ہیں، مگر سلطنت جاتی رہی اور چالی سلطنت دو ہی برس میں ہوئی۔ دہلی کی سلطنت کچھ سخت چان تھی۔ ۷۰ برس مجھ کو روٹی دے کر مجبزی دے ایسے طالع حرقی کش اور حسن سوز کہاں پیدا ہوتے ہیں۔ اب جو میں دہلی دکن کی طرف رجوع کروں یاد رہے کہ متوسط یا مر جائے گا یا معزول ہو جائے گا اور اگر یہ دونوں امر واقع نہ ہوئے تو کوشش اس کی ضائع جائے گی۔ دہلی شہر مجھ کو کچھ نہ دے گا اور احیانا اگر اس نے سلوک کیا تو ریاست خاک میں مل جائے گی۔ ملک میں گدھے کے گل پھر جائیں گے۔

فرمے کہ نواب احمد بخش خان بہادر کی تقسیم ۱۳ سے مرزاے مرحوم تالاں ہو کر ۱۸۳۰ء میں کلکتہ ۱۳ کے لئے اور گورنر جنرل نے ملتا چلا۔ وہاں دفتر دیکھا گیا۔ اس میں سے ایسا کچھ معلوم ہوا کہ اعزاز خانہ دہلی کے ساتھ ملازمت ہو جائے اور پھر چہ خلعت تین رقم جزیہ مرصع مالائے مردانہ۔ ریاست دودھانی کی رعایت سے مقرر ہوا۔

غرض مرزا کلکتہ سے ناکام پھرے اور لیام جوالی بھی چورے نہ ہوئے تھے کہ برہمنوں کا سرمایہ تمام کر کے دہلی میں آئے ۱۳۔ یہاں اگرچہ گزرا ان کا طریقہ امیرانہ شان سے تھا اور امیروں سے امیرانہ ملاقات تھی۔ مگر اپنے غلو حوصلہ اور بلند نظری کے ہاتھوں سے ٹک رہے تھے۔ پھر بھی طبیعت اس کی کلکتہ پائی تھی کہ ان دقتوں کو بھی خاطر میں نہ لاتے تھے اور

ہیٹ۔ ہنس کھیل کر غم غلط کر دیتے تھے کیا خوب فرمایا ہے۔
 سے سے غرض نشاط ہے کس رو سیاہ کو
 یک گو نہ بخودی مجھے دن رات چاہیے^{۱۵}

جب دہلی چلا ہوئی تو زیادہ تر مصیبت پڑی۔ اواخر قلعہ کی تحفہ جاتی رہی۔ اواخر پنشن بند ہو گئی اور انھیں راجپور^{۱۶} جانا پڑا۔ نواب صاحب سے ۲۵۰۲۰ برس کا تعارف تھا یعنی ۵۵ء میں ان کے شاگرد بنے ہوئے تھے اور تا قلم تقلص قرار پایا تھا۔ وہ بھی گاہے گاہے غزل بھیج دیتے تھے۔ یہ اصلاح دے کر بھیج دیتے تھے۔ کبھی کبھی روپیہ بھی آتا تھا۔ اس وقت قلعہ کی تحفہ جاری سرکاری پنشن کھلی ہوئی تھی۔ ان کی معایت فتوح لکھنؤ گئی جاتی تھی۔ جب دہلی کی صورت بگڑی تو زندگی کا مدار اس پر ہو گیا۔ نواب صاحب نے ۵۹ء سے سو روپیہ مہینہ کر دیا اور انھیں بہت تاکید سے بلایا۔ یہ گئے تو تعظیم خانہ دہلی کے ساتھ دوستانہ و شاگردانہ بغل گیر ہو کر ملاقات کی اور جب تک رکھا کمال عزت کے ساتھ رکھا۔ بلکہ سو روپیہ مہینہ نیافت کا زیادہ کر دیا۔ مرزا کو دہلی کے بغیر جہن کہاں؟ چند روز کے بعد رخصت ہو کر پھر وہیں چلے آئے۔ چوں کہ پنشن سرکاری بھی جاری ہو گئی تھی^{۱۸}۔ اس لیے چند سال زندہ کی بسر کی۔ آخر عمر میں بڑھاپے نے بہت عاجز کر دیا۔ کانوں سے سنائی نہ دیتا تھا۔ نقش تصویر کی طرح لینے رچتے تھے۔ کسی کو کچھ کہنا ہوتا تھا تو لکھ کر رکھ دیتا تھا۔ وہ دیکھ کر جواب دے دیتے تھے۔ خوراک دو تین برس یہ رہ گئی تھی کہ صبح کو پانچ سات باؤم کا شیر و ۱۴ بچے آب گوشت۔ شام کو ۳ کباب کھاتے ہوئے۔ آخر ۷۳ برس کی عمر ۱۸۶۹ء ۱۲۸۵ھ میں جہان فانی سے انتقال کیا اور بندہ آثم نے تاریخ لکھی۔ آہ غالب بمرود^{۱۹}۔ مرنے سے چند روز پہلے یہ شعر کہا تھا اور اکڑ چکی پڑتے رہتے تھے۔

دم واپسین بر سر دل ہے
 عزیز و اب اللہ ہی اللہ ہے

مرزا صاحب کے حالات اور طبعی عادات
 اس میں کچھ شک نہیں کہ مرزا اہل ہند میں فارسی کے ہاکم شاعر تھے۔ مگر علوم درسی

کی تحصیل طالب علمانہ طور سے نہیں کی اور حق پر چھو تو یہ بڑے فخر کی بات ہے کہ ایک امیر زادہ کے سر سے بچپن میں بزرگوں کی تربیت کا ہاتھ اٹھ جائے اور وہ فقط طبعی ذوق سے اپنے تئیں اس درجہ کمال تک پہنچائے وہ کیسی طبع خدا داد لایا ہو گا جس نے اس کے فکر میں یہ بلند پروازی، دیباچہ میں یہ معنی آفرینی، خیالات میں ایسا انداز لفظوں میں نئی تراش اور ترکیب میں انوکھی روش پیدا کی۔ جاہل خود ان کا قول ہے اور حقیقت میں لطف سے خالی نہیں کہ زبان فارسی سے مجھے مناسبت ازلی ہے ایک اور جگہ فرماتے ہیں کہ میری طبیعت کو اس زبان سے ایک قدرتی لگاؤ ہے۔ مفتی میر عباس صاحب کو قاطع برہان بھیج کر خط لکھا ہے اس میں فرماتے ہیں ”دیباچہ اور خاتمہ میں جو کچھ لکھ آیا ہوں۔ سب سچ ہے۔ کلام کی حقیقت کی داغ بیل چاہتا ہوں۔ گزارش لطافت سے خالی نہ ہوگی۔ گزارش لطافت سے خالی نہ ہوگی۔ علم و ہنر سے عاری ہوں۔ لیکن بچپن برس سے محو سخن گزاری ہوں۔ مہدۂ فیاض کا مجھ پر احسان عظیم ہے۔ سادہ میرا بھیج اور طبع میری سلیم ہے۔ فارسی کے ساتھ ایک مناسبت ازلی اور سرمدی لایا ہوں۔ مطابق اہل پارس کے منطق کا سرور بھی ابدی لایا ہوں۔

ہرمزد^{۳۰} نام ایک پارسی ژند و پانڈک کا عالم تھا۔ اس نے اسلام اختیار کیا اور عبدالصمد اپنا نام رکھا۔ ایام سیاحت میں ہندوستان کی طرف آنکھ اور مرزا سے بھی ملاقات ہوئی۔ اگرچہ ان کی عمر اس وقت ۱۳ برس کی تھی۔ مگر وہی مناسبت ازلی طبیعت میں تھی۔ جس نے اسے کھینچا اور دو برس تک گھر میں مہمان رکھ کر اکتساب کمال کیا۔ اس روشن ضمیر کے فیضان صحبت کا نہیں فخر تھا اور حقیقت میں یہ امر فخر کے قابل ہے۔

میں نے چاہا کہ مرزا صاحب کی تصویر الفاظ و معانی سے کھینچوں۔ مگر یاد آیا کہ انھوں نے ایک جگہ اسی رنگ و روغن سے اپنی تصویر آپ کھینچی ہے۔ میں اس سے زیادہ کیا کر لوں گا۔ اس کی نقل کافی ہے۔ مگر ذرا اتنا سن لو کہ مرزا حاتم علی مہر شخص ایک شخص اگر وہ میں تھے۔ مرزا کے اواخر عمر میں اس ہم وطن بھائی سے خط و کتابت جاری ہوئی۔ وہ ایک وجہ اور طرح دار جوان تھے۔ ان سے وید و اوید نہ ہوئی تھی۔ لیکن کسی زمانہ کی ہم وطنی، شعر گوئی، ہم نوا ہی اور اتحاد خیالات کے تعلق سے شاید کسی جلسہ میں مرزا نے کہا کہ مرزا حاتم علی مہر کو سنا ہوں کہ طرح دار آدمی ہیں۔ دیکھنے کوئی چاہتا ہے۔ انھیں جو یہ خبر پہنچی تو مرزا کو خط لکھا اور اپنا جلیہ

بھی قلم۔ اب اس کے جواب میں جو مرزا آپ اپنی تصویر کھینچتے ہیں اسے دیکھنا چاہیے۔ ”بھائی
 تمہاری طرح دہری کا ذکر میں نے مغل جان سے سنا تھا۔ جس زمانہ میں کہ وہ حامد علی خاں کی
 نوکر تھی اور اس میں مجھ میں بے تکلفانہ ربا تھا۔ تو اکثر مغل سے پہرہ دل اشتباہ ہوا کرتے
 تھے۔ اس نے تمہارے شعر اپنی تعریف کے بھی مجھ کو دکھائے۔ بہر حال تمہارا طبع دیکھ کر
 تمہارے کشیدہ قاصد ہونے پر مجھ کو رشک نہ آیا۔ کس واسطے کہ میرا قد بھی درازی میں
 انگشت نما ہے۔ تمہارے گندی رنگ پر رشک نہ آیا۔ کس واسطے کہ جب میں بیٹھا تھا تو میرا
 رنگ چمنسہئی تھا اور دید و دور لوگ اس کی ستائش کیا کرتے تھے۔ اب جو کبھی مجھ کو وہ اپنا رنگ یاد
 آتا ہے تو چھاتی پر ساپ سا بچر جاتا ہے۔ ہاں مجھ کو رشک آیا اور میں نے خون جگر کھایا تو اس
 بات پر کہ (تمہاری) ڈاڑھی خوب کھنی ہوئی ہے وہ مزے یاد آگئے کیا کہوں گی پر کیا گزری۔
 بقول شیخ علی حزمین۔

تاوست رسم بود دم چاک گرہاں
 شرمندگی از خرقہ پوشینہ ندوم

(میرے) جب ڈاڑھی سوچھ میں ہال سفید آگئے۔ تیسرے دن جیونئی کے اٹلے
 کانوں پر نظر آنے لگے۔ اس سے بلا کر یہ ہوا کہ آگے کے دودانت ٹوٹ گئے۔ تاجار (میں
 نے) مٹی بھی چھوڑ دی اور ڈاڑھی بھی۔ مگر یہ یاد رکھیے کہ اس بھونڈے شہر میں (یعنی دہلی
 میں) ایک دروی ہے، عام ملا، حافظ، بساطی، پچھ بند، دھوبی، سدا، بھنڈیاد، جولاہا، کچھڑا، منہ
 پر ڈاڑھی، سر پر بال۔ میں نے جس دن ڈاڑھی رکھی۔ اسی دن سر منڈایا۔ ”اس فقرہ سے بھی
 معلوم ہوا کہ اپنا انداز سب سے الگ رکھنا چاہتے تھے۔ لباس ان کا اکثر اہل ولایت کا ہوتا تھا۔
 سر پر اگرچہ کلاہ پیاڑا نہ تھی۔ مگر لمبی ٹوپی سیاہ پوشین کی ہوتی تھی اور ایسا ضرور چاہیے تھا۔
 کیوں کہ وہ فارسی نویسی کو نہ فقط ذوق بلکہ عشق دلی کے ساتھ جانتے تھے اور لباس و گفتار کی
 کچھ خصوصیت تھیں۔ وہ اپنی قدامت کی ہر بات سے محبت رکھتے تھے۔ خصوصاً خاندان کے
 اعزازوں کو ہمیشہ جاننا عرق ریزیوں کے ساتھ بچاتے رہے۔ اس اعزاز پر کہ جو ان کے پاس
 باقی تھا۔ دودھ آسانی صدمہ پہنچے۔ قول جب کہ بچا کا انتقال ہوا۔ دوسرے جب ۷۵ء میں
 تا کر وہ گناہ بغاوت کے جرم میں پٹن کے ساتھ کرسی دربار اور خلعت بند ہوا۔ اردوے معلیٰ

میں شیعوں، بدستوں کے نام خط چس کوئی اس کے نام سے خلی نہیں۔ ان کے لفظوں سے اس قسم میں خون چکتا ہے اور دل پر جو گزرتی ہوگی وہ تو خدا ہی کو خبر ہے۔ آخر پھر ان کی جگہ اور اپنا حق لیا اور ہزارگوں کے نام کو قائم رکھا۔

۱۸۳۲ء میں گورنمنٹ انگلینڈ کو دہلی کالج کا انتظام از سر نو منکور ہوا۔ نامسن صاحب جو کئی سال تک اصلاح شمال و مغرب کے فکشنٹ گورنر بھی رہے۔ اس وقت سکریٹری تھے۔ وہ مدرسین کے امتحان کے لیے دہلی آئے اور چاہا کہ جس طرح سو روپیہ مہینے کا ایک مدرس عربی ہے۔ ایسا ہی ایک فارسی کا بھی ہو۔ لوگوں نے چند کاموں کے نام بتائے۔ ان میں مرزا کا نام بھی آیا۔ مرزا صاحب حسب الطلب تشریف لائے۔ صاحب کو اطلاع ہوئی۔ مگر یہ پاکی سے انکار اس انتظار میں ٹھہرے کہ حسب دستور قدیم صاحب سکریٹری استقبال کو تشریف لائیں۔ جب کہ نہ وہ اور نہ آئے۔ نہ یہ اور نہ آئے۔ نہ وہ تو صاحب سکریٹری نے جھوٹ سے پوچھا وہ پھر باہر آیا کہ آپ کیوں نہیں آتے۔ انھوں نے کہا کہ صاحب استقبال کو تشریف نہیں لائے۔ میں کیوں کر جاتا۔ جھوٹا نے جا کر پھر عرض کی۔ صاحب باہر آئے اور کہا کہ جب آپ دربار گورنری میں بہ حیثیت ریاست تشریف لائیں گے تو آپ کی وہ تعلیم ہوگی لیکن اس وقت آپ نوکری کے لیے آئے ہیں اس تعلیم کے مستحق نہیں۔ مرزا صاحب نے فرمایا کہ گورنمنٹ کی عازمت باعث زیادتی اعزاز سمجھتا ہوں۔ نہ یہ کہ ہزارگوں کے اعزاز کو بھی گنوا بیٹھوں۔ صاحب نے فرمایا کہ ہم آئین سے مجبور ہیں۔ مرزا صاحب رخصت ہو کر چلے آئے۔ صاحب موصوف نے مومن خاں صاحب کو بلا دیا۔ ان سے کتاب پڑھا کر سنی اور زبانی باتیں کر کے اسی روپیہ تحفہ قرار دی۔ انھوں نے سو روپیہ سے کم منکور نہ کیے۔ صاحب نے کہا سو روپے تو تو ہمارے ساتھ چلو۔ ان کے دل نے نہ مانا کہ دہلی کو ایسا ستاج ڈالیں۔ مرزا کے کھلے ہوئے دل اور کھلے ہوئے ہاتھ نے ہمیشہ مرزا کو ٹھک رکھا مگر اس ٹھک دستی میں بھی لذت کے تھپے قائم تھے۔ چنانچہ اردوئے معلیٰ کے اکثر خطوط سے یہ حال آئینہ ہے۔ مرزا قلعہ ^{۲۱} اپنے شاکر و رشید کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔ سو روپیہ کی ہنڈی وصول کرنی۔ ۲۳ روپیہ داروغہ کی معرفت اٹھے تھے وہ دے دے۔ ۵۰ روپیہ گل میں بھیج دے۔ ۲۶ باقی رہے وہ یکس میں رکھ لے۔ کلیمان سودا لینے بازار گیا ہے۔

جلد آیا تو آج ورنہ کل یہ خط ڈاک میں بھیج دوں گا۔ خدائے کو جیتا رکھے اور اجر دے، بھائی
بری آتی ہے۔ انجام اچھا نظر نہیں آتا۔ قصہ مختصر یہ کہ قصہ تمام ہوا۔

کدرا تھو آپ کا دیوان تھا۔ اسی عالم میں ماہ بہ ماہ آکر چٹھا بانٹ دیتا تھا۔ آپ کہیں سفر
میں گئے ہیں تو اس کے لیے غلطو میں بار بار احکام بھیجتے ہیں۔ چنانچہ ایک خط میں لکھتے ہیں۔
ہندوئی میں ۱۳ دن کی میعاد تھی۔ ۶ دن گزر گئے تھے ۶ دن باقی تھے۔ مجھ کو مہر کہاں۔ مٹی کاٹ
کر روپے لے لیے۔ قرض متفرق سب ادا ہوا۔ بہت سبکدوش ہو گیا۔ آج میرے پاس
سینتالیس روپے نقد بکس میں ہیں اور ۳ بوتل شراب کی اور تین شیشے گھاپ کے تو شہ خاند
میں موجود ہیں۔ الحمد للہ علی احسان۔

ایک اور جگہ اپنی بیماری کا حال کسی کو لکھتے ہیں۔ "محل سراگر چہ دیوان خاند کے بہت
قریب ہے پر کیا امکان جو چل سکوں۔ صبح کو ۵ بجے کھانا پکھن آجاتا ہے چنگ پر کھسل پڑا ہوا
منہ دھو کر کھانا کھایا۔ پھر ہاتھ دھوئے گھی کی۔ چنگ پر جا پڑا۔ چنگ کے پاس حاجتی لکٹی رتی
ہے اٹھا اور حاجتی میں پیشاب کر لیا اور پڑا۔"

نواب الہی بخش خان مرحوم کی صاحبزادی سے مرزا صاحب کی شادی ہوئی اور اس وقت
۱۳ برس کی عمر تھی۔ باوجودیکہ اوصناع و اطوار آزادانہ رکھتے تھے۔ لیکن آخر صاحب خاندان
تھے۔ گمرانے کی لاج پر خیال کر کے بی بی کا پاس خاطر بہت مد نظر رکھتے تھے۔ پھر بھی اس قید
سے کہ خلاف طبع تھی جب بہت دق ہوتے تھے تو ہنسی میں مالتے تھے۔ چنانچہ دوستوں کی
زبانی بعض نقلیں بھی سیں اور ان کے غلطو سے بھی اکڑ جگہ پلایا جاتا ہے ایک قدیمی شاگرد
سے ایسے معاملات میں بے تکلفی تھی۔ اس نے امر لا تنگہ نام ایک اور شاگرد کی بی بی کے
مرنے کا حال مرزا صاحب کو لکھا اور یہ بھی لکھا کہ خستہ خستہ بیچے ہیں۔ اب اور شادی نہ کرے
تو کیا کرے؟ پھر بیچے کون پالے؟ اس شخص کی ایک بی بی پہلے مر چکی تھی۔ یہ دوسری بی بی
مری تھی۔ اب حضرت اس کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں۔ "امر لا تنگہ کے حال پر اس
کے واسطے رحم اور اپنے واسطے رفق آتا ہے۔ اللہ اللہ ایک وہ ہیں کہ دوہران کی چیزیاں کٹ
بجلی ہیں اور ایک ہم ہیں کہ ایک لوہے پچاس برس سے جو پھانسی کا پھندا اگلے میں پڑا ہے تو نہ
پھندا ہی ٹوٹتا ہے نہ دم ہی ڈالتا ہے۔ اس کو سمجھاؤ کہ بھائی تیرے بچوں کو میں پالوں گا تو

کیوں جلا میں پھنستا ہے۔“

جب ان کی ٹیشن مکمل تو ایک اور شخص کو لکھتے ہیں۔ ”تجھ کو میری جان کی قسم اگر میں عجا ہوتا تو اس وجہ قلیل میں کیسا فارغ الہال و خوشحال رہتا۔“ مرزا صاحب نے فرزند ان روحانی یعنی پاک دیالوات اور عالی مضامین سے ایک ایسے بے شمار اپنی نسل میں یادگار چھوڑا۔ مگر افسوس کہ جس قدر اوجہ سے خوش نصیب ہوئے اسی قدر فرزند ان ظاہری کی طرف سے بے نصیب ہوئے۔ چنانچہ ایک جگہ فرماتے ہیں۔ سات^{۲۳} بچے ہوئے۔ مگر برس برس کے

پس و پیش میں سب ملک عدم کو چلے گئے۔ ان کے بی بی کے بھانجے النبی بخش خان مرحوم کے نواسے زین العابدین خان تھے اور عارف نقیص کرتے تھے۔ عارف^{۲۴} جوان مر گئے اور دو

نئے نئے بچے یادگار چھوڑے۔ بی بی ان بچوں کو بہت چاہتی تھیں۔ اس لیے مرزا نے انھیں اپنے بچوں کی طرح پالا۔ بڑھاپے میں انھیں گلے کا ہار کیے پھرتے تھے۔ جہاں جاتے وہاں کی میں ساتھ ہوتے تھے۔ ان کے آرام کے لیے آپ بے آرام ہوتے تھے۔ ان کی فرمائش پوری کرتے تھے۔ افسوس کہ مرزا کے بعد دونوں جوان مر گئے۔ نواب احمد بخش خان مرحوم کے رشید فرزند مرزا صاحب کی تکلیف دہ دیکھ سکتے تھے۔ کمال کی دولت ان سے لیتے تھے، دنیا کی ضرورتوں میں انھیں آرام دیتے تھے۔ چنانچہ نواب^{۲۵} ضیاء الدین خان صاحب شاگرد ہیں۔ نواب^{۲۶} امین الدین خان مرحوم والی لوہار و بھی آداب خورد و نشہ کے ساتھ خدمت

کرتے تھے۔ نواب علاء الدین خان والی حال اس وقت ولی عہد تھے۔ بچپن سے شاگرد ہیں۔ چنانچہ مرزا صاحب نواب^{۲۷} علاء الدین خان صاحب کو لکھتے ہیں۔ ”مہاں بڑی مصیبت میں ہوں۔ محل مرا کی دوا میں گر گئی ہیں۔ پانخانہ ڈھکیا۔ چھتیس ٹیکہ دی ہیں۔ تھماری پھو بھی^{۲۸}

کہتی ہیں کہ ہاے دہلی ہاے مری۔ دیوان خانہ کا حال محل مرا سے بدتر ہے۔ میں مرنے سے نہیں ڈرتا۔ فقط ان راحت سے گمراہ گیا ہوں۔ چھت چھٹی ہے۔ ابرو دو گھنٹے برسے تو چھت چار گھنٹے برستی ہے۔ مالک اگر چاہے کہ مرمت کرے تو کیوں کر کرے۔ مینہ کھلے تو سب کچھ ہو اور پھر اٹھائے مرمت میں میں بیضا کس طرح رہوں۔ اگر تم سے ہو سکے تو برسات تک

چلا کہ چاند رات کے دن یہاں آ پہنچا۔ ایک شعبہ کو طرکہ ماہ مقدس ہوا۔ اسی دن سے ہر صبح کو حامد علی خان کی مسجد میں جا کر جناب مولوی جعفر علی صاحب سے قرآن سنتا ہوں شب کو مسجد جامعہ جا کر نماز تراویح پڑھتا ہوں۔ کبھی جوئی میں آتی ہے تو وقت صوم منہاب باغ میں جا کر روزہ کھاتا ہوں اور سردپانی پیتا ہوں۔ دلو وہ کیا اچھی طرح عمر ۳۰ بسر ہوتی ہے۔ اب اصل حقیقت سنو۔ لڑکوں کو ساتھ لے گیا تھا۔ وہاں انھوں نے میرا تک میں دم کر دیا تھا بھیج دینے میں وہم آیا کہ خدا جانے اگر کوئی امر حادثات ہو تو بدلتی عمر بھر رہے۔ اس سبب سے جلد چلا آیا۔۔۔ ورنہ گرمی برسات وہیں کا تھا۔ اب بشرط حیات جریدہ بعد برسات چاہیں گا اور بہت دنوں تک یہاں نہ آؤں گا۔ قرار دایا ہے کہ نواب صاحب جولائی ۱۸۵۹ء سے کہ جس کو یہ دسواں مہینہ ہے۔ سو روپیہ مجھے ملا۔ ملا بھیجتے ہیں۔ اب میں جو وہاں گیا تو سو روپیہ مہینہ تمام دھوت اور دیا۔ یعنی راجپور ہوں تو دو سو روپیہ مہینہ پاؤں اور دتی رہوں تو سو روپیہ۔ بھائی اسود دسواں کلام نہیں کلام اس میں ہے کہ نواب صاحب دوستانہ و شاگردانہ دیتے ہیں۔ مجھ کو نوکر نہیں سمجھتے ہیں۔ ملاقات بھی دوستانہ رہی۔ معاونت و تعلیم جس طرح احباب میں رسم ہے۔ وہ صورت ملاقات کی ہے۔ لڑکوں سے میں نے نذر دلوائی تھی۔ پس بہر حال خفیمت ہے۔ رزق کے اچھی طرح ملنے کا شکر چاہیے۔ کمی کا شکوہ کیا؟ انگریز کی سرکار سے دس ہزار روپیہ سال ٹھہرے۔ اس میں سے مجھ کو ملے ساڑھے سات سو روپیہ سال۔ ایک صاحب نے نہ دیئے مگر تین ہزار روپیہ سال۔ عزت میں وہ پایا جو رئیس زادوں کے واسطے ہوتا ہے ہمارا۔ خان صاحب بسیار مہربان و دوستانہ القاب خلعت سات پارچہ اور جیلہ و سر بیچ و بالائے مردارید۔ ہاں شاہ اپنے فرزندوں کے برابر پیاد کرتے تھے۔ بخشی، ناظر، حکیم کسی سے توقیر کم نہیں مگر فائدہ ہی قلیل۔

سو میری جان اب یہاں بھی وہی نقشہ ہے۔ کو غری میں بیٹھا ہوں نئی لگی ہوئی ہے ہوا آ رہی ہے پانی کا بھجور دھرا ہوا ہے۔ حقہ پی رہا ہوں۔ یہ خط لکھ رہا ہوں۔ تم سے باتیں کرنے کو جی چاہا یہ باتیں کر لیں۔ خط تمام منشی ہر کوپال تھتہ۔ بس اب تم اسکندر آباد میں رہے کہیں اور کیوں جاؤ گے بینک گمرکار رو رہے کھا چکے ہو۔ اب کہاں سے کھاؤ گے۔ میاں اند میرے سمجھانے کو دٹل ہے نہ تمہارے سمجھنے کی جگہ ہے ایک چرخ ہے کہ وہ چلا جاتا ہے جو ہوتا ہے

وہ ہوا جاتا ہے۔ اختیار ہو تو کچھ کیا جائے۔ کہنے کی بات ہو تو کچھ کہا جائے۔ مرزا عبدالقادر ہیدل اسلوب کہتا ہے۔

رہبت جاہ چہ و نفرت اسباب کدام
زمین ہو سہاگدور یا نگزر میگزرد

مجھ کو دیکھو کہ نہ آزاد ہوں نہ مقید۔ نہ رنجور ہوں نہ تندرست۔ نہ خوش ہوں نہ غمناک۔ نہ مردہ ہوں نہ زندہ۔ سچے جاتا ہوں۔ باتیں کیے جاتا ہوں، روئی روز کھاتا ہوں۔ شراب کا گاہ چہے جاتا ہوں۔ جب موت آئے گی سر بھی رہوں گا۔ نہ شکر ہے نہ شکایت ہے جو تقریر ہے یہ سبیل حکایت ہے۔

مرزا کے تمام خاندان کا اور ہزار گوں کا مذہب سنت و جماعت تھا۔ مگر اہل راز اور تعنیفات سے بھی ثابت ہے کہ ان کا مذہب شیعہ تھا اور لطف یہ تھا کہ ظہور اس کا جوش محبت میں تھا کہ فرادہ نکرا رہے۔ چنانچہ اکثر لوگ انھیں نصیری کہتے تھے اور وہ سن کر خوش ہوتے تھے۔ ایک جگہ کہتے ہیں۔

منصور فرقہ علی المہدیان منم
آولاء انا اسد اللہ برا منکم

تمام اقربا اور حقیقی دوست سنت و جماعت تھے لیکن ان کی اپنائیت میں کسی طرح کی دوری نہ معلوم ہوتی تھی۔ مولانا فخر الدین کے خاندان کے مرید بھی تھے۔ دربار اور اہل دربار میں کبھی اس معاملہ کو نہیں کھولتے تھے اور یہ طریقہ دہلی کے اکثر خاندانوں کا تھا۔

تعنیفات اردو میں تقریباً ۱۸۰۰ شعر کا ایک دیوان دستیابی ہے کہ ۱۸۳۹ء میں مرتب ہو کر چھپا^{۳۲}۔ اس میں کچھ قلم اور کچھ ناقام غزلیں ہیں اور کچھ متفرق اشعار ہیں۔ غزلوں کے تحفین ۵۰۰ اشعار، قصیدوں کے ۱۶۲ شعر مشوی ۳۳ شعر، متفرقات قطعوں کے ۱۱۱ شعر، رباعیاں ۶۹، دو تار بختیں جن کے ۴ شعر۔ جس قدر عالم میں مرزا کا نام بلند ہے اس سے ہزاروں اور چہ عالم معنی میں کلام بلند ہے بلکہ اکثر ایسے اعلیٰ درجہ رقص پر واقع ہوئی ہیں کہ ہمارے نارسا ذہن وہاں تک نہیں پہنچ سکتے۔ جب ان شکایات کے چرچے زیادہ ہوئے تو اس

ملک بے نیازی کے بادشاہ نے کہ اعلیٰم خن کا بھی بادشاہ تھا اپنی غزل کے ایک شعر سے سب کو جواب دے دیا۔

نہ ستائش کی تمنا نہ صلہ کی پروا
نہ کسی گھر سے اشعار میں معنی نہ کسی ۳۳

اور ایک رہائی بھی کہی۔

مشکل ہے زبں کلام میرا اے دل
سن سن کے اے سخنورانِ کامل
آساں کہنے کی کرتے ہیں فرمائش
گویم مشکل و مگر نہ گویم مشکل ۳۴

ایک دن استاد مرحوم سے مرزا صاحب کیا نہ از تازک خیالی کا اور فارسی ترکیبوں کا اور لوگوں کی مختلف طبیعتوں کا ذکر تھا۔ میں نے کہا بعض شعر صاف بھی نکل جاتا ہے تو قیامت ہی کر جاتا ہے۔ فرمایا، خوب! پھر کہا کہ جو مرزا کا شعر ہوتا ہے اس کی لوگوں کو خبر بھی نہیں ہوتی۔ شعر ان کے میں تمہیں سنا ہوں۔ کئی متفرق شعر پڑھے۔ ایک اب تک خیال میں ہے۔

دریاے معاصی نکل آئی سے ہوا خشک
میرا سر دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا ۳۵

اس میں کلام نہیں کہ وہ اپنے نام کی تاخیر سے مضامین و معانی کے چشمہ کے شیر تھے۔ دو باتیں ان کے انداز کے ساتھ خصوصیت رکھتی ہیں۔ اول یہ کہ معنی آفرینی اور تازک خیالی ان کا شیوہ خاص تھا۔ دوسرے چوں کہ فارسی کی مشق زیادہ تھی اور اس سے انھیں طبعی تعلق تھا، اس لیے اکثر الفاظ اس طرح ترکیب دے جاتے تھے کہ بول چال میں اس طرح بولتے نہیں۔ لیکن جو شعر صاف نکل گئے ہیں، وہ ویسے ہیں کہ جواب نہیں رکھتے۔ اہل عرفان بھی اپنی نوک جھونک سے چوکتے نہ تھے۔ چنانچہ ایک دفعہ مرزا بھی منشاء میں تشریف لے گئے حکیم آغا جان ۳۶ میر تقی ایک خوش طبع تکلف مزاج شخص تھے۔ غزل طرہی میں یہ قطعہ پڑھا۔

اگر اپنا کہا تم آپ ہی مجھے تو کیا مجھے!
 مزا کہنے کا جب ہے ایک کہے اور دوسرا مجھے
 کلام میرے مجھے اور زبان میرا مجھے
 مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا مجھے

اسی واسطے اور آخر عمر میں ہازک خیالی کے طریقے کو بالکل ترک کر دیا تھا۔ چنانچہ دیکھو اخیر کی غزلیں صاف صاف ہیں۔ دونوں کی کیفیت جو کچھ ہے معلوم ہو جائے گی۔ سن رسیدہ اور معتبر لوگوں سے معلوم ہوا کہ حقیقت میں ان کا دوج ان بہت بڑا تھا۔ یہ منتخب ہے۔ مولوی فضل حق صاحب کہ فاضل بے حد میل تھے، ایک زمانہ میں دہلی کی عدالت ضلع میں سر شہ دار تھے۔ اسی عہد میں مرزا خان عرف مرزا خانی صاحب کو قوال شہر تھے۔ وہ مرزا قاضی صاحب کے شاگرد تھے۔ نظم، نثر فارسی اچھی لکھتے تھے۔ غرض کہ یہ دونوں باکمال مرزا صاحب کے دلی دوست تھے۔ ہمیشہ باہم دوستانہ جلسے اور شعر و سخن کے چرچے رہتے تھے۔ انھوں نے اکثر غزلوں کو سننا اور دوج ان کو دیکھا تو مرزا صاحب کو سمجھایا کہ یہ اشعار عام لوگوں کی سمجھ میں نہ آئیں گے۔ مرزا نے کہا اتنا کچھ کہہ چکا۔ اب تدارک کیا ہو سکتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ خیر ہوا سو ہوا احتساب کرو اور مشکل شعر نکال ڈالو۔ مرزا صاحب نے دوج ان حوالے کر دیا۔ دونوں صاحبوں نے دیکھ کر احتساب کیا۔ وہ بھی دوج ان ہے جو کہ آج ہم تنیک کی طرح آنکھوں سے لگائے پھرتے ہیں۔^{۳۷}

عود ہندی^{۳۸}۔ کچھ تقریظیں کچھ اور نثریں اور خطوط ہیں۔ اکثر خطوں میں ان لوگوں کے جواب ہیں۔ جنھوں نے کسی مشکل شعر کے معنی پوچھے یا کوئی امر تحقیق طلب فارسی یا اردو کا دریافت کیا۔

اردوئے معلیٰ^{۳۹}۔ ۱۲۸۵ھ۔ ۱۸۶۹ء چند شاگردوں اور دوستوں نے جس قدر اردو

کے خطوط ان کے ہاتھ آئے ایک جگہ ترتیب دیے اور اس مجموعہ کا نام مرزا نے خود اردوئے معلیٰ رکھا۔ ان خطوط کی عبارت ایسی ہے گویا آپ سامنے بیٹھے گل افشانی کر رہے ہیں۔ مگر کیا کریں کہ ان کی باتیں بھی خاص فارسی کی، خوش نما تراشوں اور عمدہ ترکیبوں سے مرصع ہوتی

تھیں۔ بعض فقرے کم استعداد ہندوستانیوں کے کانوں کو نئے معلوم ہوں تو وہ جانیں۔ یہ علم کی کم روایتی کا سبب ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کیا ”جگر خون کن اتفاق ہے۔ اب درنگ درزی کی تفصیر معاف کیجئے۔ پس چاہیے کہ کئی کی آرامش کا ترک کرنا اور خواہی غنوائی باہو صاحب کے ہمراہ رہنا یہ رتبہ میری اور زش کے فوق ہے۔ سرمایہ بہار ش قلم رد ہندوستان ہو۔“ بعض جگہ خاص محاورہ فارسی کا ترجمہ کیا ہے جیسے میر اور سودا وغیرہ استادوں کے کلام میں لکھا گیا ہے۔ چنانچہ انہی غلطیوں میں فرماتے ہیں۔ اس قدر غور چاہتے ہو۔ یہ لفظ ان کے قلم سے اس واسطے نکلا کہ غور خواستین جو فارسی کا محاورہ ہے وہ اس باکمال کی زبان پر چڑھا ہوا ہے۔ ہندوستانی غور کرنا یا غور معذرت کرنی بولتے ہیں۔ نظر اس دستور پر اگر دیکھو تو مجھے اس شخص سے جس برابر علاقہ عزیز داری کا نہیں۔ یہ بھی ترجمہ۔ نظر برین مضابط کا ہے۔ فشی نبی بخش تمہارے خط نہ لکھنے کا گلہ رکھتے ہیں۔ گلہ پلوار نہ د شکوہ پلوار نہ فارسی کا محاورہ ہے۔ کیوں مہاراج کول میں آیا! فشی نبی بخش کے ساتھ غزل خوانی کرنی اور ہم کو یاد نہ لانا۔ یاد آوردن خاص ایران کا سکہ ہے۔ ہندوستانی یاد کرنا بولتے ہیں۔ جو آپ پر معلوم ہے وہ مجھ پر بھول نہ رہے۔ ہرچہ بر شامکشف است بر من مخفی نہاد۔

ان غلطیوں کی طرز عبارت بھی ایک خاص قسم کی ہے کہ ظرافت کے چٹکے اور لطافت کی شخیان ان میں خوب لیا ہو سکتی ہیں۔ یہ انہی کا ایجاد تھا کہ آپ مزالے لیا اور اوردوں کو لطف دے گئے۔ دوسرے کا کام نہیں۔ اگر کوئی چاہے کہ ایک تاریخی حال یا اخلاقی خیال یا علمی مطالب یاد دینا کے معاملات خاص میں مراسلے لکھے تو اس انداز میں ممکن نہیں۔ اس کتاب میں چون کہ اصلی خط لکھے ہیں۔ اس لیے وہ ان کی ظاہر و باطن کی حالت کا آئینہ ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کے غم و الم ہمیشہ انھیں ستاتے تھے اور وہ غلو حوصلہ سے فسی ہی میں اڑاتے تھے پورا لطف ان تحریروں کا اس شخص کو آتا ہے کہ جو خود ان کے حال سے اور مکتوب الیہوں کی چال و حال سے اور طرفین کے ذاتی معاملات سے بہ خوبی واقف ہو۔ غیر آدمی کی سمجھ میں نہیں آتیں۔ اس لیے اگر عواقف اور بے خبر لوگوں کو اس میں حزانہ آئے تو کچھ تعجب نہیں۔

اس کتاب میں قلم۔ التماس کو مونث، پنشن، بیدا، بارک کو مذکر فرمایا ہے ایک جگہ

فرماتے ہیں۔ ”میر اردو پہ نسبت اردوؤں کے فصیح ہو گا۔“
 لطائف غیبی^{۴۰}۔ اس رسالہ میں غشی سعادت علی کی طرف روئے سخن ہے۔ اگرچہ اس کے دیباچہ میں سیف الحق کا نام لکھا ہے مگر انداز عبارت اور عبارت کے چٹکے صاف کہتے ہیں کہ مرزا ہیں۔ در حقیقت وہی میاں دلو خاں ہیں۔۔۔۔ جن کے نام چند دفعے مرزا صاحب کے اردوئے معلیٰ میں ہیں چنانچہ ایک دفعہ میں انھیں فرماتے ہیں کہ صاحب میں نے تم کو سیف الحق خطاب دیا۔ تم میری فوج کے سپہ سالار ہو۔
 حقیقہ تیز^{۴۱}۔ مولوی احمد علی پرویسر مدرسہ انکلی نے قاطع برہان کے جواب میں موبد البرہان^{۴۲} لکھی تھی۔ اس کے بعض مراتب کا جواب مرزا صاحب نے تحریر فرما کر حقیقہ تیز نام رکھا۔
 ساطع برہان^{۴۳} کے اثیر میں چند ورق سید عبداللہ کے نام سے ہیں۔ وہ بھی مرزا صاحب کے ہیں۔

تصنیفات فارسی

فارسی کی تصنیفات کی حقیقت حال کا لکھنا اور ان پر رائے لکھنی اردو کے تذکرہ نویس کا کام نہیں ہے۔ اس لیے فقط فہرست لکھتا ہوں۔
 قصائد۔ حمد و نعت میں آخر معصومین کی مدح میں۔ پادشاہ دہلی۔ شاہزادہ۔ گورنروں اور بعض صاحبان عالی شان کی تعریف میں ہیں۔
 غزلوں کا دیوان^{۴۴}۔ معد دیوان قصائد کے ۳۳ء / ۳۵ء میں مرتب ہو کر نقول کے ذریعہ سے اہل ذوق میں پھیلا اور اب تک کئی دفعہ چھپ چکا ہے۔
 شج آہنگ^{۴۵}۔۔۔۔ اس میں پانچ آہنگ کے پانچ باب۔ فارسی کے انشاء پردازوں کے لیے لکھا کہ ان کے انداز میں لکھنا چاہئیں۔ ایک عمدہ تصنیف ہے۔
 ۱۸۶۲ء میں قاطع برہان لکھی۔ بعد کچھ کچھ تبدیلی کے اسی کو پھر چھپوایا اور درفش کا دیوانی

نام رکھل۔ برہان قاطع کی غلطیاں نکالی ہیں۔ مگر اسی پر فارسی کے دعویداروں نے سخت حملوں کے ساتھ مخالفت کی۔

نامہ غالب ۳۶۔ قاطع برہان کے کئی مضمونوں نے جواب لکھے۔ چنانچہ میرٹھ میں حافظ عبدالرحیم نام ایک معظم تاجنا تھے۔ انھوں نے اس کا جواب سا طبع برہان لکھا۔ مرزا صاحب نے خط کے عنوان میں حافظ صاحب موصوف کو بطور جواب کے چند ورق لکھے اور ان کا نام نامہ غالب رکھا۔

مہر نیم روز ۳۷۔ حکیم احسن اللہ خاں طیب خاص بادشاہ کے تھے۔ انھیں تاریخ کا شوق تھا اور اہل کمال کے ساتھ عموماً تعلق خاطر رکھتے تھے۔ مرزا نے ان کے ایماءے قول کتاب مذکور کا ایک حصہ لکھا۔ اسی کے ذریعے سے ۵۰ء میں باریاب حضور ہو کر خدمت تاریخ نویسی پر مامور ہوئے اور انجم الدولہ دبیر الملک مرزا اسد اللہ خاں غالب بہادر نظام جنگ خطاب ہوئے۔ چنانچہ پہلی جلد میں امیر تیمور سے اہالیوں تک کا حال بیان کر کے مہر نیم روز نامہ رکھل ارادہ تھا کہ اکبر سے لے کر بہادر شاہ تک کا حال دوسری جلد میں لکھیں اور ماہ نیم ماہ رکھیں کہ خد ہو گیا۔

دستبرد ۳۸۔ ۱۱/ مئی ۱۸۵۷ء سے کلم جولائی ۱۸۵۸ء تک حال بدلتا رہا۔ روداد جاری شہر۔ اپنی سرگزشت۔ عرض کل ۱۵ مینے کا حال لکھا ہے۔

سہد بھگن ۳۹۔ دو تین قصیدے چند خطوط۔ فارسی کے اس میں ہیں کہ دج ان میں درج نہ ہوئے تھے۔

اواخر عمر میں اپنا کلام اپنے پاس نہ رکھتے تھے۔ اردو کی تصنیفات نواب حسین مرزا صاحب کے پاس رہتی تھیں اور وہ ترتیب کرتے جاتے تھے۔ فارسی نواب ضیاء الدین احمد خان صاحب کو بھیج دیتے تھے کہ انھیں نیرو درخشاں لکھیں کر کے اپنا رشید شاہگر داور خلیفہ اول قرار دیا تھا۔ خلیفہ دوم، نواب علامہ الدین خان صاحب تھے۔

ان کے خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی انعام دہانی کے شوق کو بڑی کاوش اور عرق ریزی سے نبھاتے تھے۔ اسی واسطے مرنے سے ۱۰۔ ۱۱۔ ۱۲۔ ۱۳۔ ۱۴۔ ۱۵۔ ۱۶۔ ۱۷۔ ۱۸۔ ۱۹۔ ۲۰۔ ۲۱۔ ۲۲۔ ۲۳۔ ۲۴۔ ۲۵۔ ۲۶۔ ۲۷۔ ۲۸۔ ۲۹۔ ۳۰۔ ۳۱۔ ۳۲۔ ۳۳۔ ۳۴۔ ۳۵۔ ۳۶۔ ۳۷۔ ۳۸۔ ۳۹۔ ۴۰۔ ۴۱۔ ۴۲۔ ۴۳۔ ۴۴۔ ۴۵۔ ۴۶۔ ۴۷۔ ۴۸۔ ۴۹۔ ۵۰۔ ۵۱۔ ۵۲۔ ۵۳۔ ۵۴۔ ۵۵۔ ۵۶۔ ۵۷۔ ۵۸۔ ۵۹۔ ۶۰۔ ۶۱۔ ۶۲۔ ۶۳۔ ۶۴۔ ۶۵۔ ۶۶۔ ۶۷۔ ۶۸۔ ۶۹۔ ۷۰۔ ۷۱۔ ۷۲۔ ۷۳۔ ۷۴۔ ۷۵۔ ۷۶۔ ۷۷۔ ۷۸۔ ۷۹۔ ۸۰۔ ۸۱۔ ۸۲۔ ۸۳۔ ۸۴۔ ۸۵۔ ۸۶۔ ۸۷۔ ۸۸۔ ۸۹۔ ۹۰۔ ۹۱۔ ۹۲۔ ۹۳۔ ۹۴۔ ۹۵۔ ۹۶۔ ۹۷۔ ۹۸۔ ۹۹۔ ۱۰۰۔ ۱۰۱۔ ۱۰۲۔ ۱۰۳۔ ۱۰۴۔ ۱۰۵۔ ۱۰۶۔ ۱۰۷۔ ۱۰۸۔ ۱۰۹۔ ۱۱۰۔ ۱۱۱۔ ۱۱۲۔ ۱۱۳۔ ۱۱۴۔ ۱۱۵۔ ۱۱۶۔ ۱۱۷۔ ۱۱۸۔ ۱۱۹۔ ۱۲۰۔ ۱۲۱۔ ۱۲۲۔ ۱۲۳۔ ۱۲۴۔ ۱۲۵۔ ۱۲۶۔ ۱۲۷۔ ۱۲۸۔ ۱۲۹۔ ۱۳۰۔ ۱۳۱۔ ۱۳۲۔ ۱۳۳۔ ۱۳۴۔ ۱۳۵۔ ۱۳۶۔ ۱۳۷۔ ۱۳۸۔ ۱۳۹۔ ۱۴۰۔ ۱۴۱۔ ۱۴۲۔ ۱۴۳۔ ۱۴۴۔ ۱۴۵۔ ۱۴۶۔ ۱۴۷۔ ۱۴۸۔ ۱۴۹۔ ۱۵۰۔ ۱۵۱۔ ۱۵۲۔ ۱۵۳۔ ۱۵۴۔ ۱۵۵۔ ۱۵۶۔ ۱۵۷۔ ۱۵۸۔ ۱۵۹۔ ۱۶۰۔ ۱۶۱۔ ۱۶۲۔ ۱۶۳۔ ۱۶۴۔ ۱۶۵۔ ۱۶۶۔ ۱۶۷۔ ۱۶۸۔ ۱۶۹۔ ۱۷۰۔ ۱۷۱۔ ۱۷۲۔ ۱۷۳۔ ۱۷۴۔ ۱۷۵۔ ۱۷۶۔ ۱۷۷۔ ۱۷۸۔ ۱۷۹۔ ۱۸۰۔ ۱۸۱۔ ۱۸۲۔ ۱۸۳۔ ۱۸۴۔ ۱۸۵۔ ۱۸۶۔ ۱۸۷۔ ۱۸۸۔ ۱۸۹۔ ۱۹۰۔ ۱۹۱۔ ۱۹۲۔ ۱۹۳۔ ۱۹۴۔ ۱۹۵۔ ۱۹۶۔ ۱۹۷۔ ۱۹۸۔ ۱۹۹۔ ۲۰۰۔ ۲۰۱۔ ۲۰۲۔ ۲۰۳۔ ۲۰۴۔ ۲۰۵۔ ۲۰۶۔ ۲۰۷۔ ۲۰۸۔ ۲۰۹۔ ۲۱۰۔ ۲۱۱۔ ۲۱۲۔ ۲۱۳۔ ۲۱۴۔ ۲۱۵۔ ۲۱۶۔ ۲۱۷۔ ۲۱۸۔ ۲۱۹۔ ۲۲۰۔ ۲۲۱۔ ۲۲۲۔ ۲۲۳۔ ۲۲۴۔ ۲۲۵۔ ۲۲۶۔ ۲۲۷۔ ۲۲۸۔ ۲۲۹۔ ۲۳۰۔ ۲۳۱۔ ۲۳۲۔ ۲۳۳۔ ۲۳۴۔ ۲۳۵۔ ۲۳۶۔ ۲۳۷۔ ۲۳۸۔ ۲۳۹۔ ۲۴۰۔ ۲۴۱۔ ۲۴۲۔ ۲۴۳۔ ۲۴۴۔ ۲۴۵۔ ۲۴۶۔ ۲۴۷۔ ۲۴۸۔ ۲۴۹۔ ۲۵۰۔ ۲۵۱۔ ۲۵۲۔ ۲۵۳۔ ۲۵۴۔ ۲۵۵۔ ۲۵۶۔ ۲۵۷۔ ۲۵۸۔ ۲۵۹۔ ۲۶۰۔ ۲۶۱۔ ۲۶۲۔ ۲۶۳۔ ۲۶۴۔ ۲۶۵۔ ۲۶۶۔ ۲۶۷۔ ۲۶۸۔ ۲۶۹۔ ۲۷۰۔ ۲۷۱۔ ۲۷۲۔ ۲۷۳۔ ۲۷۴۔ ۲۷۵۔ ۲۷۶۔ ۲۷۷۔ ۲۷۸۔ ۲۷۹۔ ۲۸۰۔ ۲۸۱۔ ۲۸۲۔ ۲۸۳۔ ۲۸۴۔ ۲۸۵۔ ۲۸۶۔ ۲۸۷۔ ۲۸۸۔ ۲۸۹۔ ۲۹۰۔ ۲۹۱۔ ۲۹۲۔ ۲۹۳۔ ۲۹۴۔ ۲۹۵۔ ۲۹۶۔ ۲۹۷۔ ۲۹۸۔ ۲۹۹۔ ۳۰۰۔ ۳۰۱۔ ۳۰۲۔ ۳۰۳۔ ۳۰۴۔ ۳۰۵۔ ۳۰۶۔ ۳۰۷۔ ۳۰۸۔ ۳۰۹۔ ۳۱۰۔ ۳۱۱۔ ۳۱۲۔ ۳۱۳۔ ۳۱۴۔ ۳۱۵۔ ۳۱۶۔ ۳۱۷۔ ۳۱۸۔ ۳۱۹۔ ۳۲۰۔ ۳۲۱۔ ۳۲۲۔ ۳۲۳۔ ۳۲۴۔ ۳۲۵۔ ۳۲۶۔ ۳۲۷۔ ۳۲۸۔ ۳۲۹۔ ۳۳۰۔ ۳۳۱۔ ۳۳۲۔ ۳۳۳۔ ۳۳۴۔ ۳۳۵۔ ۳۳۶۔ ۳۳۷۔ ۳۳۸۔ ۳۳۹۔ ۳۴۰۔ ۳۴۱۔ ۳۴۲۔ ۳۴۳۔ ۳۴۴۔ ۳۴۵۔ ۳۴۶۔ ۳۴۷۔ ۳۴۸۔ ۳۴۹۔ ۳۵۰۔ ۳۵۱۔ ۳۵۲۔ ۳۵۳۔ ۳۵۴۔ ۳۵۵۔ ۳۵۶۔ ۳۵۷۔ ۳۵۸۔ ۳۵۹۔ ۳۶۰۔ ۳۶۱۔ ۳۶۲۔ ۳۶۳۔ ۳۶۴۔ ۳۶۵۔ ۳۶۶۔ ۳۶۷۔ ۳۶۸۔ ۳۶۹۔ ۳۷۰۔ ۳۷۱۔ ۳۷۲۔ ۳۷۳۔ ۳۷۴۔ ۳۷۵۔ ۳۷۶۔ ۳۷۷۔ ۳۷۸۔ ۳۷۹۔ ۳۸۰۔ ۳۸۱۔ ۳۸۲۔ ۳۸۳۔ ۳۸۴۔ ۳۸۵۔ ۳۸۶۔ ۳۸۷۔ ۳۸۸۔ ۳۸۹۔ ۳۹۰۔ ۳۹۱۔ ۳۹۲۔ ۳۹۳۔ ۳۹۴۔ ۳۹۵۔ ۳۹۶۔ ۳۹۷۔ ۳۹۸۔ ۳۹۹۔ ۴۰۰۔ ۴۰۱۔ ۴۰۲۔ ۴۰۳۔ ۴۰۴۔ ۴۰۵۔ ۴۰۶۔ ۴۰۷۔ ۴۰۸۔ ۴۰۹۔ ۴۱۰۔ ۴۱۱۔ ۴۱۲۔ ۴۱۳۔ ۴۱۴۔ ۴۱۵۔ ۴۱۶۔ ۴۱۷۔ ۴۱۸۔ ۴۱۹۔ ۴۲۰۔ ۴۲۱۔ ۴۲۲۔ ۴۲۳۔ ۴۲۴۔ ۴۲۵۔ ۴۲۶۔ ۴۲۷۔ ۴۲۸۔ ۴۲۹۔ ۴۳۰۔ ۴۳۱۔ ۴۳۲۔ ۴۳۳۔ ۴۳۴۔ ۴۳۵۔ ۴۳۶۔ ۴۳۷۔ ۴۳۸۔ ۴۳۹۔ ۴۴۰۔ ۴۴۱۔ ۴۴۲۔ ۴۴۳۔ ۴۴۴۔ ۴۴۵۔ ۴۴۶۔ ۴۴۷۔ ۴۴۸۔ ۴۴۹۔ ۴۵۰۔ ۴۵۱۔ ۴۵۲۔ ۴۵۳۔ ۴۵۴۔ ۴۵۵۔ ۴۵۶۔ ۴۵۷۔ ۴۵۸۔ ۴۵۹۔ ۴۶۰۔ ۴۶۱۔ ۴۶۲۔ ۴۶۳۔ ۴۶۴۔ ۴۶۵۔ ۴۶۶۔ ۴۶۷۔ ۴۶۸۔ ۴۶۹۔ ۴۷۰۔ ۴۷۱۔ ۴۷۲۔ ۴۷۳۔ ۴۷۴۔ ۴۷۵۔ ۴۷۶۔ ۴۷۷۔ ۴۷۸۔ ۴۷۹۔ ۴۸۰۔ ۴۸۱۔ ۴۸۲۔ ۴۸۳۔ ۴۸۴۔ ۴۸۵۔ ۴۸۶۔ ۴۸۷۔ ۴۸۸۔ ۴۸۹۔ ۴۹۰۔ ۴۹۱۔ ۴۹۲۔ ۴۹۳۔ ۴۹۴۔ ۴۹۵۔ ۴۹۶۔ ۴۹۷۔ ۴۹۸۔ ۴۹۹۔ ۵۰۰۔ ۵۰۱۔ ۵۰۲۔ ۵۰۳۔ ۵۰۴۔ ۵۰۵۔ ۵۰۶۔ ۵۰۷۔ ۵۰۸۔ ۵۰۹۔ ۵۱۰۔ ۵۱۱۔ ۵۱۲۔ ۵۱۳۔ ۵۱۴۔ ۵۱۵۔ ۵۱۶۔ ۵۱۷۔ ۵۱۸۔ ۵۱۹۔ ۵۲۰۔ ۵۲۱۔ ۵۲۲۔ ۵۲۳۔ ۵۲۴۔ ۵۲۵۔ ۵۲۶۔ ۵۲۷۔ ۵۲۸۔ ۵۲۹۔ ۵۳۰۔ ۵۳۱۔ ۵۳۲۔ ۵۳۳۔ ۵۳۴۔ ۵۳۵۔ ۵۳۶۔ ۵۳۷۔ ۵۳۸۔ ۵۳۹۔ ۵۴۰۔ ۵۴۱۔ ۵۴۲۔ ۵۴۳۔ ۵۴۴۔ ۵۴۵۔ ۵۴۶۔ ۵۴۷۔ ۵۴۸۔ ۵۴۹۔ ۵۵۰۔ ۵۵۱۔ ۵۵۲۔ ۵۵۳۔ ۵۵۴۔ ۵۵۵۔ ۵۵۶۔ ۵۵۷۔ ۵۵۸۔ ۵۵۹۔ ۵۶۰۔ ۵۶۱۔ ۵۶۲۔ ۵۶۳۔ ۵۶۴۔ ۵۶۵۔ ۵۶۶۔ ۵۶۷۔ ۵۶۸۔ ۵۶۹۔ ۵۷۰۔ ۵۷۱۔ ۵۷۲۔ ۵۷۳۔ ۵۷۴۔ ۵۷۵۔ ۵۷۶۔ ۵۷۷۔ ۵۷۸۔ ۵۷۹۔ ۵۸۰۔ ۵۸۱۔ ۵۸۲۔ ۵۸۳۔ ۵۸۴۔ ۵۸۵۔ ۵۸۶۔ ۵۸۷۔ ۵۸۸۔ ۵۸۹۔ ۵۹۰۔ ۵۹۱۔ ۵۹۲۔ ۵۹۳۔ ۵۹۴۔ ۵۹۵۔ ۵۹۶۔ ۵۹۷۔ ۵۹۸۔ ۵۹۹۔ ۶۰۰۔ ۶۰۱۔ ۶۰۲۔ ۶۰۳۔ ۶۰۴۔ ۶۰۵۔ ۶۰۶۔ ۶۰۷۔ ۶۰۸۔ ۶۰۹۔ ۶۱۰۔ ۶۱۱۔ ۶۱۲۔ ۶۱۳۔ ۶۱۴۔ ۶۱۵۔ ۶۱۶۔ ۶۱۷۔ ۶۱۸۔ ۶۱۹۔ ۶۲۰۔ ۶۲۱۔ ۶۲۲۔ ۶۲۳۔ ۶۲۴۔ ۶۲۵۔ ۶۲۶۔ ۶۲۷۔ ۶۲۸۔ ۶۲۹۔ ۶۳۰۔ ۶۳۱۔ ۶۳۲۔ ۶۳۳۔ ۶۳۴۔ ۶۳۵۔ ۶۳۶۔ ۶۳۷۔ ۶۳۸۔ ۶۳۹۔ ۶۴۰۔ ۶۴۱۔ ۶۴۲۔ ۶۴۳۔ ۶۴۴۔ ۶۴۵۔ ۶۴۶۔ ۶۴۷۔ ۶۴۸۔ ۶۴۹۔ ۶۵۰۔ ۶۵۱۔ ۶۵۲۔ ۶۵۳۔ ۶۵۴۔ ۶۵۵۔ ۶۵۶۔ ۶۵۷۔ ۶۵۸۔ ۶۵۹۔ ۶۶۰۔ ۶۶۱۔ ۶۶۲۔ ۶۶۳۔ ۶۶۴۔ ۶۶۵۔ ۶۶۶۔ ۶۶۷۔ ۶۶۸۔ ۶۶۹۔ ۶۷۰۔ ۶۷۱۔ ۶۷۲۔ ۶۷۳۔ ۶۷۴۔ ۶۷۵۔ ۶۷۶۔ ۶۷۷۔ ۶۷۸۔ ۶۷۹۔ ۶۸۰۔ ۶۸۱۔ ۶۸۲۔ ۶۸۳۔ ۶۸۴۔ ۶۸۵۔ ۶۸۶۔ ۶۸۷۔ ۶۸۸۔ ۶۸۹۔ ۶۹۰۔ ۶۹۱۔ ۶۹۲۔ ۶۹۳۔ ۶۹۴۔ ۶۹۵۔ ۶۹۶۔ ۶۹۷۔ ۶۹۸۔ ۶۹۹۔ ۷۰۰۔ ۷۰۱۔ ۷۰۲۔ ۷۰۳۔ ۷۰۴۔ ۷۰۵۔ ۷۰۶۔ ۷۰۷۔ ۷۰۸۔ ۷۰۹۔ ۷۱۰۔ ۷۱۱۔ ۷۱۲۔ ۷۱۳۔ ۷۱۴۔ ۷۱۵۔ ۷۱۶۔ ۷۱۷۔ ۷۱۸۔ ۷۱۹۔ ۷۲۰۔ ۷۲۱۔ ۷۲۲۔ ۷۲۳۔ ۷۲۴۔ ۷۲۵۔ ۷۲۶۔ ۷۲۷۔ ۷۲۸۔ ۷۲۹۔ ۷۳۰۔ ۷۳۱۔ ۷۳۲۔ ۷۳۳۔ ۷۳۴۔ ۷۳۵۔ ۷۳۶۔ ۷۳۷۔ ۷۳۸۔ ۷۳۹۔ ۷۴۰۔ ۷۴۱۔ ۷۴۲۔ ۷۴۳۔ ۷۴۴۔ ۷۴۵۔ ۷۴۶۔ ۷۴۷۔ ۷۴۸۔ ۷۴۹۔ ۷۵۰۔ ۷۵۱۔ ۷۵۲۔ ۷۵۳۔ ۷۵۴۔ ۷۵۵۔ ۷۵۶۔ ۷۵۷۔ ۷۵۸۔ ۷۵۹۔ ۷۶۰۔ ۷۶۱۔ ۷۶۲۔ ۷۶۳۔ ۷۶۴۔ ۷۶۵۔ ۷۶۶۔ ۷۶۷۔ ۷۶۸۔ ۷۶۹۔ ۷۷۰۔ ۷۷۱۔ ۷۷۲۔ ۷۷۳۔ ۷۷۴۔ ۷۷۵۔ ۷۷۶۔ ۷۷۷۔ ۷۷۸۔ ۷۷۹۔ ۷۸۰۔ ۷۸۱۔ ۷۸۲۔ ۷۸۳۔ ۷۸۴۔ ۷۸۵۔ ۷۸۶۔ ۷۸۷۔ ۷۸۸۔ ۷۸۹۔ ۷۹۰۔ ۷۹۱۔ ۷۹۲۔ ۷۹۳۔ ۷۹۴۔ ۷۹۵۔ ۷۹۶۔ ۷۹۷۔ ۷۹۸۔ ۷۹۹۔ ۸۰۰۔ ۸۰۱۔ ۸۰۲۔ ۸۰۳۔ ۸۰۴۔ ۸۰۵۔ ۸۰۶۔ ۸۰۷۔ ۸۰۸۔ ۸۰۹۔ ۸۱۰۔ ۸۱۱۔ ۸۱۲۔ ۸۱۳۔ ۸۱۴۔ ۸۱۵۔ ۸۱۶۔ ۸۱۷۔ ۸۱۸۔ ۸۱۹۔ ۸۲۰۔ ۸۲۱۔ ۸۲۲۔ ۸۲۳۔ ۸۲۴۔ ۸۲۵۔ ۸۲۶۔ ۸۲۷۔ ۸۲۸۔ ۸۲۹۔ ۸۳۰۔ ۸۳۱۔ ۸۳۲۔ ۸۳۳۔ ۸۳۴۔ ۸۳۵۔ ۸۳۶۔ ۸۳۷۔ ۸۳۸۔ ۸۳۹۔ ۸۴۰۔ ۸۴۱۔ ۸۴۲۔ ۸۴۳۔ ۸۴۴۔ ۸۴۵۔ ۸۴۶۔ ۸۴۷۔ ۸۴۸۔ ۸۴۹۔ ۸۵۰۔ ۸۵۱۔ ۸۵۲۔ ۸۵۳۔ ۸۵۴۔ ۸۵۵۔ ۸۵۶۔ ۸۵۷۔ ۸۵۸۔ ۸۵۹۔ ۸۶۰۔ ۸۶۱۔ ۸۶۲۔ ۸۶۳۔ ۸۶۴۔ ۸۶۵۔ ۸۶۶۔ ۸۶۷۔ ۸۶۸۔ ۸۶۹۔ ۸۷۰۔ ۸۷۱۔ ۸۷۲۔ ۸۷۳۔ ۸۷۴۔ ۸۷۵۔ ۸۷۶۔ ۸۷۷۔ ۸۷۸۔ ۸۷۹۔ ۸۸۰۔ ۸۸۱۔ ۸۸۲۔ ۸۸۳۔ ۸۸۴۔ ۸۸۵۔ ۸۸۶۔ ۸۸۷۔ ۸۸۸۔ ۸۸۹۔ ۸۹۰۔ ۸۹۱۔ ۸۹۲۔ ۸۹۳۔ ۸۹۴۔ ۸۹۵۔ ۸۹۶۔ ۸۹۷۔ ۸۹۸۔ ۸۹۹۔ ۹۰۰۔ ۹۰۱۔ ۹۰۲۔ ۹۰۳۔ ۹۰۴۔ ۹۰۵۔ ۹۰۶۔ ۹۰۷۔ ۹۰۸۔ ۹۰۹۔ ۹۱۰۔ ۹۱۱۔ ۹۱۲۔ ۹۱۳۔ ۹۱۴۔ ۹۱۵۔ ۹۱۶۔ ۹۱۷۔ ۹۱۸۔ ۹۱۹۔ ۹۲۰۔ ۹۲۱۔ ۹۲۲۔ ۹۲۳۔ ۹۲۴۔ ۹۲۵۔ ۹۲۶۔ ۹۲۷۔ ۹۲۸۔ ۹۲۹۔ ۹۳۰۔ ۹۳۱۔ ۹۳۲۔ ۹۳۳۔ ۹۳۴۔ ۹۳۵۔ ۹۳۶۔ ۹۳۷۔ ۹۳۸۔ ۹۳۹۔ ۹۴۰۔ ۹۴۱۔ ۹۴۲۔ ۹۴۳۔ ۹۴۴۔ ۹۴۵۔ ۹۴۶۔ ۹۴۷۔ ۹۴۸۔ ۹۴۹۔ ۹۵۰۔ ۹۵۱۔ ۹۵۲۔ ۹۵۳۔ ۹۵۴۔ ۹۵۵۔ ۹۵۶۔ ۹۵۷۔ ۹۵۸۔ ۹۵۹۔ ۹۶۰۔ ۹۶۱۔ ۹۶۲۔ ۹۶۳۔ ۹۶۴۔ ۹۶۵۔ ۹۶۶۔ ۹۶۷۔ ۹۶۸۔ ۹۶۹۔ ۹۷۰۔ ۹۷۱۔ ۹۷۲۔ ۹۷۳۔ ۹۷۴۔ ۹۷۵۔ ۹۷۶۔ ۹۷۷۔ ۹۷۸۔ ۹۷۹۔ ۹۸۰۔ ۹۸۱۔ ۹۸۲۔ ۹۸۳۔ ۹۸۴۔ ۹۸۵۔ ۹۸۶۔ ۹۸۷۔ ۹۸۸۔ ۹۸۹۔ ۹۹۰۔ ۹۹۱۔ ۹۹۲۔ ۹۹۳۔ ۹۹۴۔ ۹۹۵۔ ۹۹۶۔ ۹۹۷۔ ۹۹۸۔ ۹۹۹۔ ۱۰۰۰۔ ۱۰۰۱۔ ۱۰۰۲۔ ۱۰۰۳۔ ۱۰۰۴۔ ۱۰۰۵۔ ۱۰۰۶۔ ۱۰۰۷۔ ۱۰۰۸۔ ۱۰۰۹۔ ۱۰۱۰۔ ۱۰۱۱۔ ۱۰۱۲۔ ۱۰۱۳۔ ۱۰۱۴۔ ۱۰۱۵۔ ۱۰۱۶۔ ۱۰۱۷۔ ۱۰۱۸۔ ۱۰۱۹۔ ۱۰۲۰۔ ۱۰۲۱۔ ۱۰۲۲۔ ۱۰۲۳۔ ۱۰۲۴۔ ۱۰۲۵۔ ۱۰۲۶۔ ۱۰۲۷۔ ۱۰۲۸۔ ۱۰۲۹۔ ۱۰۳۰۔ ۱۰۳۱۔ ۱۰۳۲۔ ۱۰۳۳۔ ۱۰۳۴۔ ۱۰۳۵۔ ۱۰۳۶۔ ۱۰۳۷۔ ۱۰۳۸۔ ۱۰۳۹۔ ۱۰۴۰۔ ۱۰۴۱۔ ۱۰۴۲۔ ۱۰۴۳۔ ۱۰۴۴۔ ۱۰۴۵۔ ۱۰۴۶۔ ۱۰۴۷۔ ۱۰۴۸۔ ۱۰۴۹۔ ۱۰۵۰۔ ۱۰۵۱۔ ۱۰۵۲۔ ۱۰۵۳۔ ۱۰۵۴۔ ۱۰۵۵۔ ۱۰۵۶۔ ۱۰۵۷۔ ۱۰۵۸۔ ۱۰۵۹۔ ۱۰۶۰۔ ۱۰۶۱۔ ۱۰۶۲۔ ۱۰۶۳۔ ۱۰۶۴۔ ۱۰۶۵۔ ۱۰۶۶۔ ۱۰۶۷۔ ۱۰۶۸۔ ۱۰۶۹۔ ۱۰۷۰۔ ۱۰۷۱۔ ۱۰۷۲۔ ۱۰۷۳۔ ۱۰۷۴۔ ۱۰۷۵۔ ۱۰۷۶۔ ۱۰۷۷۔ ۱۰۷۸۔ ۱۰۷۹۔ ۱۰۸۰۔ ۱۰۸۱۔ ۱۰۸۲۔ ۱۰۸۳۔ ۱۰۸۴۔ ۱۰۸۵۔ ۱۰۸۶۔ ۱۰۸۷۔ ۱۰۸۸۔ ۱۰۸۹۔ ۱۰۹۰۔ ۱۰۹۱۔ ۱۰۹۲۔ ۱۰۹۳۔ ۱۰۹۴۔ ۱۰۹۵۔ ۱۰۹۶۔ ۱۰۹۷۔ ۱۰۹۸۔ ۱۰۹۹۔ ۱۱۰۰۔ ۱۱۰۱۔ ۱۱۰۲۔ ۱۱۰۳۔ ۱۱۰۴۔ ۱۱۰۵۔ ۱۱۰۶۔ ۱۱۰۷۔ ۱۱۰۸۔ ۱۱۰۹۔ ۱۱۱۰۔ ۱۱۱۱۔ ۱۱۱۲۔ ۱۱۱۳۔ ۱۱۱۴۔ ۱۱۱۵۔ ۱۱۱۶۔ ۱۱۱۷۔ ۱۱۱۸۔ ۱۱۱۹۔ ۱۱۲۰۔ ۱۱۲۱۔ ۱۱۲۲۔ ۱۱۲۳۔ ۱۱۲۴۔ ۱۱۲۵۔ ۱۱۲۶۔ ۱۱۲۷۔ ۱۱۲۸۔ ۱۱۲۹۔ ۱۱۳۰۔ ۱۱۳۱۔ ۱۱۳۲۔ ۱۱۳۳۔ ۱۱۳۴۔ ۱۱۳۵۔ ۱۱۳۶۔ ۱۱۳۷۔ ۱۱۳۸۔ ۱۱۳۹۔ ۱۱۴۰۔ ۱۱۴۱۔ ۱۱۴۲۔ ۱۱۴۳۔ ۱۱۴۴۔ ۱۱۴۵۔ ۱۱۴۶۔ ۱۱۴۷۔ ۱۱۴۸۔ ۱۱۴۹۔ ۱۱۵۰۔ ۱۱۵۱۔ ۱۱۵۲۔ ۱۱۵۳۔ ۱۱۵۴۔ ۱۱۵۵۔ ۱۱۵۶۔ ۱۱۵۷۔ ۱۱۵۸۔ ۱۱۵۹۔ ۱۱۶۰۔ ۱۱۶۱۔ ۱۱۶۲۔ ۱۱۶۳۔ ۱۱۶۴۔ ۱۱۶۵۔ ۱۱۶۶۔ ۱۱۶۷۔ ۱۱۶۸۔ ۱۱۶۹۔ ۱۱۷۰۔ ۱۱۷۱۔ ۱۱۷۲۔ ۱۱۷۳۔ ۱۱۷۴۔ ۱۱۷۵۔ ۱۱۷۶۔ ۱۱۷۷۔ ۱۱۷۸۔ ۱۱۷۹۔ ۱۱۸۰۔ ۱۱۸۱۔ ۱۱۸۲۔ ۱۱۸۳۔ ۱۱۸۴۔ ۱۱۸۵۔ ۱۱۸۶۔ ۱۱۸۷۔ ۱۱۸۸۔ ۱۱۸۹۔ ۱۱۹۰۔ ۱۱۹۱۔ ۱۱۹۲۔ ۱۱۹۳۔ ۱۱۹۴۔ ۱۱۹۵۔ ۱۱۹۶۔ ۱۱۹۷۔ ۱۱۹۸۔ ۱۱۹۹۔ ۱۲۰۰۔ ۱۲۰۱۔ ۱۲۰۲۔ ۱۲۰۳۔ ۱۲۰۴۔ ۱۲۰۵۔ ۱۲۰۶۔ ۱۲۰۷۔ ۱۲۰۸۔ ۱۲۰۹۔ ۱۲۱۰۔ ۱۲۱۱۔ ۱۲۱۲۔ ۱۲۱۳۔ ۱۲۱۴۔ ۱۲۱۵۔ ۱۲۱۶۔ ۱۲۱۷۔ ۱۲۱۸۔ ۱۲۱۹۔ ۱۲۲۰۔ ۱۲۲۱۔ ۱۲۲۲۔ ۱۲۲۳۔ ۱۲۲۴۔ ۱۲۲۵۔ ۱۲۲۶۔ ۱۲۲۷۔ ۱۲۲۸۔ ۱۲۲۹۔ ۱۲۳۰۔ ۱۲۳۱۔ ۱۲۳۲۔ ۱۲۳۳۔ ۱۲۳۴۔ ۱۲۳۵۔ ۱۲۳۶۔ ۱۲۳۷۔ ۱۲۳۸۔ ۱۲۳۹۔ ۱۲۴۰۔ ۱۲۴۱۔ ۱۲۴۲۔ ۱۲۴۳۔ ۱۲۴۴۔ ۱۲۴۵۔ ۱۲۴۶۔ ۱۲۴۷۔ ۱۲۴۸۔ ۱۲۴۹۔ ۱۲۵۰۔ ۱۲۵۱۔ ۱۲۵۲۔ ۱۲۵۳۔ ۱۲۵۴۔ ۱۲۵۵۔ ۱۲۵۶۔ ۱۲۵۷۔ ۱۲۵۸۔ ۱۲۵۹۔ ۱۲۶۰۔ ۱۲۶۱۔ ۱۲۶۲۔ ۱۲۶۳۔ ۱۲۶۴۔ ۱۲۶۵۔ ۱۲۶۶۔ ۱۲۶۷۔ ۱۲۶۸۔ ۱۲۶۹۔ ۱۲۷۰۔ ۱۲۷۱۔ ۱۲۷۲۔ ۱۲۷۳۔ ۱۲۷۴۔ ۱۲۷۵۔ ۱۲۷۶۔ ۱۲۷۷۔ ۱۲۷۸۔ ۱۲۷۹۔ ۱۲۸۰۔ ۱۲۸۱۔ ۱۲۸۲۔ ۱۲۸۳۔ ۱۲۸۴۔ ۱۲۸۵۔ ۱۲۸۶۔ ۱۲۸۷۔ ۱۲۸۸۔ ۱۲۸۹۔ ۱۲۹۰۔ ۱۲۹۱۔ ۱۲۹۲۔ ۱۲۹۳۔ ۱۲۹۴۔ ۱۲۹۵۔ ۱۲۹۶۔ ۱۲۹۷۔ ۱۲۹۸۔ ۱۲۹۹۔ ۱۳۰۰۔ ۱۳۰۱۔ ۱۳۰۲۔ ۱۳۰۳۔ ۱۳۰۴۔ ۱۳۰۵۔ ۱۳۰۶۔ ۱۳۰۷۔ ۱۳۰۸۔ ۱۳۰۹۔ ۱۳۱۰۔ ۱۳۱۱۔ ۱۳۱۲۔ ۱۳۱۳۔ ۱۳۱۴۔ ۱۳۱۵۔ ۱۳۱۶۔ ۱۳۱۷۔ ۱۳۱۸۔ ۱۳۱۹۔ ۱۳۲۰۔ ۱۳۲۱۔ ۱۳۲۲۔ ۱۳۲۳۔ ۱۳۲۴۔ ۱۳۲۵۔ ۱۳۲۶۔ ۱۳۲۷۔ ۱۳۲۸۔ ۱۳۲۹۔ ۱۳۳۰۔ ۱۳۳۱۔ ۱۳۳۲۔ ۱۳۳۳۔ ۱۳۳۴۔ ۱۳۳۵۔ ۱۳۳۶۔ ۱۳۳۷۔ ۱۳۳۸۔ ۱۳۳۹۔ ۱۳۴۰۔ ۱۳۴۱۔ ۱۳۴۲۔ ۱۳۴۳۔ ۱۳۴۴۔ ۱۳۴۵۔ ۱۳۴۶۔ ۱۳۴۷۔ ۱۳۴۸۔ ۱۳۴۹۔ ۱۳۵۰۔ ۱۳۵۱۔ ۱۳۵۲۔ ۱۳۵۳۔ ۱۳۵۴۔ ۱۳۵۵۔ ۱۳۵۶۔ ۱۳۵۷۔ ۱۳۵۸۔ ۱۳۵۹۔ ۱۳۶۰۔ ۱۳۶۱۔ ۱۳۶۲۔ ۱۳۶۳۔ ۱۳۶۴۔ ۱۳۶۵۔ ۱۳۶۶۔ ۱۳۶۷۔ ۱۳۶۸۔ ۱۳۶۹۔ ۱۳۷۰۔ ۱۳۷

”بندہ نواز زبان فارسی میں خطوں کا کھنسا پہلے سے متروک ہے چیراں
سری اور ضعف کے صدموں سے محنت چڑھئی اور بھگر کاوی کی قوت
بھگہ میں نہیں رہی۔ حرارت عزیز کی کوڑا دل ہے اور یہ حال ہے کہ۔“
مستعمل ہو گئے قوی غالب
وہ عناصر میں اعتدال کہاں^{۵۰}

کچھ آپ ہی کی شخصیں نہیں۔ سب دوستوں کو جن سے کتابت رہتی
ہے، اردو ہی میں نیا زانا سے لکھا کرتا ہوں۔ جن جن صاحبوں کی
خدمت میں آگے میں نے فارسی زبان میں خطوط لکھے اور بھیجے تھے ان
میں سے جو صاحب اے آلاں موجود ہیں ان سے بھی عند الضرورت
اسی زبان مروج میں مکاتیب مرسلت کا اتفاق ہوا کرتا ہے۔
اردوئے معلیٰ میں مرزا حاتم علی بیگ تہر کو تحریر فرماتے ہیں۔ ”میرا
ایک قطعہ ہے کہ وہ میں نے گلگت میں کہا تھا تقریباً یہ کہ مولوی
کرم حسین ایک میرے دوست تھے۔ انہوں نے ایک مجلس میں چکنی
ڈلی بہت پاکیزہ اور بے ریشہ اپنے کف دست پر رکھ کر مجھ سے کہا کہ
اس کی کچھ تشبیہات لکھ سکتے۔ میں نے وہاں بیٹھے بیٹھے نو دس شعر کا
قطعہ لکھ کر ان کو دیا اور صلہ میں وہ ڈلی ان سے لی۔“

قطعہ

زہب ویتا ہے اسے جس قدر اچھا کیے
ناطق سرنگریاں کہ اسے کیا کیے
خال مقنن زہب وکھل لیتی کیے
ناف آہوے بیابان نقن کا کیے
میکدہ میں اسے نخبہ لکھ صہبا کیے
سر پستان پر یزید سے لکھ کیے
اور اس چکنی نیاری کو نوید کیے

ہے جو صاحب کے کف دست پہ یہ چکنی ڈلی
خام انگشت بدندان کہ اسے کیا لکھیے
اتر سوختہ قمیص سے نسبت دیجے
جبر الاسود و دیوار حرم کیجئے فرض
صومعہ میں اسے نصیر ایے گر نہر نماز
مستی آلودہ سر انگشت حیناں لکھیے
اپنے حضرت کے کعبہ دست کو دل کیجئے فرض

فرض کہ میں ہائیں پہنچیاں ہیں۔ اشعار سب کب یاد آتے ہیں ۵۳۔ بھول گیا ۵۴۔

نواب رحمت محل کو بادشاہ کے مزاج میں بہت دخل تھا۔ مرزا جواہر بخت ان کے بیٹے تھے اور بادشاہ دیکھ بہت مرشد زادوں سے چھوٹے تھے۔ مگر بادشاہ انہی کی ولی عہدی کے لیے کوشش کر رہے تھے۔ جب ان کی شادی کا موقع آیا تو بڑی دھوم کے سامان ہوئے۔ مردانے سہرا اکہہ کر حضور میں گزارتا۔

سہرا ۵۴

خوش ہوا بے بخت کہ ہے آج ترے سر سہرا
کیا ہی اس چاند سے کھڑے پہ بھلا لگتا ہے
سر پہ چڑھنا تجھے پہنچتا ہے پر اے طرف نگاہ
تاؤ بھر کر ہی پردے گئے ہوں گے موتی
سات دریا کے فراہم کیے ہوں گے موتی
زخ پہ دو لہا کے جو گری سے پسینا پکا
یہ بھی ناک بے لوثی تھی کہ قبا سے بڑھ جائے
جی میں تر آئیں نہ موتی کہ ہمیں ہیں اک چیز
جب کہ اپنے میں ساریں نہ خوشی کے مدے
رخ روشن کی دھک گوہر غلطی کی چمک
تد ریشم کا نہیں ہے یہ رگب ابد بہار
باندھ شہزادہ جواہر بخت کے سر پہ سہرا
ہے ترے حسن دل افروز کا زیور سہرا
مجھ کو ڈار ہے کہ نہ چھینے ترا لبہر سہرا
ورنہ کیوں لائے ہیں کشتی میں لگا کر سہرا
تب بٹا ہو گا اس انداز کا گز بھر سہرا
ہے رگب ابد گہر بار سراسر سہرا
رو گیا آن کے دامن کے برابر سہرا
چاہے پھولوں کا بھی ایک مقرر سہرا
کوندھے پھولوں کا بھلا پھر کوئی کیوں کر سہرا
کیوں نہ دکھائے فروغ نہ واختر سہرا
لائے گا تاب گر اندازی گوہر سہرا

ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرف دار نہیں

دیکھیں اس سہرے سے کہ دے کوئی بہتر سہرا



مقطع کو سن کر حضور کو خیال ہوا کہ اس میں ہم پر تشک ہے۔ گویا اس کے معنی یہ ہوئے کہ اس سہرے کے برابر کوئی سہرا کہنے والا نہیں۔ ہم نے جو شیخ ابراہیم ذوقی کو استاد اور ملک اشعر اٹھایا ہے۔ یہ سخن فہمی سے پیدا ہے۔ بلکہ طرف داری ہے۔ چنانچہ اسی دن استاد مرحوم جو حسب معمول حضور میں گئے تو بادشاہ نے وہ سہرا دیا کہ استاد اسے دیکھئے۔ انھوں نے چڑھا

اور بموجب حالات کے عرض کی۔ دوسرے درشت درست۔ بادشاہ نے کہا کہ استاد اتم بھی ایک
سہرا کہہ دو۔ عرض کی بہت خوب۔ پھر فرمایا کہ ابھی لکھ دو اور ذرا منقطع پر بھی نظر رکھنا۔
استاد مرحوم وہاں بیٹھ گئے اور عرض کیا۔

سہرا

اے جواں بخت مہارک تجھے سر پر سہرا
آج وہ دن ہے کہ لائے در اٹھم سے فلک
چاشنِ عسں سے مانند شجاعِ خورشید
وہ کہے صلّ علیٰ یہ کہے سبحان اللہ
تائی اور بنے میں رہے اخلاصِ بیم
دھوم ہے گلشنِ آفاق میں اس سہرے کی
روئے فرخ پہ جو ہیں تیرے برستے انور
ایک کو ایک پہ ترائیں ہے دم آرائش
ایک گہر بھی نہیں صد کان گہر میں پھوڑا
بھرتی خوشبو سے ہے ترائی ہوئی باز بہار
سر پہ لمبہ ہے حریف تو گلے میں بدھی
رو نمائی میں تجھے دے رو خورشیدِ فلک
کثرتِ تہ نظر سے ہے تماشا یوں کے
دور خوش آپ مضامین سے بنا کر لایا

آج ہے یمن و سعادت کا ترے سر سہرا
کشتیِ در میں روئی کی لگا کر سہرا
زخِ بد نور پہ ہے تیرے منور سہرا
دیکھے کھڑے پہ جو تیرے رو داختر سہرا
گوئی ہے سورۃِ اخلاص کو پڑھ کر سہرا
گائیں تر جانِ نواج نہ کیوں کر سہرا
تارِ بادش سے بنا ایک سراسر سہرا
سر پہ دستار ہے دستار کے لوہے سہرا
تیرا بولیا ہے لے لے کے جو گہر سہرا
اللہ اللہ رے پھولوں کا مطر سہرا
سنگتِ ہاتھ میں زینا ہے تو منہ پر سہرا
کھول دے منہ کو جو تو منہ سے اٹھا کر سہرا
دمِ ظاہر ترے روئے کو پر سہرا
واسطے تیرے ترا ذاتی چاکر سہرا

جس کو دھوئی ہے غن کا یہ سنا دے اس کو

دیکھ اس طرح سے کہتے ہیں خنور سہرا

☆☆☆

اربابِ نظام حضور میں ملازم تھیں۔ اسی وقت انھیں ملا۔ شام تک شہر کی گلی گلی کوچہ
کوچہ میں پھیل گیا۔ دوسرے ہی دن اخباروں میں شہر ہو گیا۔ سزا بھی پڑے لو اسٹاس اور
خن فہم تھے۔ جیسے کہ تھا کچھ اور یہ گلہ حضور میں گزارا۔

قطعہ در محذرت

منظور ہے گزارش احوال واقعی
سو بیعت سے ہے پیش آبا سے گری
آزاد رو ہوں اور مرا مسک ہے مسلح کل
کیا کم ہے یہ شرف کہ ظفر کا غلام ہوں
استادہ سے ہو مجھے پر غاش کا خیال
جام جہاں نما ہے شہنشاہ کا ضمیر
میں کون اور ریت ہاں اس سے جدا
سہرا کھسا گیا زور اختلال امر
مقطع میں آہی ہے سخن گسترانہ بات
زورے سخن کسی کی طرف ہو تو رو سیاہ
قسمت بُری سہی پہ طبیعت بری نہیں
ہے شکر کی جگہ کی شکایت نہیں مجھے

صادق ہوں اپنے قول کا غالب خدا کو

کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے ۵۳

نکتہ میں بہت سے اہل ایمان اور بڑے بڑے علماء و فضلا موجود تھے۔ مگر افسوس ہے کہ وہاں مرزا کے کمال کے لیے ایسی عظمت نہ ہوئی جیسی کہ ان کی شان کے لیے شایاں تھی۔ حقیقت میں ان کی عظمت ہونی چاہیے تھی اور ضرور ہوتی مگر ایک اتفاقی بیچ پڑ گیا۔ اس کی داستان یہ ہے کہ مرزا نے کسی جلسہ میں ایک قاری کی غزل پڑھی۔ اس میں ایک لفظ پر بعض اشخاص نے اعتراض کیا اور اعتراض ہو جب اس کا عدہ کے تھاجو مرزا قیقل نے اپنے ایک رسالے میں لکھا ہے۔ مرزا نے سن کر کہا کہ قیقل کون ہو؟ ہے اور مجھے قیقل سے کیا کام؟ ایک فریاد کا کھڑی تھا۔ میں اہل زبان کے سوا کسی کو نہیں سمجھتا۔ وہ لوگ اکثر مرزا قیقل کے شاعر تھے۔ اس لیے انکیا مہمان تواری سے آنکھیں بند کر لیں اور جوش و خروش خاص و عام میں پیدا ہوا۔ مرزا کو تعجب ہوا اور اس خیال سے کہ یہ فتنہ کسی طرح فرو ہو جائے،

سلامت روی کا طریقہ اختیار کر کے ایک مثنوی لکھی اور اس میں کچھ شک نہیں کہ دو مثنوی کی دی ہے۔ مگر کہ کا سدا جبر انہایت خوبی کے ساتھ نظم میں لایا گیا۔ اعتراض کو سند سے دفع کیا۔ اپنی طرف سے انکار مناسب کے ساتھ معذرت کا حق پورا کیا۔ لیکن زیادہ تر افسوس یہ ہے کہ جب مثنوی حریفوں کے جلسہ میں پڑھی گئی تو بجائے اس کے کہ کمال کو تسلیم کرتے یا مہمان سے اپنی زیادتوں کا عذر کرتے۔ ایک نے عموماً کہا کہ اس مثنوی کا نام کیا ہے؟ معلوم ہوا کہ ہار مخالف۔ دوسرے نے گلستاں کا فقرہ پڑھا۔ یکے از صلہا ہار مخالف در حکم جمید اور سب نے ہنس دیا ۵۵۔

علیفہ: دلی میں مشاعرہ تھا۔ مرزا نے اپنی قادی غزل پڑھی۔ مفتی صدر الدین خان صاحب اور مولوی امام بخش صاحب صہبائی جلسہ میں موجود تھے۔ مرزا صاحب نے جس وقت یہ مصرع پڑھا۔ عواذی کے دوران حضور اعصا خفت است۔ مولوی صہبائی کی تحریک سے مفتی صاحب نے فرمایا کہ عصا خفت است میں کلام ہے۔ مرزا نے کہا کہ حضرت! میں ہندی بخود ہوں میرا عصا پکڑ لیا۔ اس شیرازی کا عصا نہ پڑا گیا۔ عواذی کے بعد اول صلاۃ شیخ ٹھہرتے۔ انھوں نے کہا کہ اصل محاورہ میں کلام نہیں کلام اس میں ہے کہ مناسب مقام ہے یا نہیں۔

علیفہ: ایک دفعہ مرزا بہت قرض دلا ہو گئے۔ قرض خواہوں نے نالش کر دی۔ جواب دی میں طلب ہوئے۔ مفتی صاحب کی عدالت تھی۔ جس وقت پیشی میں گئے یہ شعر پڑھا۔

قرض کی پیچھے تھے سے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں

رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن ۵۶

مرزا صاحب کو ایک آفت ناگہانی کے سبب سے چند روز جیل خانہ میں اس طرح رہنا پڑا کہ جیسے حضرت یوسف کو زندان مصر میں۔ کپڑے میلے ہو گئے جو عین پڑ گئی تھیں۔ ایک دن بیٹھے ان میں سے جو عین جن رہے تھے۔ ایک رنکس وہیں عبادت کو پہنچے۔ پوچھا کیا حال ہے آپ نے یہ شعر پڑھا۔

ہم غزوہ جس دن سے گرفتار ہوا ہیں
کپڑوں میں جو عین بخیوں کے ناگوں سے سوا ہیں ۵۷

جس دن وہاں سے نکلے اور لباس تبدیل کرنے کا موقع آیا تو وہاں کا کرتہ وہیں پہن کر
پہننے لگا اور یہ شعر پڑھا۔

ہاے اس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالب
جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہو ۵۸

حسین علی خاں پھوہ لڑکا ایک دن کھیلا کھیلا آیا کہ دادا جان مٹھائی منگا دو۔ آپ نے فرمایا
کہ پیسے نہیں۔ وہ صندوق کھول کر دھڑ دھڑ پیسے نکلنے لگا آپ نے فرمایا۔

دوم و دام اپنے پاس کہاں
چیل کے کھولنے میں ہاں کہاں ۵۹

پٹن سرکار سے ماہ بہ ماہ ملتی تھی۔ بناوت دہلی کے بعد حکم ہوا کہ ششماہی ملا کرے اس
موقع پر ایک دوست کو لکھتے ہیں۔

برسم ہے مردہ کی چہ مایہ ایک
خلق کا ہے اسی چلن پہ مار
مجھ کو دیکھو کہ ہوں بتید حیات
اور چہ مایہ ہو سال میں دوبار ۶۰

مگر یہ دو شعر حقیقت میں ایک قصیدے کے ہیں جس کی بدولت بادشاہ دہلی کے دربار
سے ششماہی تحفہ کے لیے ماہور کا حکم حاصل کیا تھا۔ فارسی کے قصائد میں بھی اس قسم کی
تزلزل و نصب انھوں نے اکثر کیے ہیں اور یہ کچھ عجیب بات نہیں۔ انوری وغیرہ اکثر شعرا نے
ایسا کیا ہے۔

علیفہ: مولوی فضل حق صاحب مرزا کے بڑے دوست تھے۔ ایک دن مرزا ان کی
ملاقات کو گئے۔ ان کی عادت تھی کہ جب کوئی بے تکلف دوست آیا کرتا تو خالق باری کا یہ
مصرع پڑھا کرتے تھے۔ ع یا یاد اور آدے بھائی۔ چنانچہ مرزا صاحب کی تعظیم کو اٹھ
کھڑے ہوئے اور یہی مصرع کہہ کر بٹھایا۔ ابھی بیٹھے ہی تھے کہ مولوی صاحب کی رطبی
دوسرے والان سے اٹھ کر پاس آگئی۔ مرزا صاحب نے فرمایا۔ ہاں صاحب اب دودھ سرا

مصرع بھی فرما دیجئے۔ ع۔ بخشین مادرِ بندہ ری مائی ۶۱

لطیفہ: مرزا کی قاطع برہان کے بہت مخصوص نے جواب کھسے ہیں اور بہت زبان دورازیاں کی ہیں۔ کسی نے کہا کہ حضرت آپ نے فلاں شخص کی کتاب کا جواب نہ لکھا۔ فرمایا بھائی اگر کوئی گدھا تمہارے لات مارے تو تم اس کا کیا جواب دو گے۔

لطیفہ: لیکن چار تھیں۔ آپ عیادت کو گئے۔ پوچھا کیا حال ہے وہ بولیں کہ مرقی ہوں قرض کی فکر ہے کہ گردن پر لیے جاتی ہوں۔ آپ نے کہا کہ ہوا! بھلا یہ کیا فکر ہے! خدا کے ہاں کیا مفتی صدرالذہین بیٹے ہیں جو ڈگری کر کے پڑھ لیا میں گے۔

لطیفہ: ایک دن مرزا کے شاگرد رشید نے آکر کہہ حضرت آج میں امیر خسرو کی قبر پر گیا حراز پر کھرنی کا درشت ہے اس کی کھرنیاں میں نے خوب کھائیں۔ کھرنیوں کا کھانا تھا کہ گویا فصاحت و بلاغت کا دروازہ کھل گیا۔ دیکھیے تو میں کیسا فصیح ہو گیا۔ مرزا نے کہا کہ ارے میاں تین کوس کیوں گئے میرے چھوٹے کے پتھل کی پیپلیاں کیوں نہ کھالیں۔ چودہ طبق روٹن ہو جاتے۔

مرزا صاحب کی شوخی طبع ہمیشہ انھیں اس رنگ میں شور و رکنت تھی، جس سے ناواقف لوگ انھیں الہادی تہمت لگائیں اور چوں کہ یہ رنگ ان کی شکل و شان پر عجیب معلوم ہوتا تھا اس لیے ان کے دوست ایسی باتوں کو سن کر چوٹ کھتے تھے جوں جوں وہ چوٹ کھتے تھے وہ اور بھی پیٹنے اڑاتے تھے۔ ان کی طبیعت سرد و شراب کی عادی تھی۔ لیکن اسے گناہ الٰہی سمجھتے تھے اور یہ بھی عہد تھا کہ حرم میں ہر گز نہ پیتے تھے۔

لطیفہ: غدر کے چند روز بعد چنڈت موتی لال کہ ان دنوں مترجم گورنمنٹ پنجاب کے تھے صاحب چیف کسٹمر پنجاب کے ساتھ دتی گئے اور حب الوطنی اور محبت فن کے سبب سے مرزا صاحب کی ملاقات کی۔ ان دنوں چٹن بند تھی۔ دربار کی اجازت نہ تھی۔ مرزا بہ سبب دل شکستگی کے شکوہ شکایت سے لبریز ہو رہے تھے۔ اثنائے گفتگو میں کہنے لگے کہ عمر بھر میں ایک دن شراب نہ پی ہو تو کافراور ایک دفعہ بھی نماز پڑھی تو مسلمان نہیں پھر میں نہیں جانتا کہ مجھے سرکار نے باقی مسلمانوں میں کس طرح شامل سمجھا۔

لطیفہ: بھوپال سے ایک شخص دتی کی سیر کو آئے۔ مرزا صاحب کے بھی مشتاق ملاقات

تھے۔ چنانچہ ایک دن لٹے کو تشریف لائے۔ وضع سے معلوم ہوتا تھا کہ نہایت پرہیزگار اور پارہ شخص ہیں۔ ان سے بہ کمال اخلاق پیش آئے۔ مگر معمولی وقت تھا۔ بیٹھے سرور کر رہے تھے۔ گلاس اور شراب کا شیشہ آگے رکھا تھا ان بچارہ کو خبر نہ تھی کہ آپ کو یہ شوق بھی ہے انھوں نے کسی شربت کا شیشہ خیال کر کے ہاتھ میں اٹھالیا۔ کوئی شخص پاس سے بولا کہ جناب یہ شراب ہے۔ بھوپالی صاحب نے سمٹ شیشہ ہاتھ سے رکھ دیا اور کہا کہ میں نے شربت کے دھوکے میں اٹھالیا تھا۔ مرزا صاحب نے مسکرا کر ان کی طرف دیکھا اور فرمایا کہ زبے نصیب دھوکے میں نہات ہو گئی۔

لطیفہ: ایک دفعہ رات کو انگنائی میں بیٹھے تھے۔ چاندنی رات تھی۔ تارے چمکے ہوئے تھے۔ آپ آسمان کو دیکھ کر فرمانے لگے کہ جو کام بے صلاح و مشورہ ہوتا ہے بے دھنگا ہوتا ہے۔ خدا نے ستارے آسمان پر کسی سے مشورہ کر کے نہیں بنائے۔ جب ہی نکھرے ہوئے ہیں نہ کوئی سلسلہ نہ ذخیرہ نکل نہ بولے۔

لطیفہ: ایک مولوی صاحب جن کا مذہب سنت و جماعت تھا رمضان کے دنوں میں طاعات کو آئے۔ صبر کی نذر ہو چکی تھی۔ مرزا نے خدمت گار سے پانی مانگا۔ مولوی صاحب نے کہا حضرت غضب کرتے ہیں۔ رمضان میں روزے نہیں رکھتے۔ مرزا نے کہا سنتی مسلمان ہوں۔ چار گھنٹی دن سے روزہ کھول لیا کرتا ہوں۔

لطیفہ: رمضان کا مہینا تھا آپ ثواب حسین مرزا کے ہاں بیٹھے تھے۔ پانچ بج کر کھلیا۔ ایک صاحب فرشتہ سیرت، نہایت متقی و پرہیزگار اس وقت حاضر تھے۔ انھوں نے سبب ہو کر پوچھا کہ قبلہ آپ روزہ نہیں رکھتے۔ مسکرا کر بولے شیطان غالب ہے۔ یہ لطیفہ اہل طرافت میں پہلے سے بھی مشہور ہے کہ عالمگیر کا حراج سرمد سے مکہ رہا تھا اس لیے ہمیشہ اس کا خیال رکھتے تھے۔ چنانچہ قاضی قوی جو اس عہد میں قاضی شہر تھا اس نے ایک موقع پر سرمد کو بھنگ پیتے ہوئے جا پکڑا۔ اول بہت سے لطائف و طرائف کے ساتھ جواب سوال ہوئے۔ آخر جب قاضی نے کہا کہ نہیں اصرار کا حکم اسی طرح ہے، کیوں حکم الہی کے برخلاف باتیں بناتا ہے۔ اس نے کہا کہ کیا کروں بابا شیطان قوی ہے۔

لطیفہ: چلائے کا موسم تھا۔ ایک دن ثواب مصطفیٰ خان صاحب مرزا کے گھر آئے آپ

نے ان کے آگے شراب کا گلاس بھر کر رکھ دیا۔ وہ ان کا منہ دیکھنے لگے۔ آپ نے فرمایا کہ
لجئے۔ چوں کہ وہ نائب ہو چکے تھے، انھوں نے کہا کہ میں نے تو توبہ کی۔ آپ متعجب ہو کر
بولے کہ میں کیا جازے میں بھی۔

لیفٹ: ایک صاحب سے ان کے سنانے کو کہا کہ شراب جتنی سخت گناہ ہے۔ آپ نے
نہیں کر کہا کہ بھلا جو یہ تو کیا ہوتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اونی بات یہ ہے کہ دعائیں قبول
ہوتی۔ مرزا نے کہا کہ آپ جانتے ہیں شراب پیتا کون ہے؟ اول تو وہ کہ ایک بوجھ اولیٰ نام
کی، ہاں سامان سامنے حاضر ہو۔ دوسرے بے فکری، تیسرے صحت ۳۳۔ آپ فرمائیے کہ جسے یہ
سب کچھ حاصل ہوا ہے اور چاہیے کیا جس کے لیے دعا کرے۔

مرزا صاحب کو مرنے سے ۲۰ برس پہلے اپنی تاریخ فوت کا ایک بارہ ہاتھ آیا۔ وہ بہت
بھایا اور اسے سوزوں فرمایا۔

تاریخ فوت

منگہ ہاشم کہ چاروں ہاشم
چوں نظیری نساء و طالب مرد
دوسرہ سندور کوا میں سال
مرد غالب، بگو کہ غالب مرد

اس حساب سے ۱۲۷۷ھ میں مرنا چاہیے تھا۔ اسی سال شہر میں سخت وبا آئی۔ ہزاروں
آدمی مر گئے۔ اندانوں دئی کی برداری کا شرم تازہ تھا۔ چنانچہ میر مہدی صاحب کے جواب میں
آپ فرماتے ہیں۔ وہاں کو کیا پوچھتے ہو؟ قدر انداز قضا کے ترکش میں بھی ایک تیر باقی تھا۔ قتل
ایسا عام۔ لوٹ ایسی سخت۔ کال ایسا بزدل و پاکیزہ نہ ہو، لسان الغیب نے دس برس پہلے فرمایا
ہے ۶۳۔

ہو چکیں غالب بلائیں سب حمام
ایک مرگ نامہائی اور ۶۳ ہے

میاں ۱۲۷۷ھ کی بات غلط نہ تھی۔ مگر میں نے وہاں عام میں مرنا اپنے لائق نہ سمجھا

واقعی اس میں سیری کمر شان تھی۔ بعدِ طبعِ فضا ہوائے کبھ لیا جائے گا۔

استدراک

[آزاد (ولادت ۱۸۳۰ء) نے عبداللہ خان آج کاحال ترجمہ غالب کے حاشیے میں دیا ہے۔ چوں کہ حاشیہ خاصا طویل ہے میں نے قاری کی دلچسپی کے لیے یہاں آخر میں لگا دیا ہے۔ تذکرہ شمیم خٹن لاد گنگوڑ چلوید میں درج ہے کہ لاد نے ۱۲۰ھ / ۱۸۵۳ء میں انتقال کیا۔ گو لاد آج کے انتقال کے وقت آزاد ۲۳-۲۴ سال کے تھے۔]

لود گنگوڑ عبداللہ خان نام۔ ۵۰، ۴۰ برس کے مشاق تھے۔ ایسے بلند مضمون لاد ہر دم ذیل پیدا کرتے تھے کہ قابو میں نہ لاسکتے تھے اور انھیں عموماً الفاظ میں ایسی چستی اور دور سنی سے باندھتے تھے کہ وہ مضمون سامعین نہ سکتا تھا۔ اس لیے کبھی تو مطلب کچھ کا کچھ ہو جاتا تھا اور کبھی کچھ بھی نہ رہتا تھا۔ سنگلاخ اور مشکل زمیوں میں غزل کہتے تھے۔ فکرِ مضامین اور تلاشِ الفاظ میں تن بدن کا ہوش نہ تھا۔ غور کے ساتھ کاوش کرتے تھے اور آپ ہی آپ مزے لیتے تھے ہونٹ چباتے چباتے ایک طرف سے سفید ہو گیا تھا۔ بعض شعر پڑھ کر کہتے تھے کہ آنکھوں سے لہو ٹپک پڑا تھا جب یہ شعر کہا تھا۔ بیٹھے پر کہتے تھے کہ ۶ مہینے تک براہِ پڑھا رہا۔ پڑھتے اس زور و شور سے تھے کہ دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ مشاعروں میں غزل سناتے تھے۔ تو مصنف مجلس سے گزرتا بھر آگے لکل جاتے تھے۔ بعض اشخاص شعر کے اور قلم کے میں اکثر مرشد زادے (شہزادے) شاگرد تھے۔ مگر استاد سب کہتے تھے۔ شعراے باکمال کو جا کر سناتے تھے اور دلواد کی چٹخیں اور تقریباتوں کے فغان و فریاد لے کر چھوڑتے تھے۔ کیوں کہ اسے اپنا حق سمجھتے تھے۔..... میں لان دانوں میں مبتدی شوقین تھا۔ اپنا مشتاق سمجھ کر مجھ سے بہت خوش ہوتے تھے اور کہتے تھے کہ بس تم ہمارے کلام کو سمجھتے ہو۔ رستہ میں مل جاتے تو دس قدم دور سے دیکھ کر کمرے ہو جاتے اور جو نیا شعر کہا ہو اسے وہیں سے اکڑ کر پڑھتے۔ پھر شعر سننے سناتے چلتے۔ قلم کے نیچے میدان میں گھنٹوں چلتے اور شعر پڑھتے رہتے۔ غریب خان پر بھی تشریف لاتے اور پھر پھر سے کم نہ بیٹھتے۔ ایک دن رستہ میں ملے دیکھتے ہی کہنے لگے آج گیا تھا۔ انھیں بھی سنا آیا۔ میں نے کہا کیا؟ کوک کر کہا۔

ذیلہ جز پر بھی تو ہے مطلع و مقطع غالب

غالب آسان نہیں صاحب دیوان ہو

ظاہر کہ یہ واقعہ ۱۸۴۱ء (دیوان غالب طبع اول کا سال اشاعت) اور ۵۳-۱۸۵۳ء

(اوج کا سال وفات) کے درمیان کہی ہوا ہوگا۔ زیادہ امکان یہ ہے کہ ۱۸۵۰ء کے آس پاس

ہوا ہوگا۔ کیوں کہ اس وقت آژولگ ہنگ میں سال کے ہوں گے۔

حواشی

(۱) سیر اور سیریات۔ مطبوعہ ۲۶ جنوری ۱۹۷۲ء۔ ص ۱۵۳

(۲) غالب جب ۳ جولائی ۱۸۵۰ء کو شاہ ظفر کے حضور پیش ہوئے تو بادشاہ نے غم الدولہ،

دعیر الملک نظام جنگ کہہ کر خطاب کیا۔

(۳) پورنام محمد اسد اللہ بیگ خاں قاد۔

(۴) یہ حقیقت میں فحش و کاذب دہلوی کا بیان ہے۔ دیکھیے مکتوب ذکا اللہ بنام آژولہ۔ "شہر"،

فروری ۱۹۶۳ء۔ ص ۱۱

(۵) دیوان قاری میں ۱۵۲۰ اشعار کا ایک قطعہ لکھا ہے۔ بعض اشخاص کا قول ہے کہ ذوق کی

طرف چٹک ہے فرض اس میں کا ایک شعر ہے۔

راست نیگویم من دلدور راحت سر نواں کشید

ہرچہ در گنگار غر است آن نگ من است

(آژولہ)

اس قطعے کے کل ۱۹ اشعار ہیں۔ قطعہ پہلی بار دیوان (کلیات) قاری غالب (پہلا ایڈیشن

مطبوعہ ۱۸۴۵ء) کے ص ۲۵ پر درج ہوا۔ اس کے تین شعر (سیرا، چو تھا اور

چو دھواں) ملاحظہ فرمائیے۔

نہیں نقصان یک دو جز و است در سوا در ریخت
کائن و دم بر کے ز نخلستان فرونگ من است

قاری ثناء تا پہ نئی نقش ہاے رنگ رنگ
بگورا مجموعہ اردو کہ ہے رنگ من است

دیہ در سلطان سراج الدین بہادر شہ کہ او
آں شر ریختہ کہ پنہاں در رنگ من است

شہ ظفر ۲۹ ستمبر ۱۸۸۳ء کو تخت نشین ہوئے تھے گویا یہ قطعہ جو کہا جاتا ہے کہ غالب نے قوتی سے خطاب کر کے کہا ہے، ۲۹ ستمبر ۱۸۸۳ء اور ۱۸۸۵ء (سال طباعت کلیات قاری غالب) کے مابین کسی وقت فکر کیا ہو گا۔ مجموعہ اردو کا ذکر بھی کیا ہے اس لیے ۱۸۸۱ء کے بعد شاید ۱۸۸۲ء کا کہا ہو اور غالب کہتے ہیں کہ یہ کوئی ایسا گھٹانے کا سودا نہیں، اگر میں نے ایک دو جز کا مجموعہ کلام تصنیف کیا ہے۔ کیوں کہ یہ میرے فرہنگ کے نخلستان کا ایک معمولی ہوتا ہے اگر رنگ رنگ کے نقش دیکھنا چاہے ہو تو میرا قاری کلام دیکھو اور میرے روکے پھیکے مجموعہ اردو (دو زبان غالب پبلائینیشن مطبوعہ ۱۸۸۱ء) کو نظر انداز کر دو۔ مگر غالب یہ قاری قطعہ لکھتے ہوئے بھول گئے کہ (نثر شیرانی میں) ۱۸۸۲ء سے ستر ماہ بعد سال پہلے وہ خود لکھ آئے ہیں۔

جو یہ کہے کہ ریختہ کیوں کہ ہو رنگ قاری

گفتہ غالب ایک بار چڑھ کے اے ستارک یوں

اور یہ شعر اس مجموعہ اردو میں انھوں نے یہ قرار رکھا جسے ”بے رنگ“ کہا ہے یعنی دو زبان غالب اردو مطبوعہ ۱۸۸۱ء شعر اس کے منظر پر دیکھا جاسکتا ہے۔

(۶) یہ شعر اور قصہ غلامی کا بیان کر دہ ہے۔ دیکھو مکتوب غلامی بنام آزاد، ”نثر“،

فروری ۱۹۶۳ء، ص ۹۔ اصل شعر جس کا ذکر خود غالب نے اردو کے معنی میں کیا ہے وہ

میر علی احمد شاگرد سودا کا ہے اور اس شعر سے قدرے مختلف ہے۔

اسد اس جفا پر جنوں سے وفا کی
میرے شیر! شاپاشِ رحمتِ خدا کی

(۷) غالب نے ۱۲۳۱ھ میں دو مہریں بنوائیں۔ پہلی پر اسد اللہ خاں عرف سردار نوش
۱۲۳۱ھ کندہ کر لیا اور دوسری پر (جو بعد میں بنوائی گئی) ”اسد اللہ غالب ۱۲۳۱ھ جو
مطابق ہے ۱۶۔ ۱۸۱۵ء کے۔ دوسری مہر حقیقت میں حضرت علی کا لقب ہے اور
عبارت بطور بھیج ہے بعد میں تبدیلِ مخلص کے وقت بھی بھیج کام آیا اور اسد کی جگہ
غالب مخلص قرار پایا۔ ۱۸۱۶ء میں غالب مخلص کا استعمال باقاعدگی سے کرنے لگے۔
لیکن اسد مخلص کو بھی اسی طرح پر ترک نہیں کیا۔

(۸) یہ درست نہیں۔ نواب نظام علی خاں کے منصب داروں کی فہرست میں ان (غالب کے
والد) کا نام نہیں ہے اس لیے یہ بات واضح ہے کہ وہ حیدر آباد میں بہت معمولی حیثیت
سے کار گزار رہے ہوں گے۔ (غالب اور آہنگ غالب۔ اشاعت دوم، ستمبر ۱۹۷۱ء)
یعنی تین سو پچاس سو کی جمعیت کے رسالہ دار نہ ہوں گے۔

(۹) یہ واقعہ ۱۸۰۲ء کا ہے۔ غالب نے اپنے والد کے اور راج کے تحت لڑتے ہوئے مارے
جانے کا ذکر ایک شعر میں اس طرح کیا ہے۔

کافی بود مشاہدہ، شاید ضرور نیست
در خاک راج گزشتہ پدرم را بود حزار

(۱۰) غالب کے چچا نصر اللہ بیگ خاں نے ہاتھ سے گر کر زخمی ہو جانے سے انتقال کیا
(تقریباً اپریل ۱۸۰۶ء)

(۱۱) اصل حال یہ ہے کہ جب سردار نے اپنا دعویٰ کلکتہ میں پیش کیا تو سرکار نے اس کا فیصلہ
سر جان مالکوم صاحب گورنر بمبئی کو سپرد کیا کیوں کہ جب جاگیروں کی سندیں لکھی گئی
تھیں تو وہ لارڈ کلیک صاحب کمانڈر ان چیف ہندوستان کے سکریٹری تھے اور انھیں کے
دستخط سے اسناد جاری ہوئے تھے۔ جب ان کے پاس یہ مقدمہ اور اس کے کاغذات پہنچے
تو انھوں نے لکھا کہ مدعی غلط کہتا ہے۔ نواب احمد بخش خاں ہمارا قدیمی دوست تھا اور بڑا
راست امیر تھا۔ اس پر یہ اتہام ضدستہ کیا گیا ہے ہم نے پانچ ہزار سالانہ لکھا تھا جس

میں سے تین ہزار روپیہ اور اس کے متوطنین کے لیے تھے اور دو ہزار خواجہ جاتی اور اس کے داروئوں کے نام تھے۔ پھر مرزا صاحب نے ولایت میں مراد کیا۔ وہاں بھی کچھ نہ ہوا۔ بموجب تحقیق نواب ضیاء الدین خاں بہادر و ام ظہیم العالی کے تحریر ہوا۔ (حاشیہ از: آژلو)

(۱۲) نواب احمد بخش خاں کا انتقال اکتوبر ۱۸۲۷ء کو ہوا۔ غالب کو یہ خبر سفر کلکتہ کے دوران میں مرشد آباد میں ملی۔

(۱۳) غالب ۱۹ یا ۲۱ فروری ۱۸۲۸ء کو کلکتہ پہنچے۔ اسی روز شملہ بازار (حاصل چیت پور) میں ٹرڈنالاپ کے نزدیک مرزا علی سوداگر کی حویلی میں رہنے کو مکان مل گیا۔ (۱۳) ۲۹ نومبر ۱۸۲۹ء کو واپس ہوئے۔

(۱۵) یہ شعر ۱۸۲۹ء یا اس سے پہلے کا فکر کردہ ہے اور بیدل کے ذیل کے فارسی شعر کا چہ ہے۔

مطمئن از سے پرستی تر دمائی نہ ہانہ بود

یک دو ساغر آب دلاوم گر یہ مستانہ را

(۱۶) ۱۹ جنوری ۱۸۶۰ء کو رام پور کے پہلے سفر پر روانہ ہوئے اور ۲ جنوری کو رام پور پہنچے۔

(۱۷) نواب یوسف علی خاں تاجم دہلی رام پور، ۵ فروری ۱۸۵۷ء کو غالب کے شاگرد ہوئے۔

(۱۸) مئی ۱۸۶۰ء میں دوبارہ انگریزی فٹن کا اجرا ہوا۔

(۱۹) اس تاریخ پر اکثر اصحاب کو توارد ہوا۔ حقیقت میں یہ اس قلعے سے ماخوذ ہے جو خود غالب نے ازراہ فتن ایک دفعہ کہا تھا۔

من کہ باشم کہ جلوداں باشم چوں نظیر تی نہامد و طالب مرد

ور گویندہ در کدایش سال مرد غالب بگو کہ ”غالب مرد“

آگے چل کر خود آژلو نے بھی لطیفہ کے تحت یہ قطعہ درج کیا ہے۔

(۲۰) ہر مزد شم عبدالصمد استاد غالب بعض کی نظر میں کوئی وجود نہیں رکھتے۔ اس پر مرفین

میں لمبی لمبی بحثیں ہو چکی ہیں۔ میرے خیال میں ان کا وجود تھا اور غالب نے اپنے بھپن

میں زبان فارسی کے کچھ نکات ان سے سیکھے ہوں گے اگرچہ شعر غالب سے ان کا کوئی

تعلق نہ رہا ہو گا۔

(۲۱) یہ واقعہ آزاد اور ان کے حقیق میں حالی نے ۱۸۴۲ء کا قرار دیا ہے مگر حقیقت میں ۱۸۳۰ء کا ہے۔

(۲۲) ہر گوپال نقض سکندر آپودی (ولادت ۱۸۰۰ء / ۷۹ء وفات ۲ ستمبر ۱۸۷۹ء)۔
نقض کا دیوان قصائد کبھی نہیں شائع ہوا۔

مرزا صاحب سے بھی عمر میں بڑے معلوم ہوتے تھے۔ فارسی کے عاشق تھے اس لیے باوجود ہندو ہونے کے مرزا نقض کے نام سے بڑے خوش ہوتے تھے۔ دیوان قصائد اور دیوان غزلیات مجموعہ لیا تھا۔ فارسی ہی شعر کہتے تھے۔ (حاشیہ از: آزاد)

(۲۳) ۷ مارچ ۱۲۲۵ھ (۱۹/ اگست ۱۸۸۰ء) کو ۱۳ برس کی عمر میں شادی ہوئی۔ اگر آزاد نے یہ عبارت خط بنام میاں داؤد خاں سہج سے لی ہے تو وہ یوں ہے اور خط ۲۵ اگست ۱۸۶۷ء کو کھینچا تھا۔۔۔۔۔ ”سات بچے پیدا ہوئے، لڑکے بھی، لڑکیاں بھی اور کسی کی عمر چھوڑے بیٹے سے زیادہ نہیں ہوئی۔۔۔۔۔“ شہرت ہے کہ غالب نے اپنی کسی اولاد کے پیدا ہونے یا مر جانے کا ذکر اپنے خط میں نہیں کیا۔ کسی ہم عصر کے یہاں بھی اس کی نشان دہی اب تک نہیں کی چاسکی۔

(۲۴) حارث ولادت ۱۸۷۱ء وفات اپریل ۱۸۵۲ء

(۲۵) ضیاء الدین احمد خاں خیر و خشاں، ولادت اکتوبر ۱۸۴۱ء، وفات ۷ جون ۱۸۸۵ء

(۲۶) شمس الدین احمد خاں، ولادت ۱۸۱۴ء، وفات ۱۳ ستمبر ۱۸۶۹ء

(۲۷) علاء الدین احمد خاں طحطائی، ولادت ۱۲۵ اپریل ۱۸۴۳ء، وفات ۳۱ اکتوبر ۱۸۸۳ء

(۲۸) انٹی بخش خان مرحوم کی بیٹی ثواب احمد بخش خان مرحوم کی حقیقی بیٹی تھیں وہ ان کی بی بی تھیں۔ چوں کہ کوٹھی کا مکان رہنے کو مانگا ہے اس لیے اپنے تین صاحب لار بی بی کو میم صاحبہ اور بچوں کو پاپا لوگ بنایا۔ (حاشیہ از: آزاد)

(۲۹) دیکھو دروے معنی کے خطوط۔ (حاشیہ از: آزاد)

(۳۰) غزوہ مضان سے لے کر یہاں تک فقط خوشی طبع ہے کیوں کہ جو جو باتیں ان فہروں میں ہیں۔ مرزا ان سے کوسوں بھاگتے تھے اور یہ خط غزوہ کے بعد کا ہے اس وقت یہ باتیں

دلی میں خواب و خیال ہو گئی تھیں۔ (حاشیہ از: آرزو)

(۳۱) پیدل۔ ولادت ۳۵-۱۶۳۳ء، وفات ۲۰-۱۷۷۰ء

(۳۲) غالب کا اردو دیوان ان کی زندگی میں پانچ بار چھپا، پہلی بار مطبع سید الاکبر، دلی سے اکتوبر ۱۸۴۱ء میں، اس میں ۱۰۹۶ شعر ہیں، دوسری بار مطبع دارالسلام دلی سے مئی ۱۸۴۷ء میں اس میں ۱۱۵۸ شعر ہیں، تیسری بار مطبع احمدی دلی سے جولائی ۱۸۶۱ء میں اس میں ۱۷۹۶ شعر ہیں، چوتھی بار مطبع نکای کان پور سے جون / جولائی ۱۸۶۲ء میں اس میں ۱۸۰۲ شعر ہیں، پانچویں بار مطبع مفید خلافت آگرہ سے جون / جولائی ۱۸۶۳ء میں اس میں ۷۹۵ شعر ہیں۔

(۳۳) فکر کردہ ۱۸۴۱ء

(۳۴) فکر کردہ ۱۸۴۱ء

(۳۵) فکر کردہ ۱۸۴۱ء

(۳۶) آغا جان صاحب۔ ولادت تقریباً ۸۵-۱۷۷۰ء۔ وفات (۲۶ جون) ۱۷۷۲ء

(۳۷) یہ محفل داستان سرائی ہے۔ اب سب اس بات پر متفق ہیں کہ انتخاب کلام غالب میں سوائے غالب کے کسی اور کا ہاتھ نہیں ہے۔ البتہ اس بات کا اشارہ ملتا ہے کہ سفر کلکتہ سے پہلے ہی کبھی مولوی فضل حق نے غالب کو جھلک اشعار کہنے سے ٹوکا ہو۔

(۳۸) مسودہ ۱۸۶۶ء میں مکمل ہو کر مطبع میں دیا جانے کا تھا مگر کتاب پہلی بار ۲۷ اکتوبر ۱۸۶۸ء کو مطبع بھبھائی میرٹھ سے شائع ہوئی۔

(۳۹) غالب کی وفات کے انیس دن بعد ۶ مارچ ۱۸۶۹ء کو چھپی۔

(۴۰) یہ رسالہ ۲ اکتوبر ۱۸۶۳ء کو چھپا تھا۔

(۴۱) فتح خیز ۱۸۶۷ء میں مطبع اکمل المطابع سے چھپی تھی۔

(۴۲) گنج مرید برہان (مطبوعہ مطبع مظہر المصائب کلکتہ- ۱۲۸۲ھ)

(۴۳) سامع برہان (قاری صفحات ۱۷۳) ۱۲۸۲ھ میں مطبع ہاشمی میرٹھ سے شائع ہوئی تھی۔ چوں کہ یہ غالب کی کتاب قاطع برہان کی مخالفت میں ہے اس لیے اس میں غالب کی طرف سے (چاہے وہ کسی سید عبد اللہ کے نام سے بھی) کوئی تحریر کیوں کر ہو سکتی

۲ ہے۔

(۴۳) کلیات (دیوان) نظم فارسی "سیکڑ آر ز سر انجام" کے نام سے ۱۸۳۵ء میں مرقب

ہو چکا تھا مگر یہ پہلے پہل ۱۸۳۵ء میں مطبع دارالسلام دہلی سے چھپا۔

(۴۵) شیخ آجک۔ پہلی بار ۴ / اگست ۱۸۳۹ء کو مطبع سلطانہ دہلی سے چھپا۔

(۴۶) ۱۶ صفحے کا یہ رسالہ (اگست) ۱۸۶۵ء میں مطبع محمدی (محمد میرزا خاں) دہلی سے چھپا مگر

یہ فارسی نہیں، اردو تصنیف ہے۔ کتابی شکل میں شائع ہونے کے بعد نودہ اشعار کی دو

اشاعتوں ۱۰ / اکتوبر اور ۱ / اکتوبر میں بھی چھپا تھا۔ اب موجودہ نسخہ میں شامل ہے۔

(۴۷) پہلی بار اے ۱۲ (۵۵-۱۸۵۳ء) میں فخر المطالع سے شائع ہوئی۔ کل صفحات ۱۶

(۴۸) پہلا ایڈیشن مطبع مفید خلائق آگرہ سے نومبر ۱۸۵۸ء میں چھپا۔

(۴۹) سید جبین میں غلطو شامل نہیں ہیں اور اس میں قصیدوں بطور قطعوں کے علاوہ ہائیاں،

غزلیں وغیرہ بھی ہیں۔ کتاب اگست ۱۸۶۷ء میں مطبع محمدی دہلی سے شائع ہوئی تھی۔

(۵۰) مضمون کے پیش نظر اسے غالب کی آخری عمر کا شعر سمجھا جاتا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ

یہ شعر ۱۸۴۱ء اور ۱۸۴۶ء کے مابین کہا گیا ہے۔ اس وقت غالب کی عمر ۲۹ سال سے

بھی کم تھی۔

(۵۱) دیکھو قطعہ اردوے معنی میں (حاشیہ از: آزاد) غالب لکھتے ہیں "ہیں ہائیں پچھتیاں

ہیں۔ اشعار سب کب چلا آتے ہیں۔" غالب کا یہ خط مرزا حاتم علی تھر کے نام اور آخر

نومبر ۱۸۵۸ء کا لکھا ہوا تسلیم کیا جاتا ہے اس میں صرف ۷ شعر درج ہیں جب کہ قطعہ

۱۳ اشعار پر مشتمل ہے۔ سمجھتی ہے۔ معنی تھیں بھی رائج ہے جیسے آتش۔

کہاں سے دی کبھی تھیں ہم نے تج سے گاہے

کہی ہیں پچھتیاں اس اردوے خمار پر کیا کیا

اگر حساب لگا کر دیکھا جائے تو غالب نے میں ہائیں پچھتیاں (تھیں) کی بات

درست کہی تھی۔ اس قطعے کے کل ۱۳ اشعار میں ۲۱ پچھتیاں ہیں۔ صرف پہلے

چار مصرعے (دو شعر) اور آخری شعر کا پہلا مصرعہ بندہ پرور کے کلمہ دست کو دل کچے

فرض۔ بیان ہے، باقی ۲۱ مصرعوں میں سے ہر مصرعہ میں تھیں موجود ہے۔

(۵۸) قید خانے کا کرنا چھڑا نہیں جاسکتا، اس پر ان قید خانہ کو لوٹانا چاہتا ہے۔ نیز یہ شعر ۱۸۴۷ء سے کم از کم ۳۶ سال پہلے کہا گیا تھا۔ (فی البدیہہ نہیں) یوں بھی اس شعر کا اطلاق یہاں کیوں کر ہو سکتا ہے؟

(۵۹) حسین علی خاں شاد آں پسر زین العابدین خاں عارف اس وقت سات آٹھ سال کے ہوں گے اس لیے شعر کا سال ۱۸۵۷ء کے لگ بھگ ہو گا۔ (شاد آں ولادت ۱۸۵۰ء وفات ۷ ستمبر ۱۸۸۰ء)

(۶۰) یہ ایک قلمیے کے شعر ہیں جو ۱۸۵۵ء میں تصنیف ہوا تھا۔ کل شعر تیس ہیں۔

(۶۱) کاظمی عبد الوہود سرخوم نے اس لطیفے کو آزاد کے اختراعات سے کہا ہے۔

(۶۲) غالب نے انتخاب غالب میں خود یہ لطیفہ لکھا ہے۔ اگرچہ معلوم وہی ہے تاہم یہ معلوم ہو جائے گا کہ ”..... ایک یوغل اولڈ نام کی باساہاں سامنے حاضر ہو.....“ جیسے الفاظ کا اضافہ آزاد نے کیا ہے۔ یہ لفظ غالب کے نہیں۔

(۶۳) بچے تئیں لسان الغیب قرار دیا۔ (حاشیہ از: آزاد)

(۶۴) یہ غزل دیوان غالب اردو (دوسرا ایڈیشن) مطبوعہ ۱۸۴۷ء میں نہیں۔ ظاہر ہے کہ ۱۸۴۷ء کے بعد کئی گئی تھی۔ اگر غالب کے خط نام میر مہدی بھگت سورتھ ۳۶ جولائی ۱۸۶۱ء میں دیے گئے بیان پر بھروسہ کیا جائے تو دس سال تاریخ خط میں سے منہا کر کے اس غزل کا سال ۱۸۵۱ء متعین کیا جاسکتا ہے۔

توقیتِ غالب

غالب کے دادا میرزا قوکان بیگ خان کی سرحد میں ولادت

۱۷۷۰ء (قیاساً)

غالب کی دادا کی ولادت۔ مقام ولادت نامعلوم
میرزا قوکان بیگ خان۔ غالب کے دادا کی سرحد
سے ہندوستان میں آمد، احمد شاہ ابدالی کے تیسرے
حملے (دسمبر ۱۷۵۱ء تا مارچ ۱۷۵۲ء) کے بعد اور
مبین الملک کی وفات ۳ نومبر ۱۷۵۳ء سے پہلے۔
وسط ۱۷۵۳ء تک لاہور میں رہے۔ عالسیر جانی کے
عہد جو ۲ جون ۱۷۵۳ء سے شروع ہوتا ہے میں دہلی
پہنچے۔ چندے تلاش معاش میں سرگرداں۔ پھر شاہ
عالم کی شہزادی کے عہد میں جو ۱۳ اپریل ۱۷۵۶ء
سے شروع ہوتا ہے، شاہی ملازم ہوئے۔ بعد از منی
۱۷۷۰ء جب شاہ عالم نے دہلی کی طرف کوچ کیا تو
نبف خاں کو بھی الہ آباد سے فوج کا سردار بنا کر اپنے
ساتھ کر لیا۔ یہیں سے عہد نبف خانی شروع ہوتا
ہے اور انھیں دونوں میں قوکان بیگ خان نے نبف
خاں کی ملازمت قبول کی۔ بعد میں مستغنی ہو کر
مہاراجہ جے پور کے ہاں نوکری۔ آگرے میں قیام۔

۱۷۳۶ء

۱۷۵۳-۵۴ء

قبیل کی ولادت شاہجہان آباد میں

۱۷۵۸-۵۹ء

غالب کے دادا میرزا قوکان بیگ خان کی شادی

۱۷۶۳ء (قیاساً)

۱۷۶۵ء (قیاساً)

۱۷۶۷ء تا ۱۷۸۰ء

غالب کے والد عبداللہ بیگ خان کی دہلی میں ولادت
غالب کے چچا نصر اللہ بیگ خان نے دو اور بچے (عام
نام معلوم) اور تین پھر بھائیوں کی ولادت، دائرہ ہے کہ
انہیں بارہ تیرہ سالوں میں ہوئی ہوگی۔

۱۷۸۳ء (۶/اپریل)

۱۷۸۸ء (قبل از ۳۰ جولائی)

۱۷۹۳ء (تقریباً)

۱۷۹۵ء (تقریباً)

۱۷۹۷ء (۲/دسمبر)

ذوالفقار الدولہ نجف خاں کا انتقال ۵۳ سال کی عمر میں
میرزا قوچان بیگ خان کا انتقال
عبداللہ بیگ خان (غالب کے والد) کی شادی
غالب کی بہن چھوٹی خاتون کی ولادت

(محمد) اسد اللہ (بیگ) خان (غالب) کی آگرے میں
ولادت (قوچان بیگ خان کے بڑے بیٹے عبداللہ
بیگ خان کا نکاح آگرے کے ایک امیر فوجی وافر
خواجہ غلام حسین خان کی بیٹی عزت النساء بیگم سے
ہوا۔ عبداللہ بیگ خاں اور عزت النساء بیگم،
محمد اسد اللہ بیگ خان (غالب) کے والدین تھے)

یوسف علی بیگ خان (غالب کے چھوٹے بھائی) کی
ولادت (۱۲۱۳ھ، ۵ جون ۱۷۹۹ء سے شروع ہوتا
ہے۔)

۱۷۹۹ء ابواب

سال ولادت لاڈ بیگم زوجہ مرزا یوسف
(برادر غالب)

۱۸۰۲ء

میرزا عبداللہ بیگ خان (غالب کے والد) کا ریاست
الور کی ملازمت میں انتقال۔

۱۸۰۲ء

کافی بود مشاہدہ، شاہد ضرور نیست
در خاک راج گرہ پدرم را بود حزار
(غالب)

اسد اللہ بیگ خان اور ان کے خاندان کا نصر اللہ بیگ خان (عبداللہ بیگ خان کے برادر خرد) کی سرپرستی میں آیا (نصر اللہ بیگ خان مرہٹوں کی طرف سے آگرے کے قلعہ دار تھے۔ ۱۸۰۳ء میں انھوں نے قلعہ لارڈ لیک کے حوالے کر دیا۔ اس پر وہ انگریزی فوج میں سترہ سو روپے ماہوار مشاہرے پر ۳۰۰ سواروں کے رسالہ دار مقرر ہو گئے۔)

آگرے پر انگریزوں کا قبضہ

۱۸۰۳ء (۱۸ / اکتوبر)

نصر اللہ بیگ خان کا باقی سے مگر جانے سے زخمی ہوا اور انتقال (نواب احمد بخش خان، والی فیروز پور جہڑ کا د لوہارو کی ہمشیرہ نصر اللہ بیگ خان کے عقد نکاح میں تھی۔)

۱۸۰۶ء (۱۴ / اپریل)

احمد بخش خان کی سفارش پر انگریزوں کی طرف سے نصر اللہ بیگ خان کے بیس ماہگان کا وغلیفہ دس ہزار روپیہ (پہلا شق)

۱۸۰۶ء (۴ / مئی)

(اس وغلیفہ میں نصر اللہ بیگ خان کی والدہ، عین بخش، اسد اللہ بیگ خان یعنی غالب اور ان کے چھوٹے بھائی یوسف علی بیگ خان حصہ دار تھے۔)

وغلیفہ کی رقم دس ہزار سے پانچ ہزار سالانہ کر دی گئی۔ (دوسرا شق)

۱۸۰۶ء (۷ / جون)

غالب کا حصہ ساڑھے سات سو روپے سالانہ (اس شق کی رو سے ایک شخص خواجہ حاجی بھی اس وغلیفہ میں دو ہزار سالانہ کا حصہ دار قرار دیا گیا تھا۔)

جلال الدین شاہ، عالم ثانی کا انتقال، مصین الدین اکبر شاہ ثانی کی تخت نشینی

۱۸۰۶ء (۲۸ / نومبر)

غالب کی دہلوی کا انتقال

۱۸۰۶ء ۵ ۱۸۲۵ء

(غالب کے عرضی دعوے سے پتا چلتا ہے کہ ۱۸۰۶ء میں ان کی دہلوی زندگی تھی اور جب ۱۸۲۵ء میں خواجہ حاجی فوت ہوئے تو اس سے پہلے ان کی دہلوی کا انتقال ہو چکا تھا۔ غالب ۱۸۲۵ء سے بہت پہلے۔)

شعر گوئی کا آغاز۔ اسدِ بخش، ارداسیت ہے کہ ایک اور شاعر میر لانی اسدِ بخش تھا چوں کہ لوگ اس کا کلام غالب (اسد) سے منسوب کرنے لگے تھے۔ اس لیے اسدِ بخش ترک کرے (لگ بھگ ۱۸۱۶ء میں) بخش غالب رکھ لیا گیا۔ تاہم کبھی کبھی اسدِ بخش بھی رد اور کھا۔

۱۸۰۷ء (تقریباً)

قلندر بخش جرأت کی لکھنؤ میں وفات (۱۲۲۵ھ، ۶ فروری ۱۸۱۰ء سے شروع ہوتا ہے اور ۲۵ جنوری ۱۸۱۱ء کو ختم ہوتا ہے۔)

۱۸۱۰ء

اسد اللہ بیگ خان کی مولوی محمد معظم کے منتخب (آگرہ) میں تعلیم (بحوالہ عیار الشریعہ: خوب پندرہ کا، گلستان ہے خزاں از قطب الدین باطن۔ ہمد میں حلقہ و غیرہ)

۱۸۱۰ء (تقریباً)

الٹی بخش خان معروف کی چھوٹی بیٹی امر و بیگم سے دہلی میں نکاح ۷ رجب ۱۲۲۵ھ تاریخ نکاح حقیقت میں ۱۷ رجب ۱۲۲۵ھ ہے (الٹی بخش خانہ نواب احمد بخش خان کے چھوٹے بھائی تھے۔ نکاح کے وقت غالب کی عمر تیرہ سال کی تھی اور امر و بیگم کی گیارہ سال کی۔ معروف کا نام مکمل دیوان چھپ چکا ہے۔

۱۸۱۰ء (۱۹/ اگست)

دیوان مطبوعہ کے علاوہ ایک مخطوطہ مکتوبہ ۱۲۴۶ھ
 بھی میرے کتب خانے میں ہے۔
 میر تقی میر کی لکھنؤ میں وفات۔
 غالب کی دہلی میں آمد اور مستقل سکونت۔
 کسی بھی سال میں مرزا ابو صف کی شاہی
 (قلمی دن، تاریخ اور مہینہ - دوشنبہ (سہ شنبہ؟)
 ۲۲ شعبان)

۱۸۱۰ء (۲۰ / جنوری)

۱۸۱۳ء

۱۸۱۳ء - ۱۹ / اگست

۱۸۱۷ء - ۸ / جولائی

۱۸۱۵ء - ۱۶

اسد اللہ خاں عرف مرزا غوث
 ۱۲۳۱ھ

غالب کی پہلی میر (۱۲۳۱ھ)
 غالب کی عمر ۱۸ - ۱۹
 برس کی قلمی یعنی ان کے
 ہمیشہ و خط کا زمانہ تھا۔

اسد اللہ غالب
 ۱۲۳۱ھ

غالب کی دوسری میر (یہ)
 دونوں میریں ایک ہی سال
 میں ہوئی تھیں۔

اس میر کی بنا پر حضرت علی کا لقب ہے اور یہ بطور کج
 ہے۔ اسی سال جد علی شخص کے وقت بھی کج کام آیا
 اور اس کی جگہ غالب شخص قرار پایا۔ (۱۲۳۱ھ،
 ۳ / دسمبر ۱۸۱۵ء سے شروع ہوتا ہے۔)
 غالب شخص کا بابا قاعدہ استعمال۔

۱۸۱۶ء

۱۸۱۶ء (۱۱ جون)

دیوان اور دو خط غالب کی کتابت کی تاریخ (۱۳ / جب
 سہ شنبہ ۱۲۳۱ھ؟)
 انتخاب کی لکھنؤ میں وفات

۱۸۱۷ء (۱۹ مئی)

محمد اسد اللہ خان

۱۲۳۸ھ

۱۸۲۳ء (۳/ مئی)

۱۸۲۳ء-۲۵

نواب احمد بخش خان پر کاٹلے حملہ۔

مصطفیٰ کی لکھنؤ میں وفات (۱۲۴۰ھ / ۲۶۰ / اگست

۱۸۲۴ء سے شروع ہوتا ہے۔)

۱۸۲۵ء

خواجہ حاجی کا انتقال (انتقال شاید ۱۸۲۵ء کے شروع

میں ہوا ہو گا۔ ۲۸ / اپریل ۱۸۲۸ء کی پٹن کی

درخواست میں عالم نے لکھا ہے کہ خواجہ حاجی کا

انتقال تین برس ہوئے جذام کے مرض سے ہوا۔)

۱۸۲۵ء (تقریباً جون)

فیروز پور جہر کا سفر۔ نواب احمد بخش خان کی خدمت

میں بسلسلہ حق پٹن۔ یہ بات جنرل اختر کوٹی کے

انتقال (۱۵ / جولائی ۱۸۲۵ء) سے کچھ پہلے کی ہے۔

نکام واپس ملے۔

۱۸۲۵ء (شاید اکتوبر)

میرزا یوسف علی (بیک) خان کی شدید بیماری و دوا کی

کا آغاز۔

۱۸۲۵ء (۲۸ / نومبر؟)

نواب احمد بخش خان کی معیت میں سرچارلس مکناف

اور ان کے فوجوں کے ساتھ بھرت پور کا سفر (اسے

سفر کلکتہ کا آغاز کہہ سکتے ہیں کیوں کہ اب کے جوہلی

سے لکھنؤ تک ۲۹ / نومبر ۱۸۲۹ء ہی کو سفر کلکتہ ختم

کر کے واپس آئے۔ مقصد سرچارلس مکناف سے

ملنا تھا۔)

۱۸۲۵ء (بعد از ۱۸ / دسمبر)

واپسی پر ایک لمبے عرصے تک فیروز پور جہر کا میں

نواب احمد بخش خان کے ساتھ قیام۔

فیروز پوری میں رکے رہے کیوں کہ احمد بخش خان
اور لور اپنے بیٹے شمس الدین خان وغیرہ کی چاشنی
کے معاملات میں بیشتر فیروز پور سے باہر ہی رہے۔
غالب ایس ہو گئے۔

۱۸۲۶ء (آغاز سال ۵
لوثر خیر)

غالب کی فرخ آباد کے راستے کان پور کو روانگی۔
قرض خواہوں کے ذریعے دہلی نہ گئے اس لیے فیروز
پوری سے کلکتے کے سفر پر نکل کھڑے ہوئے۔

۱۸۲۶ء (اول اکتوبر)

نواب احمد بخش خان کی فیروز پور جہر کا اور لوہاروی
حکومت سے دستبرداری (نواب شمس الدین احمد خان
دہلی ریاست)

۱۸۲۶ء (۱۳/ اکتوبر)

انجی بخش خان معروف (غالب کے خسر) کا انتقال
(انتقال ۱۲۴۲ھ میں ہوا تھا جو ۶ / اگست ۱۸۲۶ء
سے شروع ہوتا ہے۔ گویا ۶ / اگست ۱۸۲۶ء اور
۳۱ / دسمبر ۱۸۲۶ء کے درمیان کسی وقت)

۱۸۲۶ء

فارسی میں شعر گوئی کا باقاعدہ آغاز (اس سے پہلے کا
سرہانہ شعر فارسی کا قابلِ اعتناء اور مقدار میں بہت کم
ہے۔ گل رعنا میں شامل فارسی انتخاب اس پر شاہد
ہے کہ ۱۸۲۸ء (۱۲۴۳ھ) تک ان کے پاس ۲۷
غزلوں سے زیادہ فارسی کلام نہ تھا اور وہ بھی اسی سفر
کلکتے کے دوران کہا گیا تھا۔ غالب کے قدیم ترین
خطی نسخے میں بھی اردو کا تو کمالِ مرقفہ دیوان ہے مگر
فارسی کی صرف ۱۳ ہامیاں ہیں۔)

۱۸۲۶ء

نواب احمد بخش خان کا انتقال۔ غالب کو یہ خبر سفر کلکتے
کے دوران میں مرشد آباد میں ملی۔

۱۸۲۷ء (۲۳/ خیر
۲۲/ اکتوبر)

گلگتہ میں درود۔ اسی روز شملہ ہزار (مصلحہ نیت ہزار) میں گرو جلال کے نزدیک مرزا علی سوداگر کی حویلی میں رہنے کو مکان مل گیا۔ (غالب نے سر شنبہ چہارم شعبان (۱۲۳۳ھ) لکھا ہے۔ سر شنبہ کو ۲ شعبان قرار دیا ۱۹ / فروری کے مطابق ہے۔ ۳ شعبان کو پنج شنبہ قرار دیا مطابق ہے ۲۱ فروری کے۔)

۱۸۲۸ء (۱۹ / فروری یا ۲۱ / فروری)

پنشن کے مقدمے کا آغاز

۱۸۲۸ء (۲۸ / اپریل)

پنشن کی درخواست میں مذکور ہے کہ ”میراعام محمد اسد اللہ خان ہے“ (اس کے سامنے وہ خط بنا، فقہ بھی دیکھے جس میں غالب نے لکھا ہے کہ وہ اب ”محمد کالاطی مہارک اپنے نام کے ساتھ اس لیے نہیں لکھتے کہ لوگوں نے لکھا ترک کر دیا تھا لہذا انھوں نے بھی موقوف کیا۔)

۱۸۲۸ء (۲۸ / اپریل)

غالب نے درخواست میں لکھا کہ آج کل پر میں ہزار روپیہ قرض ہے۔

۱۸۲۸ء (۲۸ / اپریل)

گل رحمت کی ترتیب و تدوین مکمل۔ اردو اور فارسی کلام کا یہ انتخاب انھوں نے اپنے گلگتہ کے ایک دوست مولوی سراج الدین احمد کی فرمائش پر خود اپنے قلم سے کیا تھا۔

۱۸۲۸ء (۱۱ / ستمبر)

گورنر جنرل کے دربار میں شمولیت۔ نواب اکبر علی خاں کے ساتھ دسویں نشست۔

۱۸۲۹ء (۱۶ / فروری)

پھر گورنر جنرل کے دربار میں شمولیت۔ معلوم ہوا کہ گورنر جنرل ہندوستان کے دورے پر نکلیں گے۔ غالب نے بھی واپس دہلی آنے کا ارادہ کر لیا۔

۱۸۲۹ء (یکم اگست)

چاندی کی غیر حاضری کے بعد ولی ولیمس۔ سر نکلتے قسم
 نظیر اکبر آبادی کی وقات
 راجا رام موہن رائے کا سفر انگلستان۔ ایلین
 (Albion) کی کمپنی کے بحری جہاز سے۔
 مقدمہ چٹن خانج

(اس کے بعد وہ اپیل کرتے رہے۔ جس کا سلسلہ
 ۱۸۳۳ء تک رہا۔ لیکن یہ ابتدائی فیصلہ قائم رہا۔)
 شیخہ کی غالب سے پہلے پہل جان بچانے
 دیوانہ احمد اول (اردو) کی جد بخت تھی۔

حس الدین خان کے واروہہ کھار کریم خاں کی اپنا
 میواتی کے ساتھ دہلی میں انگریزوں کے ایجنٹ ولیم
 فریر کے قتل کے لیے دہلی میں آئے، تین مہینے دہلی
 میں رہا مگر ناکام لوٹا۔ پھر دہلی واپس آیا۔

ولیم فریر کا قتل۔ نواب حس الدین احمد خان کے
 واروہہ کھار کریم خاں کی گرفتاری۔

نواب حس الدین احمد خان کی الزام قتل میں گرفتاری
 دیوانہ غالب فارسی، "سیکڑہ آرزو سر انجام" کے نام
 سے مرتب۔ یہ ترتیب ۱۲۵۰ھ (مطابق ۱۰ مئی
 ۱۸۳۳ء/۲۹ اپریل ۱۸۳۵ء) میں مکمل ہوئی۔

کریم خان کو مجرم قتل چٹن کی سزا
 نواب حس الدین احمد خان کو الزام ایجنٹ بخت چٹن
 (اس پر فیروز پور بخت کا علاقہ انگریزوں نے واپس
 لے لیا۔ اس کے بعد غالب کی چٹن، ساڑھے سات
 سو روپے سالانہ، ریاست لوہارو کی جگہ انگریزی
 خزانے سے لیا ہوا ہے۔)

۱۸۲۹ء (۲۹/نومبر)

۱۸۳۰ء (۲۱/اگست)

۱۸۳۰ء (۱۹/نومبر)

۱۸۳۱ء (۲۷/جوری)

۱۸۳۲ء (تقریباً)

۱۸۳۳ء (۱۹/اپریل)

۱۸۳۳ء (۱۸/اکتوبر)

۱۸۳۵ء (۲۲/جولائی)

۱۸۳۵ء (۱۸/اپریل)

۱۸۳۵ء (۲۹/اپریل)

۱۸۳۵ء (۲۱/اگست)

۱۸۳۵ء (۸/اکتوبر)

سر چارلس سٹاف، مائیکلنگ گورنر جنرل

۱۸۳۵ء (۲۰/۲۸ جولائی)

۱۸۳۶ء (۳/۴ مارچ)

۱۸۳۷ء (آخر مئی)

جام جہاں نوا، ٹکلت بایت ۷/ جون ۱۸۳۷ء میں (بہ زبان فارسی) خبر چھپی کہ میرزا اسد اللہ خاں، یوسف خاں کی ملاقات کو چاہے تھے کہ اٹھارے روپے میں عدالت کے چہرہ اسی نے دو سو پچاس روپے کی مالش کی بایت جو میکفرسن صاحب نے کی تھی، انھیں گرفتار کر کے ہائپر کے مکان میں قید کر دیا۔ چنانچہ (نواب) امین الدین خاں نے چار سو روپیہ اصل و سود لیا کر کے رہا کر لیا۔ میکفرسن مشہور شراب فروش انگریز تھے۔

مصین الدین، اکبر شاہ جانی کا انتقال

۱۸۳۷ء (۲۸/ ستمبر)

۶ بجے شام

سراج الدین، بہادر شاہ ظفر کی تخت نشینی

۱۸۳۷ء (۲۹/ ستمبر)

علی الصباح تین بجے

راج دربار سے فارسی زبان خارج کرنے کا حکم

۱۸۳۷ء (۲۰/ نومبر)

تاج کا لکھنؤ میں انتقال

۱۸۳۸ء (۱۵/ اگست)

شاہ نصیر کا حیدر آباد میں انتقال (۲۵ شعبان ۱۲۵۴ھ)

۱۸۳۸ء (۲۳/ نومبر)

سال ولادت ۱۱۷۳ھ / (۶۱-۶۰ء) قمری دیا جاتا ہے۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ کا انتقال

۱۸۳۹ء (۲۷/ جون)

غالب کی والدہ کی علالت اور انتقال

۱۸۳۰ء (۲)

(ایک فارسی تقریر کے پیش نظر وہ ۳۰/ جنوری

۱۸۳۰ء تک زندہ تھیں۔)

وفا کالج میں مدرسہ فارسی کے عہدے کی پچھکش اور

ایضاً

غالب کا شمار۔

”تحکیم احسن اللہ خاں کو خلعت چھ پارچہ کا، تین رقم
جواہر مع خطاب عہدہ انجمن مستند الملک حلقہ الزماں
تحکیم احسن اللہ خاں بہادر ثابت جنگ مرحمت ہوا۔
تحکیم نے گور بھائے تحکیم شرف الدین کے..... سر فرار
ہوئے۔“ (دہلی اردو اخبار ۲۳ / فروری ۱۸۳۰ء)

۱۸۳۰ء فروری

غالب کی، گمر پے بواخانہ کے قیام میں گرفتاری
(عدالت نے سو روپیہ جرمانہ کیا، عدم ادائیگی جرمانہ کی
صورت میں چار مہینہ قید۔ جرمانہ ادا کر دیا گیا۔)
دعوان اردو کا پہلا ایڈیشن (مطبع سید الاغبار، دہلی۔
اگرچہ دہلی ان ۱۸۳۳ء میں مرتب ہو چکا تھا۔)
پہمید لارڈ الٹن براؤن رجزل، خلعت ہفت پارچہ اور
سر رقم جواہر کا غالب کو اعزاز۔

۱۸۳۱ء (قبل از ۱۵ / اگست)

۱۸۳۱ء (اکتوبر)

۱۸۳۲ء ۱۸۳۳ء

۱۸۳۳ء

۱۸۳۵ء

۱۸۳۷ء

میر نظام الدین صنون نگار دہلی میں انتقال۔
دعوان (کلیات نظم) قدسی کا پہلا ایڈیشن (مطبع
دارالسلام دہلی) کو دہلی ان ۱۸۳۵ء میں مرتب ہو چکا تھا۔
زمین العابدین خان عارف کے بڑے بیٹے، باقر علی
خان کا سال ولادت۔
آتش کا لکھنؤ میں انتقال۔

۱۸۳۷ء (۱۳ / جنوری)

۱۸۳۷ء (مئی)

دعوان اردو کے دوسرے ایڈیشن کی اشاعت (مطبع
دارالسلام دہلی)

۱۸۳۷ء (۲۵ / مئی)

گمر پے جو امانت قائم کرنے کے الزام میں غالب کی
دوبارہ گرفتاری (قبیلے میں چھ ماہ قید با مشقت اور
دو سو روپیہ جرمانے کی سزا ہوئی۔ مشقت غالب پچاس
روپے ادا کر کے معاف ہو گئی۔ وہ صرف تین مہینے قید
میں رہے، اس کے بعد رہائی ہو گئی۔)

غالب کا پہلا اردو خط (ہمام نئی بختی تحریک ایک خط
ہمام نقیہ کو غالب کا پہلا اردو خط تسلیم کیا جا رہا ہے۔
اس خط پر تاریخ درج نہیں مگر قیاس ہے کہ خط
۱۸۴۳ء کا لکھا ہوا ہے۔)

۱۸۴۸ء (۹/مارچ)

شیخ آجک (فارسی) کا پہلا ایڈیشن (مطبع سلطانی،
لال قلعہ، دہلی)

۱۸۴۹ء (۱۳/اگست)

زمین آغا بدین خان عارف کے چھوٹے بیٹے،
حسین علی خان کا سالِ ولادت۔

۱۸۵۰ء

تیموری خاندان کی تاریخ (مہرِ نیم روز) لکھنے پر مقرر،
چھ پارچے اور تین رقم جواہر کا، خلعت اور خطاب
نعم الدولہ، دیر الملک، نظام جنگ عطا ہوا (تاریخ
نوبی کی تھوڑی چھ سو روپیہ سالانہ مقرر ہوئی۔)

۱۸۵۰ء (۴/جولائی)

حافظ عبدالرحمن خان (حافظ جیو) احسان دہلوی کا دہلی
میں انتقال۔ (۱۲۶۷ھ، ۶/نومبر ۱۸۵۰ء سے شروع
ہوتا ہے۔)

۱۸۵۰ء-۵۱

غالب کی چوتھی مہر

۱۸۵۰ء-۵۱

غالب کو یہ خطاب
بہادر شاہ ظفر نے
۴/جولائی ۱۸۵۰ء کو
دی۔ جو ۲۳ شعبان
۱۲۶۷ھ کے مطابق ہے۔

بہادر شاہ ظفر نے
بہادر نظام جنگ
۱۲۶۷ھ

مہر ۱۲۶۷ھ میں بنوائی گئی۔ جو ۶/نومبر ۱۸۵۰ء سے
شروع ہوتا ہے۔

۱۸۵۲ء (اپریل)

زمین العابدین خان عارف (امروٹو بیگم کے بھائی) کی وفات۔ (عارف اور پھر عارف کی والدہ بیادوی بیگم کی وفات کے بعد عارف کے دونوں لڑکوں کو امروٹو بیگم نے پالا) قبر مرزا غالب کے قریب کونے میں ہے۔
 مومن کاوٹی میں انتقال۔

۱۸۵۲ء (۱۳ / مئی)

۱۸۵۲ء (اگست ؟)

مثنوی شانِ نبوت و ولایت کی اشاعت۔
 (مولوی محمد سالم کی تتر کا یہ منظوم ترجمہ بہادر شاہ ظفر کے حکم (جو ۹ شوال ۱۲۶۸ء مطابق ۲۷ جولائی ۱۸۵۲ء کو دیا گیا تھا) سے مطبع سلطانی سے چھپی تھی۔ اس کے کل صفحے ۱۱ ہیں۔ پہلے اس میں ۱۰۱ شعر تھے جب اسے کلیات غالب (فارسی) کا نام ۱۸۶۳ء میں شامل کیا گیا تو اس کے آخری تین شعر نکال کر ۳۰ مزید شعروں کا اضافہ کر دیا گیا۔ اس طرح اب اس کے ۱۲۸ شعر ہیں۔)

۱۸۵۲-۵۳ء

یا سدا اللہ الخالب

۱۲۶۹ھ

غالب کی پانچویں نمبر غالب حضرت علیؑ کو مشکل کشا مانتے تھے شاید یہ نمبر ان کے ستیم حالات کی نشان دہی کرتی ہے۔

(۱۲۶۹ھ / ۱۵۰ / اکتوبر ۱۸۵۴ء سے شروع ہوتا ہے۔)

بیچ آجنگہ کا دوسرا ایڈیشن (مطبع دارالسلام بدلی)

غالب کی بی بی اور آخری بیوی کا انتقال

۱۸۵۳ء (اپریل)

۱۸۵۳ء (۲۰ / ستمبر)

(اس پھر بھی کی وفات کے ساتھ، توکان بیگ خان کی منگیا اولاد (بیٹے بیٹیوں) کا خاتمہ ہو گیا۔)
 حالی پہلی مرتبہ دہلی آئے۔ یہ عمر ۱۸۵۳ء میں دہلی پہنچا ہے۔
 سال بھر حصار میں ملازمت کی۔

۱۸۵۳ء

غلام حسین خاں مسرور (زمین العابدین خان عارف) کے والد اور غالب کے ہم زلف کا انتقال۔
 شیخ محمد امیر الہم ذوق (استاد عفر) کا انتقال۔
 بعد از انتقال ذوق، غالب استاد عفر مقرر ہوئے۔

۱۸۵۳ء (اکتوبر)

۱۸۵۳ء (۱۵/ نومبر)

مہر نیم روز کی شاعرت و اشاعت (عزرا الطالع، دہلی) ۱۸۵۳ء، ۲۲/ ستمبر ۱۸۵۳ء سے شروع ہوتا ہے۔
 (یہ اسی سال میں کم از کم تین بار نکلی۔ یہ سب ایڈیشن جو پہلا ایڈیشن ہی کہلاتے ہیں۔ میرے کتب خانے میں موجود ہیں۔)

۱۸۵۳-۵۵ء

نیاوی بیگم (امیر الہم کی بیوی بہن اور والدہ عارف) کا انتقال

۱۸۵۵ء (۱۳/ جون)

قادر نامہ کی اشاعت اول (مطبع سلطانی، لال قلعہ، دہلی) ۱۸۵۶ء۔

۱۸۵۶ء

۱۸۵۶ء (۱۳/ ستمبر تا ۳/ دسمبر)

(یہ نظم غالب نے عارف کے دونوں بچوں کو قاری اور اردو پڑھانے کے لیے کہی تھی۔)

الحاق اودھ (۱۸۵۶ء کو راجہ علی شاہ لکھنؤ سے نکلتے چلے گئے۔)

۱۸۵۶ء (۷/ فروری)

غلام قزالدین عرف مرزا خرد (دہلی عہد بہادر شاہ عفر) کا انتقال

۱۸۵۶ء (۱۰/ جولائی)

۱۸۵۷ء (۲۸ / جنوری)

عالم نے سولہ افضل حق خیر آبادی کی تحریک پر
دلی راجہ پر نواب محمد یوسف علی خاں کی خدمت میں
تصدیق بھیجی۔

۱۸۵۷ء (۵ / فروری)

عالم کا تقرر بطور استو نواب محمد یوسف علی خاں، عالم
دلی راجہ پر

۱۸۵۷ء (مارچ / اپریل)

عالم کے رازدارانہ خطوط بنام دلی راجہ پر
(قوی گمان ہے کہ یہ سیاسی امور پر مشتمل تھے۔ اس
لیے عالم کی ہدایت پر یہ خطوط خارج کر دیے گئے۔)

۱۸۵۷ء (۱۰ / مئی)

سہ افسانہ سوسٹان کے ہنگامے (نادر) کا میرٹھ میں
آغاز

۱۸۵۷ء (۱۱ / مئی)

دلی فوج (مٹکوں) کا دلی میں داخلہ: انگریزی تسلط کا
خاتمہ، دلی اقتدار کا قیام، عالم کی قلعہ کی تحفظ اور
انگریزی چٹن بنی۔

۱۸۵۷ء (۲۰ / ستمبر)

انگریزوں کی فتح اور دلی پر دوبارہ قبضہ
نادر کے بعد دلی پر دوبارہ انگریزی قبضے کے دوران
لام بخش سپہاکی انگریز کو گولی کا نشانہ ہوئے۔

۱۸۵۷ء (ستمبر)

۱۸۵۷ء (۱۸-۱۹ / اکتوبر)

میرزا محمد یوسف علی (بیک) خان (برادر عالم) کی
وفات (دہلی انگریز کی گولی کا نشانہ بنے، اگرچہ عالم نے
مصلحت لکھا ہے کہ وفات بخار سے ہوئی۔)

۱۸۵۸ء (نومبر)

دہلی کی اشاعت ختم (مطبعہ مفید طاقت، آگرہ)

۱۸۵۹ء

سکے کا اکرام۔ خط بنام حسین مرزا۔ نوشتہ ۱۸ / جون
۱۸۵۹ء۔ (گوری شکر منجر نے سکے کی رپورت
منسوب ہے۔ عالم ۱۹ / جولائی ۱۸۵۷ء ہی کو انگریزوں
کو ہتھیاری تھی۔)

۱۸۵۹ء (۱۰/ جولائی)

دہلی رام پور سے مستقل وظیفے کی درخواست اور اسی
مہینے سے سو روپے ماہوار بطور وظیفہ مقرر۔

۱۸۶۰ء (جنوری)

گورنر جنرل نکم جنوری ۱۸۶۰ء کو دہلی آئے تھے۔ کچھ
دنوں بعد ہی غالب آنا سے ملنے ان کی قیام گاہ پر گئے
ہوں گے۔ جواب ملا کہ "فرصت نہیں" اور کہ تم
"ہانگیوں سے اغلاص رکھتے تھے۔" (یہ سلوک سکے
کے الزام کی وجہ سے تھا) درحقیقت یہ سکے حافظ
ویران شاگرد ذوق کا کہا ہوا تھا جو صادق الاخبار کے
۱۳ بیحدہ ۱۲۷۳ھ (مطابق ۶/ جولائی ۱۸۵۷ء) کے
شمارے میں شائع ہوا تھا۔ گوری شکر مخبر کو ویران کی
جگہ غالب کا نام یاد رہ گیا۔

۱۸۶۰ء (۱۹/ جنوری)

رام پور کا پہلا سطر (۷۷/ جنوری کو رام پور پہنچے۔)

۱۸۶۰ء (۲۳/ مارچ)

رام پور سے واپسی (۷۷/ مارچ کو رام پور سے روانہ
ہوئے تھے۔)

۱۸۶۰ء (مئی)

انگریزی پنشن کا دوبارہ اجراء۔

(تین برس کا بھٹیلا ساڑھے سات سو سالانہ کے حساب
سے ۲۲۵۰ روپے وصول ہوا۔)

۱۸۶۱ء (۲۹/ جولائی)

دیوان اردو کا تیسرا ایڈیشن (مطبع احمدی دہلی)

۱۸۶۱ء (۱۹/ اگست)

مولانا فضل حق خیر آبادی کا جزیرہ انڈیمان میں
انتقال۔

۶۲ - ۱۸۶۱ء

غالب کی چھٹی نمبر
یہاں سے غالب کی
زندگی کا انتہائی شہرت
کا زمانہ شروع ہوتا ہے۔

غالب

۱۲۷۸ھ

یہ مختصر علم ان کی آنا کا نقطہ شروع ہے۔ سات سال بعد ان کا انتقال ہوا۔ یہ ان کی آخری نمبر تھی گویا ان کی آنا کا مظاہرہ ان کے انتقال تک پوری آب و تاب کے ساتھ جاری رہا (۱۸۷۲ء، ۱۰ جولائی ۱۸۶۱ء سے شروع ہوتا ہے۔)

۱۸۶۲ء

قاطع برہان کی طبع الاول (مطبع نول کشور، لکھنؤ)

۱۸۶۲ء (۲/مذبح)

انگریزی درباروں میں کرسی نشینی اور خلعت کے اعزاز کا روپارہا جرا۔

۱۸۶۲ء (جون)

دیوان اردو کا چوتھا ایڈیشن (مطبع نکھای، کانپور)

۱۸۶۲ء (یکم اکتوبر)

لاڈو بیگم بیہ مرزا یوسف کی حکومت سے درخواست گزارے کے لیے۔

۱۸۶۲ء (بعد از جون)

دیوان اردو کی چاندی اور آخری اشاعت (مطبع منیفہ خلافت، آگرہ)

۱۸۶۳ء (مئی/جون)

دیوان فارسی (کلیات نظم فارسی) کا دوسرا ایڈیشن (مطبع نول کشور، لکھنؤ)

۱۸۶۳ء (جولائی)

یکم اکتوبر ۱۸۶۲ء سے ۲۰ روپے مہینہ خیراتی پنشن بنام لاڈو بیگم زوجہ مرزا یوسف مرحوم جاری

۱۸۶۳ء

مشہور ماہر گہرہ باری کی اشاعت (اکمل المطالعہ دہلی)

(یہ مشہور کلیات نظم میں شامل تھی، لیکن اب الگ سے شائع ہوئی۔)

۱۸۶۳ء

قاطع برہان کے جواب میں محرق قاطع برہان مصنف سید سعادت علی کی اشاعت (مطبع احمدی دہلی)

۱۸۶۳ء

قادر نامہ کی دوسری اشاعت (مجلس پریس دہلی)

۱۸۶۳ء

سر جان مارش گورنر جنرل

- ۱۸۶۴ء لطائف فیضی (اگرچہ نام میاں داود خان سیاح کا ہے مگر اس کے اصل مصنف غالب ہی ہیں۔)
- ۱۸۶۳ء انتخاب غالب کی ترتیب (مزید کراٹک ۱۸۶۶ء کے تحت دیکھیے)
- ۱۸۶۳ء سوالات عبد الکریم از عبد الکریم کی اشاعت۔ اکمل المطالع، دہلی۔ (دوسرے کے نام سے شائع ہوئی لیکن یہ بھی غالب کی اپنی تصنیف ہے۔)
- ۱۸۶۵ء واضح ہدیان مصنفہ سید محمد نجف علی جمجری کی اشاعت۔
- ۱۸۶۵ء ساطع برہان از مرزا رحیم بیک رحیم میر علی کی اشاعت۔
- ۱۸۶۵ء غالب نے حکومت سے تین مطالبے کیے کہ انھیں شاعر و راہ مقرر کیا جائے، پہلے سے اونٹنی جکے لے اور دھنوب حکومت اپنے خرچ پر شائع کرے۔ حکم ہوا کہ تحقیقات کی جائے کہ غدر میں غالب کا رول کیا تھا۔ رپورٹ ہوئی کہ ان سے سکتہ منسوب ہے۔ سب درخواستیں رد ہو گئیں۔ غالب پر سکتہ کا الزام ان کی زندگی میں غلط ثابت نہ ہو سکا۔
- ۱۸۶۵ء (۲۱/ اپریل) نواب محمد علی خان دہلی رام پور کا انتقال، نواب کلب علی خان کی جانشینی۔
- ۱۸۶۵ء (اگست) غالب کے رسالے نامہ غالب بجواب ساطع برہان کی اشاعت (مطبع محمدی، دہلی)
- ۱۸۶۵ء (۷/ اکتوبر) مرزا غالب کا رام پور کا دوسرا سفر۔ ۱۳/ اکتوبر کو رام پور پہنچے۔

۱۸۶۵ء

درختیو کا دوسرا ایڈیشن (مطبع لٹری سوسائٹی روہیلہ،
کنڈرہ پریس)

۱۸۶۵ء (دسمبر)

قانع برہان کی طبع ثانی بعنوان در لغت کا دیوانی کی
اشاعت۔ (اکمل المطابع، دہلی)

۱۸۶۵ء (دسمبر)

رام پور کے دوسرے سفر سے واپسی۔ (۲۸ / دسمبر کو
رام پور سے روانہ ہوئے اور ۸ / جنوری ۱۸۶۶ء کو دہلی
پہنچے)

۱۸۶۶ء

قانع برہان کے جواب میں مولیٰ برہان مصنفہ مولوی
احمد علی احمد جہانگیر ٹھکری کی اشاعت (مطبع مظہر
العیان، کلکتہ)

۱۸۶۶ء

قانع برہان کے جواب میں قانع القانع مصنفہ
امین الدین امین دہلوی کی اشاعت (مطبع مصطفائی،
دہلی)

۱۸۶۶ء

انتخاب غالب کی اشاعت (پہلے حصے میں دو دیباچے،
۱۳ خط، ۲ نقلیں اور ایک لطیفہ ہے۔ دوسرے حصے
میں اردو کے ۳۱ منتخب شعر ہیں۔ مولوی ضیاء الدین
خاں نے اس کے خطوط معمولی رد و بدل کے بعد اپنی
مرتبہ اشعار اردو (حصہ دوم) میں شامل کر کے
۱۸۶۶ء میں انھیں مطبع فیض احمدی سے شائع کر دیا
تھا۔ انھیں معلوم کہ یہ کمال انتخاب غالب کی زندگی
میں بھی شائع ہوا تھا کہ نہیں۔ یہ انتخاب پہلے بھی
تین بار ناقص چھپ چکا ہے۔ میں نے اسے اب
(۱۹۹۲ء) میں اصل خطوط کے عکس اور مہسوس
دیباچے کے ساتھ انتخاب رقعات و اشعار غالب کے
نام سے شائع کیا ہے۔ ۱۹۹۵ء میں اسے مزید ترمیم
و ترمیم کے بعد رشید حسن خاں صاحب نے بھی اسے
انتشارے غالب کے نام طبع کر دیا ہے۔)

دعائے مبارک۔ فارسی منظوم ترجمہ (مطبع نول کشور،
لکھنؤ)

۱۸۶۷ء (۲)

(اس کا آج تک ایک ہی مطبوعہ نسخہ دریافت ہوا ہے
جو میرے کتب خانے میں ہے۔ اس کا ایک ہو بہو
ایڈیشن میں نے ۱۹۷۷ء میں اپنے مبسوط مقدمے
کے ساتھ شائع کیا تھا۔)

مطبع حیر کی اشاعت (اکمل المطالع، دہلی)

۱۸۶۷ء

(غالب نے یہ مختصر رسالہ مویہ برہان کے جواب
میں لکھا تھا۔)

نکات غالب و رقعات غالب کی اشاعت مطبع سراجی،
دہلی (پنجاب کے محکمہ تعلیم کے ڈائریکٹر میجر لکرنے
رائے بہادر ماسٹر پیارے لال کو حکم دیا کہ غالب سے
فارسی قواعد سے متعلق کتاب لکھوائی جائے۔ ماسٹر
صاحب موصوف کے کہنے پر میرزا نے یہ دو مختصر
رسالے قلم بند کیے)

۱۸۶۷ء (فروری)

ہنگامہ دل آشوب راہ کی اشاعت۔ مطبع فشی سنت
پرشاد، آراء (قانع برہان کے مناقشے کے سلسلے کے
منکومات)

۱۸۶۷ء (۱۱/ اپریل)

سید یحییٰ کی اشاعت (مطبع محمدی، دہلی)
ہنگامہ دل آشوب (۲) کی اشاعت۔ مطبع فشی سنت
پرشاد، آراء۔

۱۸۶۷ء (اگست)

۱۸۶۷ء (۲۵/ ستمبر)

(مولوی امین الدین دہلوی معصف قانع القاطع کے
خلاف مقدمہ کزالہ حیثیت مرتبی۔)

۱۸۶۷ء (۲/ دسمبر)

کلیات نثر فارسی (غالب) کی اشاعت (مطبع
نول کشور، لکھنؤ)

۱۸۶۸ء (جنوری)

(اس میں فارسی نثر کی تین کتابیں، پنج آہنگ،
مہر نیم روز و خنود شامل ہیں)

مولوی امین الدین دہلوی کے مقدمے سے دست
برداری، راضی نامہ۔

مفتی محمد صدر الدین آزاد دہلوی میں انتقال۔

عود بندی مجموعہ "مکاتیب غالب کی پہلی اشاعت
(مطبع تہجائی، میرٹھ)

غالب کی وفات (بہشتی نظام الدین، خاندان لوہاروی
ہڑواڑ میں تدفین۔ اگرچہ بہت دنوں سے مختلف
امراض کا شکار تھے، لیکن سوت سے چند دن پہلے غشی
کے دوسے پڑنے لگے تھے۔ ۱۳/ فروری دوپہر کو بے
ہوش ہو گئے۔ تشخیص ہوئی کہ دماغ پر قابغ کرا ہے۔
اسی حالت میں اگلے دن دوپہر ڈھلے انتقال کیا۔
آخری وعینہ بابٹ جنوری ۱۸۶۹ء منجانب نواب رام
پور، غالب کی وفات سے صرف ایک مہینہ پہلے
موصول ہوا تھا۔)

اردوئے مفتی (مجموعہ مکاتیب اردو) کی پہلی اشاعت
(اکمل المطابع دہلی)

نواب مصطفیٰ خان شیفتہ کا انتقال
شمشیر حیز تر از مولوی احمد علی احمد جہانگیر مہری کی
اشاعت۔ (مطبع ندوی، کلکتہ)

(یہ قاطع برہان کے سلسلے کی آخری کتاب غالب کی
تصنیف "حق حیز" کے جواب میں ہے جو مرزا کی
وفات کے بعد شائع ہوئی، اگرچہ اس کی طباعت ان کی
زندگی میں شروع ہو چکی تھی۔)

۱۸۶۸ء (۲۳/ مارچ)

۱۸۶۸ء (۱۶/ اپریل)

۱۸۶۸ء (۲۷/ اکتوبر)

۱۸۶۹ء (۱۵/ فروری)

۱۸۶۹ء (۶/ مارچ)

۱۸۶۹ء (ستمبر، اکتوبر)

۱۸۶۹ء

۱۸۷۰ء (۳/ فروری)

غالب کی اہلیہ امر لاجپتیم کا انتقال
(مرزا غالب کی شرقی دیوار کے باہر کی طرف مدفون
ہیں۔)

۱۸۷۳ء (۳۶/ جون)

نحیم آغا جان پیش کاوتی میں انتقال۔

۱۸۷۶ء (۲۵/ مئی)

باقری علی خان (فرزند اکبر زین العابدین خان عارف) کا
انتقال (فارسی میں تخلص باقر تھا اور اردو میں کاکل۔
مدفن سلطان جی میں حضرت محبوب الہی کی پابستی
قاسم جانوں کی ہڑوا میں ہے۔)

۱۸۸۰ء (۷/ ستمبر)

حسین علی خان، زین العابدین خان عارف کے
پھوپھے بیٹے کا انتقال، اردو میں شہداء تخلص کرتے
تھے، فارسی میں شیلے۔

۱۸۸۳ء (۳۱/ اکتوبر)

علاقائی، نواب علاء الدین احمد خاں (خلیفہ و جانشین
غالب۔ ولادت ۲۵/ اپریل ۱۸۳۳ء) کی وفات، دہلی
میں۔

علاقائی چورہ جائے غالب نشست

درقی بدریجہ و قلم در کھست

(علاقائی)

۱۹۴۳ء (۱۹/ جنوری)

فرخ مرزا، نواب امیر الدین احمد خاں فرقی (۱۹۱۱ء
علاقائی۔ ولادت ۲۶/ جنوری ۱۸۶۰ء) کی وفات۔
لوہارو میں دفن ہوئے۔

”میںماں تمھارے “دوا“ امین الدین احمد خاں بہادر
ہیں۔ میں تمھارا “ولد ادہ“ ہوں۔“ غالب

۱۹۳۵ء (۱۰/ مئی)

معظم زبانی بیگم عرف بیگم زوجہ باقر علی خاں کاکل
(فرزند اکبر زین العابدین خان عارف) کا انتقال۔

(ہجرتِ یکم ۱۲ سال کی عمر میں کاتل کی دھنسن بن کر مرزا غالب کے گھر میں آئیں۔ ۲۳ سال کی عمر میں بیوہ ہو گئیں اور ۶۹ سال چوکی کے عالم میں گزار کر ۹۳ سال فوت ہوئیں۔ فخر الدین علی احمد مرحوم سابق صدر جمہوریہ ہندوان کے نواسے تھے۔)

۱۹۵۳ء (۲۹/ مارچ)

محمد سلطان یکم عرف چندو یکم کی وفات (یہ عارف کے بیٹے باقر علی خاں کاتل اور ہجرتِ یکم کی دوسری بیٹی تھیں ۱۲۸۱ھ مطابق ۶۵-۱۸۶۳ء میں پیدا ہوئی تھیں نواب ضیاء الدین احمد خاں کے پوتے اور میرزا شہاب الدین احمد خاں کے بیٹے میرزا شجاع الدین احمد خاں تاجاں سے بیانی مگی تھیں۔ کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ مرزا غالب انھیں پیار سے میرزا جیون بیگ کہتے تھے۔)

انجمن کی تازہ مطبوعات

نام کتاب

اردو ادب کی تحریکیں (پہ قرائی لیکن)

اردو ادب کے چند اہم اداسے

سورسے چند (جلد سوم)

سورسید احمد خاں، حالات و افکار

۱۔ افکار عالیہ

۲۔ اردو کی ادبی تاریخیں

۳۔ ملت اسلامیہ

۴۔ غالب کے چند خطوط

۵۔ پاکستان ایک اشتراکی ریاست کی معیشت

۶۔ انجمن ترقی اردو کا عالیہ

۷۔ منتظر خانیہ

۸۔ اردو کی محکمہ ادبیات

۹۔ غالب کی بعض تصانیف

۱۰۔ جدید اردو شاعری میں فطرت نگاری

۱۱۔ تاریخ انجمن و اداسے اردو کے بعد

۱۲۔ اشارہ اردو

۱۳۔ تاریخ مسلمانان پاکستان و بھارت (جلد اول)

۱۴۔ تاریخ مسلمانان پاکستان و بھارت (جلد دوم)

۱۵۔ غالب ایک مطالعہ

انجمن ترقی اردو پاکستان

ڈی۔ ۱۱۵۹، بلاک ۷، گلشن اقبال، کراچی۔

مصنف

ڈاکٹر ابو رسد

ڈاکٹر مسعود احمد خاں

جلیل الدین خاں

اداسے اردو مولوی میراج

خان رشید احمد خاں، قیصر اسلام

ڈاکٹر گیان چند

علی نوید، سخن اصغر، قدوائی

طس، راضی، فاروقی

ڈاکٹر حفترت حسین

اداسے اردو مولوی میراج

نور الحسن، حفترتی

ڈاکٹر فرمان رضا حفترتی

کالی، داس، گیتا رخصا

ڈاکٹر تاج محمد خاں

حفترت، حفترت، ادیب، سبیل

مصباح الحق

سید آغا فرید آبادی

سید آغا فرید آبادی

ممتاز حسین

قیمت

200/-

160/-

100/-

75/-

130/-

450/-

250/-

100/-

480/-

75/-

150/-

350/-

120/-

400/-

175/-

100/-

250/-

300/-

150/-